ربڑ کا پُتلا

ربڑ کا پُتلا

بچوں کے لئے بہترین روسی کہانیاں

دارالاشاعت ترقی

ماسکو

فہرست

صفحہ

''خود محبت کی لکھی ہ...'' (پیش لفظ)	۵
آنتون چیخوف۔ کشتانکا	۱۵
ایوان ترگینف۔ بیژن مرغ	۳۹
دمیتری ماسین سیبیریاک۔ بلیا شکاری	۶۳
نکولائی تیلیشوف۔ اپنے گھر	۷۵
لیونِد اندریئف۔ پیتکا — بنگلے	۸۹
الیکساندر کوپرین۔ سفید پوڈر	۱۰۱
فیودر دستوئیفسکی۔ امیرزادوں کے رڈنگ اسکول میں	۱۳۰
دمیتری گریگورووچ۔ ربڑ کا پتلا	۱۴۳
کنستانتن استانیوکووچ۔ ماکسیمکا	۱۶۱
وسیولود گارشین۔ سگنل	۱۹۷
لیو تالستائی۔ قفقاز کا قیدی	۲۰۹

"خود محبت کی لکھی ہوئی..."
(پیش لفظ)

انیسویں صدی کے عظیم ادیبوں کے نام ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ یہ نام ہیں دستوئیفسکی، چیخوف، لیو تالستائی۔ یہ ادیب روسی قوم کے لئے مایۂ ناز ہیں، اور ان کا ادب افتخار کا سرچشمہ ہے ہم سوویت لوگ اپنے انیسویں صدی کے ادب پر نازاں ہیں اس لئے کہ یہ ادب انسانی محبت سے پھوٹتا ہے، ایک منہ‌زور چشمے کی طرح۔ اس کا سرچشمہ ہے انسان سے محبت، اس کے رنج و الم، جدوجہد اور جفاکشی سے ہمدردی۔ اور یہ چشمہ پھوٹتا ہے مسرت کے خواب اور اس کی تعبیر کی تلاش سے۔ ہمیں اپنے ادب پر فخر ہے، اس لئے کہ اس میں ہمیشہ نیکدلی اور انسان‌دوستی کی گرمی محسوس ہوتی ہے، اس نے ہمیشہ تشدد اور ظلم کو بےنقاب کیا اور نسلی تفریق کی دیواریں ڈھائیں، ساری دنیا کے لوگوں کی دوستی، برادری اور آپسداری کی فضا پیدا کی۔ ہم ماضی کے عظیم روسی ادب پر فخر کرتے ہیں، کیونکہ اس ادب نے پوری ثابت‌قدمی سے حق اور انصاف کی حمایت کی، اور ان لوگوں کے حق میں بےدھڑک آواز اٹھائی جن کو ظلم و ناانصافی کا نشانہ بنایا گیا۔

انیسویں صدی کے لکھنےوالوں میں ایک ادیب بھی ایسا نہیں جس نے بچوں کے بارے میں، یا بچوں کے لئے نہ لکھا ہو۔ ہمارے ادیب بچوں میں قوم کا مستقبل دیکھتے تھے، اپنے ملک کے آنےوالے کل کی جھلک۔ وہ بچوں کو بڑوں کے غم و غصے، بددلی اور سخت‌گیری سے بچانے کے لئے ہر ممکن جتن کرتے تھے۔ ان کو اس بات کی فکر تھی کہ لوگوں کو کس طرح دانشمند، مضبوط، نیکدل، اور خوش‌باش بنایا جائے۔

انیسویں صدی روس میں مفلسی، مظلومی اور مجبوری کی صدی تھی۔ ۱۸۶۱ء تک روس میں وہ نظام قائم تھا جسے ''کسان غلامی کا نظام'' کہتے ہیں۔ اس نظام میں زمیندار زمین کے ساتھ کسان کو بھی خرید اور بیچ سکتا تھا۔ بےقصور کسان کو مار مار کر موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا۔ اور قانون کی گرفت سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ لیکن جب زار نے زمیندار کے اس حق کو ختم کیا تب بھی عام لوگوں کی زندگی میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ پہلے کی طرح جو امیر تھے امیر ہی رہے اور غریب غریب رہے۔ غریب پہلے کی طرح بھوک سے تڑپتے رہے، کمرتوڑ محنت پر مجبور ہوتے رہے، اور وقت سے پہلے موت کا لقمہ بنتے رہے۔

سب سے زیادہ مصیبت کے پہاڑ تو معصوم بچوں پر توڑے جاتے ہے۔ دولت مند خاندانوں کے بچے اگرچہ اچھا پہنتے تھے، اچھا کھاتے تھے، اچھے اسکولوں میں جاتے تھے، لیکن وہ بھی یہ نہیں جانتے تھے کہ اصلی خوشی کیا ہے اور اصلی آ۔ی کیسی ہوتی ہے۔ غریبوں کے بچے تو ہوش سنبھالتے ہی محنت مشقت کے جوئے ں جوت دئے جاتے تھے۔ علم کی روشنی سے محروم یہ بچے صبح سے شام تک کولہو کے ں کی طرح کام کرتے رہتے، کام، کام، اور کام، اور ایسے میں یہ پھول بن کھلے ہی مرجھا جاتے۔ موت کی نیند سو جاتے۔

فیودر دستوئیفسکی کا ایک افسانہ ہے ''کرسمس کے جشن مں مسیح کے پاس بچہ''۔ اس افسانے کا ننھا ہیرو صبح سویرے اس اندھیرے اور ٹھنڈے کونے میں جاگتا ہے، جہاں غریبوں کو سر چھپانے کی جگہ عطا کردی جاتی ہے۔ اس کی ں اس سرد کونے میں مردہ پڑی ہے۔ لڑکا سوچتا ہے کہ ماں سو رہی ہے۔ وہ باہر نکل تا ہے اور عمارت کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھتا ہے کہ کھاتے پیتے گھروں کے لوگ کرسمس کیسے مناتے ہیں۔ پھر وہ بھوکا پیاسا، ٹھٹھرتا ہوا، باہر صحن میں سو جاتا ہے، کسی گھر کے سائے میں۔ ایسی نیند جس سے نہ ماں جاگی اور نہ وہ جاگےگا!

ظاہر ہے دستوئیفسکی نے یہ افسانہ ان لوگوں کےلئے نہیں لکھا تھا جو پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ یہ افسانہ لکھا گیا تھا ان لوگوں کے لئے بن کے گھر گرم تھے۔ اور کتابیں خوبصورت، تاکہ ان کے دلوں میں ان لوگوں کےلئے ہمدردی پیدا ہو جن کے پاس کچھ نہیں ہے، تاکہ ان کے دلوں میں رحم کا جذبہ جاگے، ذر وہ دوسروں کے دکھوں کو سمجھیں۔

ایک اور عظیم روسی ادیب ہے، آنتون چیخوف۔ ان کے ان الفاظ سے کون واقف نہیں ہے: ''بچپن میں میرا کوئی بچپن نہیں تھا''۔ چیخوف ایک قصباتی کاروباری کے بیٹے تھے اور ان کو بڑی کمسنی ہی میں گھربار ٤ کام سنبھالنا پڑا تھا۔ چاہے خزاں کی اداس شامیں ہوں، چاہے جاڑے کی ٹھنڈی راتیں یا گرمیوں کے روشن دن، ان کے باپ کی دکان ہر وقت نم اور سرد رہتی۔ اور وہ گھٹے ہوئے ایام ان کی صحت کو گھن کی طرح کھا گئے۔ چیخوف چوالیس سال کی عمر میں تپدق کا شکار ہوکر ختم ہو گئے۔ بچوں کے بارے میں ان کے افسانوں میں محبت، دردمندی اور بچوں کے روح و دل کی گہری سمجھ رچی بسی ہوئی ہے۔ ان افسانوں میں صرف غم و اندوہ نہیں ہے، ان میں ہنسی کی لہریں بھی ہیں، اور زندگی کی جگمگاہٹ بھی۔ خود چیخوف کو بچپن میں خوشی نصیب نہیں ہوئی تھی اس لئے وہ جانتے تھے کہ بچوں کو اس خوشی کی کتنی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے قلم سے ان کے دلوں کو گدگدانے کی کوشش کرتے تھے۔ چیخوف کے دوست، روس کے مشہور ادیب کوپرین نے اپنی ''یادداشت'' میں ایک چارسالہ بچی کا ذکر کیا ہے جس سے چیخوف نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بہت دوستی کرلی تھی۔ یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب وہ کرائمیا میں تھے۔ ''ایک طرف ننھی منی سی بچی اور دوسری طرف

عمررسیدہ، دل گرفتہ اور اداس بڑا آدمی، جو ایک مشہور و معروف ادیب تھا! دونوں میں ایک انوکھی قسم کی، کھری اور سنجیدہ قسم کی دوستی پیدا ھوگئی تھی۔ دونوں دیر دیر تک برآمدے میں ایک ساتھ بنچ پر بیٹھے رھتے۔ چیخوف بڑے دھیان، بڑی لگن سے اس بچی کی ایک ایک بات سنتے...،،

سکھانے اور پڑھانے سے پہلے بچوں کی آواز سنو، ان کی زندگی کے بارے میں سچی کہانی کس طرح سنائی جائے، یہ سیکھو ۔ سب سے پہلے ان کو سمجھنے کی کوشش کرو — یہ تھیں وہ باتیں جو روسی ادیبوں میں مشترک تھیں۔ لیو تالستائی کہتے تھے: ''اسکول کے طالب‌علم انسان ھیں، چھوٹے ھی سہی، مگر ھیں تو انسان۔ ان میں بھی وھی طلب اور تڑپ ھے جو ھم میں ھے۔ اور ان کے سوچنے کے طریقے بھی ھمارے جیسے ھیں۔،، بچوں کا احترام کرنا اسی طرح ضروری ھے جس طرح اپنے کسی ھم‌عصر، ھم‌کلام کا کیا جاتا ھے — یہی خوبی روسی بچوں کے ادب کی توانائی ھے۔

کلاسیکی ادیب بچوں کے ادب میں ''زندگی کی وہ ڈور دیکھتے تھے جو بچوں کے کمروں سے شروع ھوتی تھی اور آگے جاکر باقی دنیا سے جڑجاتی تھی،،۔ یہ الفاظ ھیں دمیتری مامین سیبیریاک کے۔ بچوں کی تربیت میں کتابوں کے اھم رول کا تذکرہ کرتے ھوئے مامین سیبیریاک لکھتے ھیں:

''مجھے تو آج بھی بچوں کے لئے لکھی ھوئی ھر کتاب ایک ایسی چیز معلوم ھوتی ھے جس میں زندگی تڑپ رھی ھو۔ کیونکہ وہ بچے کے دل کو جگا دیتی ھے، اس کی سوچ کو ایک خاص راہ دکھاتی ھے۔ اور بچے کے دل کو، لاکھوں کروڑوں دوسرے بچوں کے دلوں کی دھڑکن سے ھم‌آھنگ کر دیتی ھے۔ بچوں کی کتاب — یہ تو موسم بہار کے سورج کی کرن ھے۔ یہ کرن بچوں کے دلوں میں چھپے ھوئے خوابوں کو پر لگا دیتی ھے، ان خوابوں اور آرزوؤں کو پھر سے اجاگر کردیتی ھے جو زمین پر بکھرے پڑے ھیں۔ بچے ان ھی کتابوں کی بدولت بچوں کی عظیم‌الشان عالمی برادری کا حصہ بن‌جاتے ھیں، ایسی برادری کا جو قومی، نسلی، اور جغرافیائی حدبندیوں سے بلند ھے...،،

بچوں سے سنجیدہ اور گہرے رشتے کی وجہ سے روسی ادیبوں نے بچوں کے لئے کتابیں لکھنے کی ذمہ‌داری سنبھالی اور اس ضمن میں مخصوص رویے اپنائے۔ ''...بچوں کےلئے اچھی طرح لکھنا بہت مشکل کام ھے۔،، یہ الفاظ ھیں مشہور افسانے ''مومو،، کے مصنف ترگینف کے۔ ''یہاں ضرورت صرف روشن ضمیری، گہرے مطالعے اور مشاھدے ھی کی نہیں، صرف تحمل اور انہماک ھی کی نہیں، صرف اتنا ھی کافی نہیں ھے کہ آپ کو انسان کے دل کا عام علم ھو اور بچوں کے دل کا خاص ادراک۔ نہ صرف یہ گر بھی آنا چاھئے کہ بغیر پھلجھڑی اور گل‌کاری کے، سیدھے سادے ڈھنگ سے، بغیر کسی الجھن کے قصہ کس طرح بیان کیا جائے — سب سے زیادہ ضرورت ھے اعلی اخلاقی و سماجی ارتقا کی...،،

یہ آخری شرط — ''اعلی اخلاقی و سماجی ارتقا،، خاص طور پر اہم ہے۔ سب سے پہلے ضروری یہ ہے کہ بچوں کے ادب کا خالق خود اخلاقی طور پر پاک اور صاف ہو۔ ساتھ ہی اسے اچھا شہری ہونا چاہئے — جو اپنے لوگوں سے محبت کرتا ہو، جس کے دل میں اپنے وطن کی چاہ ہو۔ اسی اخلاقی خوبی نے، اعلی شہری ہونے نے روسی ادیبوں کو ابھارا کہ وہ بچوں کے لئے اس زمانے کی حقیقت کی تصویر پوری سچائی کے ساتھ پیش کریں — نہ تو برائیوں پر پردہ ڈالیں نہ خوبیوں کو بھولیں۔

''ہماری روسی زندگی کی محرومیاں اور ناکامیاں — تمام روسی مصنفوں کا پسندیدہ موضوع رہی ہیں،، مامین سیبیریاک نے کہیں لکھا ہے۔ ''لیکن یہ تو محض منفی پہلو ہے۔ اس کے ساتھ ہی مثبت رخ بھی ہونا چاہئے۔ ورنہ جینا مشکل ہو جاتا، سانس لینا اور سوچنا ناممکن ہوجاتا... یہ زندگی کہاں ہے؟ اس کے پراسرار سوتے کہاں ہیں جن سے روس کی آزمائشوں اور مصائب و آلام سے بھری ہوئی صدیوں کی تاریخ شروع ہوتی ہے؟ کہاں ہیں وہ ڈگر اور راستے، وہ نشیب و فراز جن سے بڑے بڑے سورما گزرے ہیں؟،،

ان تمام سوالوں کے جواب زیرنظر انتخاب کے افسانوں میں مل جاتے ہیں۔ ان میں روس کی پانچ دہائیوں کی بورژوا اور جاگیردارانہ زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

ان افسانوں کو پڑھتے ہوئے ان کے مصنفوں اور کرداروں کے ساتھ، ہم تصور ہی تصور میں، قدیم ماسکو اور پیٹرسبرگ کا نظارہ کرتے ہیں، کبھی جنوب میں کرائمیا کے دھوپ میں نہائے ہوئے ساحلوں کی سیر کرتے ہیں، کبھی سائبیریا کی چوڑی شاہراہ پر گذرتے ہیں جس کے اوپر شل کر دینے والی شمالی ہوائیں سیٹیاں بجاتی ہیں اور خزاں کی اداس بارش فضا کو بھگوتی رہتی ہے۔ کبھی یہ تصویریں ہمیں گرمیوں کے تائیگا میں پہنچا دیتی ہیں، جہاں قطار اندر قطار پہاڑیوں اور فر کے جنگلوں کے درمیان جنگلی بارہ سنگھے قلانچیں بھرتے ہیں، تو کبھی ان میں قفقاز کے پہاڑوں کے سلسلے نظر آتے ہیں۔ کبھی نگاہیں بحر ہند تک پھیل جاتی ہیں جہاں روسی جہازران دنیا کے گرد چکر لگاتے لگاتے پہنچ گئے ہیں۔ کبھی ہم ''بیژن مرغزار،، کے مصنف کے ساتھ قلب روس میں، گرمی کی مختصر رات کا لطف اٹھاتے ہیں — کالی زمین کی سرحدوں کے اندر — جہاں جنوب کی لمبی اونچی گھاس‌والے استیپ میدان شمالی جنگلوں سے گلے ملتے ہیں۔ جہاں سو سال پہلے کی طرح آج بھی کھیت پھیلے ہوئے ہیں، آج بھی دریا ویسے ہی پراسرار، ویسے ہی آہستہ خرام ہیں، جیسے سو سال پہلے تھے...

ہزاروں ورست* کا چکر لگاتے ہوئے ان روسی راستوں اور شاہراہوں پر کسان بھی ملیں‌گے اور شکاری بھی، کاریگر اور سرکس کے مداری بھی۔ جانوروں کو سکھانے‌والے بھی اور ریل کی پٹریاں چیک کرنے‌والے بھی، مفرور قیدی بھی، استاد اور دولت‌مند شرفا

---

* ورست — مسافت کا پرانا روسی پیمانہ، ایک کلومیٹر سے کچھ زیادہ۔ (ایڈیٹر)

بھی اور ان کے خادم بھی۔ بھانت بھانت کے لوگ، جن کی کوئی بات بھی تو ایک جیسی نہیں ہے۔

ان کے علاوہ، تمھیں اپنے ہمجولی بھی ملیں‌گے، نوعمر لڑکے لڑکیاں — جو شہر اور گاؤں کے ''نچلے،، طبقوں سے ابھرے ہیں، یتیم بچے، جن کے ماں باپ وقت سے پہلے سرچکے تھے یا جو افلاس اور بھوک کے ستائے ہوئے اپنے بچوں کو کام کرنے کے لئے بھیجنے پر مجبور تھے۔ ان میں وہ چھوٹے چھوٹے امیرزادے بھی ملیں‌گے جو ماں باپ کے لاڈ پیار اور خادموں کی نازبرداریوں کے بگاڑے ہوئے تھے۔

ذرا غور کرو کہ روسی ادیب جب بچوں کے بارے میں بات کرتے ہیں تو ہمیشہ ان کی بپتا، ان کی مصیبتوں اور کلفتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ''ایمیلیا شکاری،، افسانے کا کردار ننھا گریشوتکا بہت دکھی ہے۔ ''اپنے گھر،، میں چھوٹا لڑکا راستے میں ٹھنڈ کھاکر بیمار پڑجاتا ہے۔ دستوئیفسکی کے افسانے کا مرکزی کردار اپنے استادوں اور ہم‌جماعت ساتھیوں کی پھبتیوں کی وجہ سے جلتا، کڑھتا رہتا ہے۔ ''قفقاز کا قیدی،، میں روسی افسر ژیلین کی بپتا، کم‌عمر تاتار لڑکی دینا کی اپنی بپتا بن جاتی ہے۔ لیونڈ اندریئف کی کہانی میں باورچن کا بیٹا پیتکا شہر واپس جانے کی خبر سن‌کر تڑپ اٹھتا ہے، کیوں‌کہ شہر میں اس کا کام بہت سخت ہے، صبح سے شام تک بچے کو ایک پاؤں پر کھڑا رہنا پڑتا ہے، ہر کھڑے بیٹھے کے اشارے پر دوڑنا پڑتا ہے۔ صبح سے شام تک مالک کی گالیاں سننا پڑتی ہیں۔ گریگوروِوچ کے افسانے ''ربڑ کا پتلا،، کا بچہ پیتیا سرکس کے گنبد تلے کرتب دکھاتے ہوئے بلندی سے گرکر ختم ہوجاتا ہے...

''لیکن یہ تو محض منفی پہلو ہے،، شاید ہم بھی مامین سیبیریاک کے ساتھ یہی کہتے، اگر ان کہانیوں اور افسانوں کے مصنف ہمیں اس زندگی کے روشن پہلو نہ دکھاتے جو پہلی نظر میں زنجیروں میں جکڑی ہوئی اور تاریک دکھائی دیتی ہے، جس میں کوئی راہ فرار نہیں ہے۔ اگر محتاجی، ناانصافی، دکھ اور حقوق سے محرومی کے اس انبار میں نیکی اور سچائی کی دھنک جھانکتی دکھائی نہ دیتی تو کیا ہوتا!

روس کے ممتاز اور سب سے بڑے انسان‌دوست ادیبوں میں سے ایک ادیب آنتون چیخوف کی کہانی ''کشتانکا،، میں قلم کا معجزہ یہ ہے کہ سب سے ممتاز کردار بن‌کر ابھرنےوالا انسان نہیں بلکہ کتا ہے۔ چیخوف نے لکھا ہے کہ ''بچوں کی تربیت اور ان کی زندگی میں پالتو جانور بلا شبہہ بہت اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ہم میں سے کون ہے جس کو بڑے بھاری مگر نیک‌دل کتے یاد نہیں آتے، چڑیاں جو قید میں مرتی ہیں، احمق مگر آن بان والی فیل مرغیاں، نرم نرم بوڑھی بلیاں، جن کی دم پر کبھی کبھی ہمارے پاؤں پڑجاتے تھے، اور جن کو اکثر ہمارے ہاتھوں دکھ پہنچتا تھا! مجھے تو کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ ہمارے گھریلو جانوروں میں ہمیں جو صبر، اعتماد، دریادلی اور خلوص نظر آتا ہے، اس کا اثر بچوں کے ذہن پر گہرا پڑتا ہے۔ روکھے اور زرد چہرے والے

کارل کارلووچ کے لمبے وعظ اور گورنسوں، اتالیقوں کی بےرنگ اور بےنمک سوکھی نصیحتوں سے کہیں زیادہ اثر بچوں کے ذھن پر انھیں جانوروں کا پڑتا ھے۔ گورنس کی مبہم اور لفاظی کی باتوں سے بھلا کیا ملےگا، جو یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی ھے کہ پانی اکسیجن اور ھائڈروجن سے بنتا ھے۔،،

''کشتانکا،، وفاداری کا افسانہ ھے۔ یہ ایک کتے کی دل ھلا دینےوالی کہانی ھے جو ایک غریب بڑھئی کے گھر میں رھتا تھا اور اس کے بیٹے فیدوشکا سے کھیلتا تھا۔ اس نے اکثر اس گھر میں بھوک اور مارپیٹ کا مزہ چکھا تھا، مگر اپنا گھر پھر اپنا تھا۔ اور اس میں رھنےوالے اس کے اپنے تھے، اپنے سگے تھے! مگر پھر کچھ ایسا ھوا کہ شہر میں وہ راستے سے بھٹک گیا۔ وہ راستہ بھول گیا، مگر مارا نہیں گیا۔ بلکہ سرکس کے ایک کھلاڑی سے جاٹکرایا۔ اجنبی کے ھاں اسے خوب اچھی طرح ڈٹ کر کھانے کو ملتا، وہ پٹائی بھی نہ کرتا۔ اجنبی تو الٹا اس پر جان چھڑکتا تھا۔ لیکن جب ایک عرصے بعد کشتانکا کو اپنے پرانے مالک کی آواز سنائی دی تو لپکتا جھپکتا، اس کے پاس پہنچا اور اس کے ساتھ ھولیا۔ کتے کے دل کی کلی کھل گئی۔ کہانی پڑھتے ھوئے ھمیں ایسا لگتا ھے کہ کشتانکا، بڑھئی لوکا اور فیدوشکا کی خوشی کے سوتے ھمارے دلوں سے پھوٹ رھے ھیں۔ یہ جیت محبت کی جیت ھے۔ جس کو مزیدار کھانے کے تر نوالے سے چھیننا ممکن نہیں ھے۔ اسے تو پیار چمکار سے بھی جیتنا مشکل ھے۔

مامین سیبیریاک کا افسانہ ''ایمیلیا شکاری،، بھی اعتماد کی، اور اس محبت کی کہانی ھے جو ھر چیز پر فتح یاب ھوتی ھے۔ بیمار گریشوتکا دادا سے بارہسنگھے کے بچے کے شکار کی فرمائش کرتا ھے۔ دادا کےلئے جنگلوں اور پہاڑوں میں بھٹکنا آسان نہیں ھے۔ لیکن پوتے کی جان بچانے کےلئے وہ تین دن جنگلوں میں بھٹکتا ھے — بارہ سنگھے کی تلاش میں۔ اور جب آخرکار اسے بارہسنگھے کے نشان ملتے بھی ھیں تو بارہ سنگھے کا بچہ نہیں ملتا۔ اس کی ماں جان خطرے میں ڈال کر اسے راستے سے بھٹکا دیتی ھے۔ لیکن ایمیلیا کو بھی ضد ھوگئی ھے۔ آخرکار وہ اپنا شکار پالیتا ھے۔ اور تب وہ ھوتا ھے، جس کا ھمیں دور دور کوئی خیال نہیں تھا۔ ھم پڑھتے ھیں: ''ایک لمحہ اور، اور ننھا بارہسنگھے کا بچہ موت سے پہلے کی دل خراش چیخ مارتا ھوا، بےسدھ ھوکر زمین پر آگرتا۔ لیکن عین اسی لمحے بوڑھے شکاری کو خیال آیا کہ ننھے بارہسنگھے کی ماں نے کس بےجگری سے اپنے جگر کے ٹکڑے کو بچانے کی جدوجہد کی تھی۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ خود اس کے گریشوتکا کی ماں نے کس طرح جان دے کر اپنے لال کو بھیڑیوں سے بچایا تھا۔ بوڑھے ایمیلیا کا کلیجہ جیسے کسی نے مسل دیا۔ بندوق کی نال نیچے جھک گئی۔،،

افسانے کا انجام لاجواب ھے۔ ایمیلیا لوٹ آتا ھے۔ پوتے کی فرمائش پوری کئے بنا۔ خالی ھاتھ لوٹتا ھے۔ بچے کو قصہ سناتا ھے کہ کس طرح اس کا نشانہ چوک گیا، کس طرح شکار ھاتھ سے نکل گیا۔ بچہ ھنس پڑتا ھے، رات بھر میں باربار یہی پوچھتا ھے کہ

بارہ سنگھے کا بچہ کیسا تھا اور کس طرح بھاگا۔ اور داستان کو اپنی داستان یوں ختم کرتا ہے: ''بچہ سو گیا۔ مگر رات بھر خواب میں ایک چھوٹے سے سنہرے بارہ سنگھے کے بچے کو دیکھتا رہا جو ماں کے ساتھ خوشی خوشی جنگل میں گھوم رہا ہے۔ بڑے میاں تنور کے اوپروالے مچان پر سو رہے تھے۔ وہ بھی رات بھر نیند میں مسکراتے رہے۔''

یہ چھوٹی سی کہانی، اپنے اندر کتنی وسیع دنیا چھپائے ہوئے ہے۔ اس میں محبت کا نغمہ ہے، محبت کا حسن ہے، اور جرأت ہے اس ہستی کے لئے خود اپنی قربانی دے دینے کی جس سے محبت ہو۔ اس کہانی کے خالق نے دکھایا ہے کہ نیکی اور شرافت ناقابل تقسیم ہیں۔ اس جذبے کو جانوروں سے محبت کے روپ میں ابھارا گیا ہے جو انسان کے لئے جذبۂ محبت کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ شکاری دادا کی مہربانی، بارہ سنگھے کے بچے کو زندہ چھوڑ دینے پر مسرت نے، گریشوتکا کے لئے شکار کئے ہوئے جانور کے گوشت سے کہیں زیادہ موثر دوا کا کام کیا۔

بچے اور بڑے — دونوں کی تصویرکشی کرتے ہوئے، روسی ادیب ہمیشہ بچے کے طرفدار بن‌جاتے ہیں۔ ہمیں گریگورووچ کے افسانے ''ربڑ کا پتلا'' میں سرکس کے کھلاڑی بیکر سے نفرت ہوجاتی ہے۔ اس لئے کہ وہ نہایت لحیم‌شحیم اور مضبوط ہے لیکن اپنی طاقت کو ننھے پیتیا کو بچانے کے کام میں نہیں لاتا، بلکہ الٹا اس کے دل میں دہشت بٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ کالا دھندا کرنےوالا، امریکی جہاز کا کپتان بھی اتنا ہی بیزارکن ہے۔ یہ رخ ''ماکسیمکا'' میں نظر آتا ہے۔ جب حبشی اپنے ساتھی جہازرانوں کو قصہ سناتا ہے کہ اس کا پچھلا مالک اس کو کس طرح مارتا پیٹتا تھا تو پڑھنے والے کھلم کھلا خوش ہوتے ہیں کہ چلو جہاز ڈوبا تو کیا ہوا، کم سے کم یہ گندگی تو ساتھ لےڈوبا!

بڑے ہمیشہ بچوں کے مقابلے میں زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔ لیکن وہ محض طاقت کی وجہ سے بڑوں کا سہارا نہیں لیتے۔ بڑے ان کو کپڑے دیتے ہیں، کھلاتے پلاتے ہیں، گھر دیتے ہیں اور وہ لوگ جو بچوں کی اس مجبوری کا فائدہ اٹھاکر انھیں دباتے اور کچلتے ہیں، دراصل بڑا ظلم کرتے ہیں۔ روسی ادب نے بڑوں اور چھوٹوں کے رشتے کو اسی نظر سے دیکھا ہے۔ اس ادب نے انسان کا قصیدہ پڑھا ہے، اور اس کی بڑائی کے گیت گائے ہیں — اس انسان کے، جو بچوں سے محبت کرتا ہے، ان کے کام آتا ہے، جو انھیں افلاس، مصائب اور ناانصافی سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔

تیلیشوف کی کہانی ''اپنے گھر'' میں ہماری ملاقات ایک سزایافتہ قیدی سے ہوتی ہے جو مفرور ہوگیا ہے۔ وہ ایک بیمار بچے کو بچاتا ہے، اسے شہر لےجاتا ہے اور خود اس طرح پھر پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ہمیں پتہ نہیں چلتا کہ اس انسان کا جرم کیا تھا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہ خود اپنی مرضی سے اپنی آزادی قربان کردیتا ہے، کون جانے یہ قربانی صرف آزادی کی نہ ہو بلکہ اس کی زندگی کی ہو۔ اور یہ سب وہ کرتا

ہے، ایک اجنبی بچے کو موت سے بچانے کے لئے۔ اس انسان کا رویہ، اس کا کارنامہ ہمارے دلوں کو متاثر کرتا ہے۔

سرکس کے کلاؤن ایڈورڈس کے لئے ہمارے دل میں جگہ پیدا ہوجاتی ہے، کیوں کہ وہ پیتیا کو بیکر کے ظلم و سختی سے بچاتا ہے۔ ہمیں شرابی جہازران سے ہمدردی ہوجاتی ہے، جو استانیوکووچ کی کہانی میں اس نیگرو بچے کی اتالیقی قبول کرتا ہے، جو کسی صورت بچ گیا تھا۔ وہ نیگرو بچے کو محبت سے ماکسیمکا نام دیتا ہے۔ ایک جہازی کی آمدنی کتنی محدود ہوتی ہے، لیکن وہ اس محدود آمدنی سے بچے کے لئے جوتے بناتا ہے، کپڑے سیتا ہے، بچے کو اپنی ذمہ‌داری سمجھتا ہے۔ اس کے لئے دل میں باپ کی سی محبت محسوس کرتے ہوئے پہلے کی طرح زیادہ شراب پینا چھوڑ دیتا ہے۔

اس کتاب کے افسانوں میں ہمیں بار بار لاڈ میں بگڑے ہوئے ضدی بچے تو ملتے ہیں مثلاً ڈریلی، ایک مالدار انجینیر کا بیٹا جس سے ہماری ملاقات ''سفید پوڈل،، میں ہوتی ہے۔ لیکن ان میں ظالم بچے نظر نہیں آتے — نہ نکمے اور نکھٹو بچے دکھائی دیتے ہیں نہ بدمعاش اور لفنگے، حالانکہ ان افسانوں میں اکثر بڑی عمر کے کرداروں میں یہ ''خوبیاں،، ملتی ہیں۔ ڈریلی جیسے خودغرض بچے بھی اتنے قصوروار نہیں ہیں جتنے انکو پالنے والے بالغ ہیں۔ قدرت نے بچے کو پاک، صاف اور معصوم بنایا ہے۔ وہ نیک انسانی فضائل کے امین ہیں۔ ''بیژن سرغزار،، کے مصنف نے توہم پرست، جاہل اور گھٹے ہوئے ماحول میں رہنے والے بچوں کی زندگی میں بھی ایک بھولپن اور شاعرانہ کشش پیدا کردی ہے۔ اور ''قفقاز کا قیدی،، کی نازک اور کمزور سی بچی دینا میں کیسی طاقت اور جی‌داری ہے۔ اس کا دل کتنا بڑا ہے۔ اس کے دل میں ہمدردی، اور دوسروں کے دکھوں کو اپنانے کی قوت کا سرچشمہ چھپا ہوا ہے۔

بڑوں کے برخلاف، بچوں میں قومی تنفر نظر نہیں آتا۔ ان میں نہ قومی تعصب ہے نہ نسلی امتیاز۔ دینا باپ کے قیدی پر ترس کھاتی ہے، اس کی مدد کرتی ہے، حالانکہ اس پہاڑی آؤل (تاتار گاؤں) کے بڑے بوڑھے روسیوں کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ دینا کی نظر میں ژیلین، سب سے پہلے، ایک اچھا اور نیک انسان ہے، وہ ہاتھ سے کھلونے گڑھ کر بچی کو تحفے میں پیش کرتا ہے اور اس طرح بچی کے دل میں مسرت کی روشنی جگاتا ہے۔ افسانے ''ماکسیمکا،، میں ساری انسانیت ایک برادری کی طرح ابھرتی ہے۔ روسی جہازرانوں کے جھرمٹ میں چھوٹا سا نیگرو بچہ اپنے آپ کو انسان محسوس کرتا ہے۔ اور جواباً اس کے دل میں بھی محبت اور وابستگی کا جذبہ جاگتا ہے۔ محبت سے محبت جنم لیتی ہے۔

بڑوں کی مثال بچوں کے لئے ہمیشہ اہمیت رکھتی ہے۔ کیوں کہ بچے ناتجربہ‌کار اور اناڑی ہوتے ہیں۔ بچپن میں اچھے بیج بو دئے جائیں تو بڑوں کی مثال سے مضبوط ہوتے ہیں اور فصل اچھی آتی ہے۔ ژیلین بدترین حالات سے دوچار ہے۔ اسے سخت سے سخت

سزا دی جانے والی ہے ۔ پھر بھی اس کے دل میں ہمت و حوصلہ ہے ۔ اس کی خودداری اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی ۔ گارشین کے افسانے ''سگنل،، میں، ریل کی پٹریاں چیک کرنے والے، سیمیون کا کارنامہ شاندار ہے، جو جان پر کھیل کر ایک پسنجر گاڑی کو حادثے سے بچاتا ہے ۔ اور ہمیں اس بات پر ذرا حیرت نہیں ہوتی کہ وہی واسیلی جس نے ریلوے کے حکام سے بدلہ لینے کےلئے ریل کی پٹریاں اکھاڑ دی تھیں، اب سیمیون کے خون سے رنگے ہوئے رومال کو ہوا میں لہرانے لگتا ہے، ریل گاڑی کو روکنے کے لئے ۔ ہمیں اس پر ذرا حیرت نہیں ہوتی، کیوں کہ سیمیون کے اس ٹھوس اقدام کی مثال اتنی مضبوط تھی جو بہت سے معصوم لوگوں کو موت سے بچانا چاہتا تھا، خواہ اس میں اپنی جان ہی کیوں نہ چلی جائے ۔ اس بات کی اپنی منطق ہے، اور اس کے دلائل قائل کن ہیں ۔ انسان دوستی، خودداری اور عزت نفس — یہی ہیں انسانی عمل کے سب سے بڑے معیار !

ضرورت اس کی ہے کہ ان افسانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے ان باتوں کو ذہن میں رکھا جائے ۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ دستوئیفسکی کا ہیرو کس طرح اس بات سے دکھی ہے کہ آخری ملاقات کے وقت اس نے ماں کو وہ محبت اور شفقت نہیں بخشی جس کا احساس اس کے دل میں ہے — تڑپتی ہوئی ان کہی محبت جو ماں کےلئے اس کے دل میں پنہاں ہے، اس کے دل کے پرخچے اڑا رہی ہے ۔ ضرورت اس کی ہے کہ تصور ہی تصور میں ہم شکاری ایمیبا کے ساتھ ساتھ شکار پر نکلیں، ریل کی پٹریاں چیک کرنےوالے سیمیون کے ساتھ ریل گاڑی کے راستے پر کھڑے ہوں ۔ تب معلوم ہوگا کہ اگرچہ ان افسانوں میں ان گنت مشکلات اور مصیبتوں کا بیان ملتا ہے، لیکن اس کے باوجود یہ احساس ہوتا ہے کہ زندگی کے لئے سارے راستے بند نہیں ہیں، مصائب کا مقابلہ کرنے کا کوئی راستہ ضرور ہے، زندگی میں کوئی بات ہے، جس کی خاطر انبساط و نشاط کا تجربہ کیا جا سکتا ہے، دکھ جھیلے جاسکتے ہیں، جدوجہد کی جاسکتی ہے ۔ اس پورے تجربے میں گہری آفاقیت ہے، دوسروں کے دلوں میں اترجانے کی کیفیت ہے، یعنی اس میں لافانی نیکی اور روشن ضمیری کے سوتے ہیں ۔ یہی بات جادو کی طرح ایک دل سے دوسرے دل میں اترجاتی ہے ۔ یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا ۔ اور یہی وہ خوبی ہے جو بچوں کو بڑوں سے قریب کرتی ہے، اندھوں کو بصارت بخشتی ہے، نادانوں کو عاقل بناتی ہے اور ظالم کو مہربان، ٹھنڈے اور بے نیاز انسانوں میں زندگی اور وابستگی کا جذبہ جگاتی ہے، اور بکھرے ہوئے، ٹوٹتے ہوئے لوگوں کو ایک ہی برادری، ایک ہی خاندان میں یکجا کردیتی ہے ۔

سامین سیبیریاک کی کتاب ''چڑیوں کی کہانیاں ننھی الیونوشکا کے لئے،، بچوں کے افسانوں پر مشتمل تھی جن کو انھوں نے اپنی ننھی بیٹی کے لئے لکھا تھا ۔ جب یہ کتاب چھپی تو انھوں نے اپنی ماں کو لکھا : ''یہ میری محبوب کتاب ہے، یہ خود محبت کی لکھی ہوئی ہے، اسی لئے یہ ہر چیز کے بعد بھی زندہ رہے گی ۔ ،، جن کہانیوں پر یہ کتاب مشتمل ہے وہ اسی سبب سے ابھی زندہ ہیں کہ یہ ''خود محبت کی لکھی ہوئی ہیں،، ۔

جن لوگوں نے یہ کہانیاں اور افسانے لکھے ھیں، وہ ایک زمانہ ھوا اس دنیا سے کوچ کرچکے ھیں - وہ روس بھی کہیں کھوچکا ھے جو ان افسانوں میں دکھائی دیتا ھے — اس کی مفلسی اور بھوک کب کی ختم ھوچکی ھے - لیکن سوویت یونین کی وسعتوں میں ان لوگوں کے وارث اور روحانی امین آج بھی موجود ھیں اور نئے حالات میں نئے ڈھنگ سے جی رھے ھیں - یہ وہ لوگ ھیں جن کے بزرگوں اور اجداد نے بڑی ظلمتوں میں رہ کر انسانی قندیل کو بڑے سے بڑے طوفانوں میں روشن رکھا، دلوں میں پنپتی ھوئی نیکیوں کی حفاظت کی، اور اپنا قابل قدر روحانی ورثہ آنے والی نسلوں کے لئے چھوڑ گئے - یہ وہ لو ھے جسے بجھایا نہیں جا سکتا ھے - یہ قندیل پرانے وقتوں کے طوفانوں میں پل کر ھم تک پہنچی ھے - ھماری نسل نے زمین سے، قدرت سے، محنت و مشقت سے محبت کی اس قندیل کو اپنے دلوں میں چھپا لیا ھے - یہ بچوں سے اور عام طور پر سب انسانوں سے محبت اور وابستگی ھے، جس کے گن سرزمین روس کے عظیم ادیبوں نے اپنی تخلیقات میں گائے ھیں، ان تخلیقات میں جو انھوں نے نئی پود کے لئے چھوڑی ھیں -

ایگر ھوتیاشوف

آنتون چیخوف

کشتانکا

کہا جاتا ہے کہ ''کشتانکا،، میں چیخوف نے ایک ایسے واقعے کے بارے میں لکھا ہے جو جانوروں کو سدھانے کے مشہور روسی ماہر و ـ ل ـ دوروف کے ساتھ پیش آیا تھا ـ

دوروف سرکس میں کام کرنےوالے ایک ممتاز خاندان کے جدامجد تھے ـ انھیں نے جانوروں کو سدھانےوالوں کا پہلا روسی اسکول قائم کیا تھا ـ دوروف عظیم روسی ادیب اور انسان دوست چیخوف کو بھی اچھی طرح جانتے تھے ـ ان میں کئی چیزیں مشترک تھیں — خاص طور سے دوروف کے اسکول کی خصوصیت اور جانوروں کو سدھانا، کوڑے کی مدد سے نہیں بلکہ شفقت اور پیار سے ہمت‌افزائی کرکے ـ چیخوف کے پاس ہمیشہ کچھ نہ کچھ جانور ہوتے تھے ـ ایک زمانے میں ان کے پاس ڈیشھنڈ ''بروم،، اور ''خینا،، تھے، پھر نہ جانے کس نسل کے دو پلے تھے ''کشتان،، اور ''بیلالوبی،، اور ایک پالتو سارس تھا ـ

چیخوف کو سرکس دیکھنے کا بھی بہت شوق تھا ـ

افسانہ ''کشتانکا،، سب سے پہلے ۱۸۸۷ء میں ایک اخبار میں شائع ہوا ـ پانچ سال بعد چیخوف نے اسے بچوں کے لئے ایک الگ کتاب کی صورت میں شائع کیا ـ کتاب بہت ہی کامیاب ہوئی ـ چیخوف نے اپنے بھائی کو ایک خط میں مزاحیہ انداز میں اطلاع دی کہ ''کھانے کے وقت بچے مجھ پر نگاہیں لگائے رکھتے ہیں کہ میں کوئی نہ کوئی غیرمعمولی طور پر دانش‌مندانہ بات کہوں‌گا ـ ان کی رائے میں میں ایک عالی دماغ شخص ہوں کیونکہ میں نے افسانہ 'کشتانکا' لکھا ہے ـ ،، چیخوف کے زمانے میں (ان کا انتقال ۱۹۰۴ء میں ہوا) ''کشتانکا،، کے دس ایڈیشن شائع ہوئے اور آج بھی وہ سوویت بچوں کی محبوب کتاب ہے ـ

بچوں کو آنتون پاولووچ چیخوف کی دوسری کہانیاں بھی بےحد پسند ہیں — ''بیلالوبی،، ، ''وانکا،، ، ''فراری،، ، ''استیپ،، ، ''لڑکے،، ، ''واقعات،، ، ''نیند آرہی ہے،، ، ''ننھے منے،، ـ ان کہانیوں کی زبان بہت ہی اچھی ہے، ان سے لوگوں کے اور زندگی کے گہرے علم کا اندازہ ہوتا ہے ـ یہ کہانیاں ہلکی پھلکی ہیں ـ لیکن چیخوف کے مخصوص مزاح کے ساتھ ساتھ ان میں قدرے غمگینی بھی ہے ـ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان میں ایک ایسی زندگی کے خواب بھی ہیں جو انسان کے شایان شان ہو، ''دیانتدارانہ، شائستہ اور شاعرانہ،، ـ

۱ - شرارت اور شیطانی

لومڑی جیسے لال منھ‌والا سرخ سے رنگ کا ایک دوغلا پلا، کچھ ڈیش ہنڈ، کچھ گلی کے کتے کا سرکب، گھبرایا گھبرایا سا، چونک کر ادھر ادھر دیکھتا ہوا، فٹ پاتھ پر دوڑ رہا تھا۔ باربار پلا رکتا، گھبرائی ہوئی سی آواز نکالتا، کبھی ایک ٹھٹھری ہوئی ٹانگ اٹھاتا، کبھی دوسری، اور سوچنے لگتا کہ آخر یہ سب ہوا کیسے، وہ راہ سے بھٹکا کیوں کر ؟

اسے خوب یاد تھا کہ اس نے دن کیسے گزارا تھا اور کس طرح دن ختم ہوتے ہوتے وہ اس انجانی راہ پر پہنچ گیا تھا۔

دن نکلتے ہی اس کے مالک، بڑھئی لوکا الیکساندریچ نے ٹوپی پہنی، لال رومال میں لپٹی ہوئی لکڑی کی کوئی چیز بغل میں دبائی اور اسے بلایا :

''کشتانکا، کشتانکا، آؤ چلیں !،،

اپنا نام سنتے ہی پلا مالک کے کام کرنے کی میز کے نیچے سے اچھل کر نکل آیا، جہاں وہ لکڑی کی چھیلن پر پڑا تھا۔ پلا اچھلا اور بڑے انداز سے انگڑائی لے کر دوڑتا ہوا مالک کے ساتھ ہو لیا۔ لوکا الیکساندریچ جن لوگوں کے لئے کام کرتا تھا وہ بہت دور کہیں رہتے تھے۔ اتنی دور کہ ان تک پہنچتے پہنچتے، بڑھئی کو کئی دفعہ رک کر کسی سرائے میں ذرا ایک آدھ چسکی لگانا پڑتی کہ دم میں دم آئے۔ کشتانکا کو خوب یاد تھا کہ اس نے راستے بھر بڑی شیطانی کی تھی۔ باھر جانے کی خوشی میں خوب اچھلی کودی تھی، بے تحاشہ بھونک بھونک کر ٹراموں کے پیچھے دوڑی تھی، احاطوں میں گھس گھس کر دوسرے کتوں کو دوڑاتا تھا۔ وہ باربار بڑھئی کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی، اور لوکا الیکساندریچ کو رک کر اس پر چیخنا، آوازیں دے دے کر اسے بلانا پڑتا، ایک دفعہ تو مارے غصے کے بڑھئی کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں، اس نے جھنجھلا کر پلے کے لومڑی جیسے کان سروڑے، اسے ایک دھپ رسید کیا اور دانت پیس کر بولا :

''ارے تجھے دو گھڑی کی آئے، تجھے طاعون لیجائے کمبخت نا بکار !،،

مقررہ جگہ پر کام پہنچانے کے بعد لوکا الیکساندریچ اپنی بہن کے گھر گیا تھا، وھاں اس نے کچھ کھایا پیا تھا۔ اور پھر وھاں سے اپنے ایک جاننےوالے جلدساز کی طرف

هو لیا تھا۔ جلدساز کے ھاں سے نکلا تو ایک سرائے میں جا پہنچا۔ وھاں سے فارغ ھوا تو کسی اور احمق کے گھر چلدیا۔ دن بھر یہی چکر چلتا رہا۔ مختصر یہ کہ جب اچانک کشتانکا نے اپنے کو اس اجنبی راہ پر پایا تو شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا اور بڑھئی نشے میں دھت تھا۔ ھاتھ چلا چلاکر جھوم رہا تھا، سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور وہ کچھ بڑبڑا رہا تھا:

''میں اپنی ماں کی کوکھ میں آیا ھی گناہ کے نتیجے میں۔ اف یہ گناہ، یہ گناہ! لو اب ھم اس سڑک پر چل رہے ھیں، سڑک کے کنارے جلتی ھوئی ان روشنیوں کو دیکھ رہے ھیں، مگر جب مریں گے تو دوزخ کی آگ کا کندہ بنیں گے!...''

کبھی کبھی وہ ذرا خوش ھو جاتا اور وہ کشتانکا کو چمکارتا، پاس بلاتا اور کہتا:

''ارے کشتانکا، تو بالکل کیڑا ھے کیڑا۔ آدمی کے مقابلے میں ایسی حقیر لگتی ھے جیسے کاریگر ترکھان کے مقابلے میں کوئی معمولی بڑھئی لگے...''

وہ کشتانکا سے باتیں کر ھی رہا تھا کہ اچانک موسیقی کا طوفان پھٹ پڑا۔ کشتانکا نے گھبرا کر نظر اٹھائی تو سپاھیوں کے ایک دستے کو سیدھا اپنی طرف بڑھتے پایا۔ اف یہ موسیقی ناقابل برداشت تھی۔ اس نے تو کشتانکا کے اعصاب کو جھنجوڑ ڈالا تھا اور وہ بوکھلائی ھوئی گول گول گھوم رہی‌تھی۔ منمنا، منمناکر فریادکر رہی تھی۔ مگر حد ھے بھئی بڑھئی تو نہ ڈرا، نہ منمنایا۔ نہ بھونکا نہ بوکھلایا۔ الٹا کھیسیں نکال پانچوں انگلیوں سے سلیوٹ مار اٹنشن کھڑا ھو گیا۔ اپنے مالک کی یہ بےنیازی دیکھ‌کر تو کشتانکا اور بھی زور زور سے بھونکنے لگی اور غصے میں دوڑتی ھوئی سڑک کے اس پار نکل گئی تھی۔

جب ذرا دم میں دم آیا تو دیکھا کہ بینڈ خاموش ھے اور فوجی دستہ گزر چکا ھے۔ وہ سڑک پار کرکے تیزی سے اسی جگہ پہنچی جہاں مالک کو چھوڑا تھا۔ مگر، ھائے، بڑھئی تو وھاں تھا ھی نہیں۔ وہ گھبرا کر آگے لپکی، پیچھے دوڑی، پھر سڑک کے پار بھاگی، مگر بڑھئی کو تو جیسے زمین نگل گئی تھی۔ اب کشتانکا نے فٹ پاتھ کو سونگھ سونگھ کر مالک کی بو کی مدد سے اسے ڈھونڈنا چاھا، مگر معلوم ھوتا ھے کہ ذرا ھی دیر پہلے کوئی کمبخت ربڑ کے نئے جوتوں میں وھاں سے گزرا تھا۔ ادھر سے ادھر تک فٹ پاتھ کی تمام ھلکی خوشبوئیں ربڑ کی تیز بو میں دب‌کر رہ گئی تھیں۔ اب ایسے میں پلا ٹوہ لگاتا تو کیسے!

کشتانکا ادھر سے ادھر بھاگتی رھی۔ بھٹکتی رھی، مگر مالک کو نہ ملنا تھا نہ ملا۔ ادھر دیکھتے دیکھتے رات کا اندھیرا گہرا ھو گیا۔ سڑک کے دونوں طرف روشنیاں جل رھی تھیں۔ مکانوں کی کھڑکیوں سے بھی روشنی چھن رھی تھی۔ روئی کے بڑے بڑے گالے جیسی برف مسلسل پڑ رھی تھی۔ سارا فٹ پاتھ برف کی چادر سے سفید ھو رہا تھا۔ گھوڑوں کی پیٹھ، کوچوانوں کی ٹوپیاں، غرض سب کچھ برف سے ڈھک رہا تھا۔ جیسے جیسے رات کی سیاھی بڑھ رھی تھی، ویسے ویسے ان چیزوں کی سفیدی اور ابھر رھی تھی۔

عجیب عجیب انجانے خریدار ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے۔ (کشتانکا کی نگاہ میں ساری انسانیت دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی — مالک اور خریدار۔ اور ان دونوں طبقوں میں بڑا فرق تھا۔ مالک طبقے کے ہر فرد کو اس کا حق تھا کہ وہ کشتانکا کو مارے، دھتکارے، مگر جہاں تک دوسرے طبقے کا تعلق ہے تو کشتانکا کو اس کا پورا حق تھا کہ جس کی چاہے پنڈلی پکڑے، دانت گاڑ دے۔) کوئی اسے پاؤں سے ٹھوک لگاتا ہوا گزر جاتا تو کوئی آنکھوں کے سامنے یوں جم جاتا کہ کچھ نظر ہی نہ آتا۔ یہ خریدار نجانے کہاں بھاگے چلے جا رہے تھے۔ کشتانکا کی طرف کوئی دھیان ہی نہیں دے رہا تھا۔

مگر جب رات کا اندھیرا زیادہ بڑھا تو کشتانکا پریشانی، ناامیدی اور خوف سے لرز گئی۔ بےچاری نجانے کس کی ڈیوڑھی میں سکڑ کر بیٹھ گئی اور بڑی مظلومی سے رونے سمیانے لگی۔ لوکا الیکساندریچ کے ساتھ دن بھر گھوم گھوم کر بےچاری تھکن سے نڈھال تھی۔ اس کے کان اور پنجے سردی سے ٹھٹھر رہے تھے۔ اور پھر بھوک سے برا حال تھا۔ دن بھر میں صرف دو دفعہ ایک آدھ نوالہ اس کے حلق سے اترا تھا۔ ایک دفعہ تو جلدساز کے ہاں ذرا سی لیئی چکھی تھی بےچاری نے۔ اور ایک دفعہ کسی سرائے میں کاؤنٹر کے قریب ساسیج کی جھلی زمین پر پڑی مل گئی تھی۔ اور بس الله خیر صلا! اگر خدا نے بےچاری کو انسان بنایا ہوتا تو اس وقت وہ ضرور سوچتی کہ: ”نہیں، ایسی زندگی پر لعنت۔ اس طرح جینا ناممکن ہے۔ میں خودکشی کر لوں‌گی!“

۲ - ایک پراسرار اجنبی

مگر وہ تو کچھ بھی نہیں سوچ رہی تھی۔ بس رونکھی آواز میں بھونک رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کا سر اور پشت نرم نرم روئی کے گلوں جیسی برف سے ڈھک گئے اور وہ تھکن سے نڈھال ہوکر تکلیف‌دہ اونگھ میں ڈوب گئی۔ اور تب اچانک پھاٹک کھلا، کواڑ چرچرائے، اور دھڑ سے اس سے ٹکرا گئے۔ وہ اچھل پڑی۔ ایک شخص — خریداروں کے طبقےوالا — باہر آیا۔ اور جب کشتانکا منمناتی ہوئی اس کے پیروں میں آئی‌تو خریدار کی نظر اس پر پڑ ہی گئی۔ خریدار جھک‌کر اس سے بولا:

”اے، پلے، تم کہاں سے آن ٹپکے یہاں؟ چوٹ تو نہیں لگی تمھارے؟ ہائے بچارا، دکھیا! آؤ آؤ غصہ تھوک دو۔ غصہ تھوک دو میرے دوست۔ معاف کردو مجھے...“

کشتانکا نے پلکوں پر پڑے ہوئے برف کے سفید گلوں کی اوٹ سے اس اجنبی کو دیکھا۔ اس کے سامنے چھوٹے سے قد کا ایک موٹا آدمی کھڑا تھا۔ اس کا بھاری چہرہ داڑھی مونچھ سے صاف تھا۔ سر پر اونچی ٹوپی تھی اور جسم پر سمور کا کھلا کوٹ جھول رہا تھا۔

”یوں رو کیوں رہے ہو بیٹا؟“ اجنبی انگلیوں سے کشتانکا کی برف جھاڑتا گیا اور اس

سے باتیں کرتا گیا۔ ''مالک کہاں ہے تمہارا؟ کیا بھٹک گئے ہو میرے دوست؟ ہائے بےچارہ پلا! اب کیا انتظام کیا جائے تمہارا؟،،

اجنبی کی آواز سے دوستی اور ہمدردی کی بو آئی تو کشتانکا نے لپک کر اس کا ہاتھ چاٹا اور دو گنا جوش سے رونا گانا شروع کر دیا۔

''افوہ رے پاگل، میرے ننھے!،، اجنبی نے کہا۔ ''لومڑی ہے بالکل۔ خیر چھوڑو، اب کیا کریں تمہارا۔ آؤ میرے ساتھ چلو، شاید کبھی ہمارے کام ہی آ جاؤ تم... تو چلیں!،،

اس نے چمکارکر، ہاتھ سے پلے کو اشارہ کیا جس کا مطلب تھا ''آؤ چلیں،، اور کشتانکا اس کے ساتھ ہو لی۔

آدھے گھنٹے بعد کشتانکا ایک بڑے سے، روشن کمرے میں فرش پر بیٹھی تھی۔ اس کا سر اپنے پہلو پر رکھا تھا اور وہ بڑی محبت، بڑے تجسس سے اس اجنبی کی طرف دیکھ رہی تھی جو میز کے قریب بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ وہ کھاتا جاتا اور کشتانکا کو ٹکڑا پھینکتا جاتا۔ پہلے تو اجنبی نے کشتانکا کو روٹی کے ٹکڑے اور پنیر کے ہرے کنارے دئے۔ پھر گوشت کا ٹکڑا دیا، سموسے کا نوالہ دیا، اور پھر مرغی کی بہت سی ہڈیوں سے تواضع کی۔ مگر وہ تو بھوک سے بےقرار ہوکر اس تیزی سے کھا رہی تھی کہ کسی چیز کا مزہ بھی نہ چکھ سکی۔ اور جیسے جیسے کھاتی گئی بھوک کا احساس اور بڑھتا چلا گیا۔

''تمہارا مالک کھلاتا پلاتا نہیں تمہیں؟،، اجنبی نے اسے اس طرح بےقراری سے چبائے بنا نوالے حلق کے پار اتارتے دیکھ‌کر پوچھا۔ ''ذرا دیکھو تو سہی کیسے سوکھے مارے ہو تم۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ...،،

کشتانکا ڈھیروں کھانا کھا گئی پھر بھی اس کی بھوک نہ مری۔ البتہ کھا کھا کر تھک گئی۔ کھاپی کر کمرے کے بیچوں بیچ لیٹ گئی۔ اس نے اطمینان سے ٹانگیں پھیلائیں اور تھکن کے مزے لوٹتے ہوئے دم ہلانے لگی۔ اس کا نیا مالک آرام کرسی میں دراز سگر پیتا رہا اور وہ دم ہلا ہلا کر سوچتی رہی کہ زندگی اس اجنبی کے ہاں بہتر گزر رہی تھی یا اپنے بڑھئی کے گھر۔ اس اجنبی کے گھر کا ماحول کچھ غریب اور بدحال سا تھا۔ آرام کرسیوں، صوفے، لیمپ اور قالینوں کے علاوہ کچھ بھی تو نہ تھا یہاں۔ کمرہ کیسا خالی خالی، اجاڑ اجاڑ سا لگ رہا تھا۔ بڑھئی کا گھر تو سامان سے بھرا رہتا تھا۔ میز تھی، بنچ تھی، لکڑی کی ڈھیروں چھیلن اور برادہ تھا۔ ہتوڑی، کلہاڑی، آری — کیا کچھ نہ تھا اس کے پاس اور پھر پنجرہ تھا، پنجرے میں بند چڑیا تھی۔ تسلہ تھا۔ اس اجنبی کے کمرے میں تو کوئی خوشبو بھی نہ تھی جبکہ اپنے بڑھئی کے ہاں ہمیشہ دھواں سا رہتا تھا۔ اور پھر ہمیشہ گوند، وارنش اور لکڑی کی چھیلن کی زوردار خوشبو بھری رہتی تھی، مگر دوسری طرف اجنبی کے ہاں ایک بات بہت زوردار چیز تھی:

کتنا ڈھیروں راتب دیا تھا اجنبی نے اسے۔ اور یہ بھی ٹھیک تھا کہ جب کشتانکا میز کے پاس بیٹھی اسے تکتی رہی، شکرگزاری سے دم ہلاتی رہی تب بھی اجنبی نے ایک دفعہ بھی تو اسے لات نہیں ماری۔ نہ مارا نہ دھتکارا نہ گالی دی کہ ''دفع ہو منحوس درندے!''

سگار ختم کرکے اس کا نیا مالک باہر گیا اور پل بھر میں لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا گدا تھا۔

''اے ننھے پلے، آؤ ادھر آؤ!'' اس نے صوفے کے قریب ھی کونے میں گدا بچھاتے ہوئے اسے آواز دی۔ ''آؤ، یہاں لیٹو اور سوجاؤ مزے سے!''

اور پھر وہ روشنی بجھاکر باھر نکل گیا۔ کشتانکا نے گدے پر براجمان ھوکر آنکھیں بند کرلیں۔ اچانک گلی سے کسی کے بھونکنے کی آواز آئی۔ ظاھر ھے کشتانکا بھی ضرور جواباً بھونکتی، مگر نجانے کیوں دل اداس ھو گیا۔ دل پر ایک بوجھ سا تھا۔ اسے لوکا الیکساندریچ کا خیال آیا، اس کا بیٹا فیدوشکا یاد آیا، اور بنچ کے نیچے اپنا چھوٹا سا اندھیرا کونا یاد آگیا۔ اسے جاڑے کی وہ لمبی شامیں یاد آئیں جب بڑھئی آری چلاتا رہتا یا زور زور سے اخبار پڑھا کرتا۔ اور فیدوشکا کشتانکا کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ بچہ پلے کی پچھلی ٹانگ پکڑکر اسے بنچ کے نیچے سے کھینچتا اور ایسی ایسی حرکتیں کرتا کہ بےچارے پلے کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا۔ اس کی ھڈی ھڈی دکھنے لگتی۔ فیدوشکا کبھی اسے پچھلی ٹانگوں پر دوڑاتا۔ کبھی پلے کو گھنٹی سمجھکر اس کی دم پکڑکر وہ زور زور سے ھلاتا کہ پوچھو مت۔ بچارا پلا لاکھ کیاؤں کیاؤں کرتا رو روکر بھونکتا مگر بےسود۔ اور تو اور وہ تو کشتانکا کو تمباکو تک سنگھا دیتا تھا... اور ایک کرتب تو بہت ھی تکلیف‌دہ تھا۔ بچہ گوشت کا ٹکڑا دھاگے میں باندھکر کشتانکا کو دیتا، اور جیسے ھی وہ گوشت نگلتی، بچہ دھاگا پکڑکر گھسیٹنا شروع کرتا۔ قہقہے مارتا جاتا اور اس کے معدے سے گوشت کھینچتا جاتا۔ جیسے جیسے کشتانکا کو یہ سب یاد آ رھا تھا، ویسے ویسے اس کی کیاؤں کیاؤں بڑھ رھی تھی۔

مگر جلد ھی تھکن نے اور ماحول کی گرمی نے اس کی ساری اداسی کو جیسے نچوڑ لیا۔ اور پلے کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ یادوں کے افق پر طرح طرح کے کتے دوڑ رھے تھے۔ ان میں سے ایک، بوڑھا پوڈل تو بہت ھی نمایاں تھا۔ یہ وھی کتا تھا جسے کشتانکا نے اس دن گلی میں دیکھا تھا۔ اس کی ایک آنکھ پر سفید دھبا تھا، اور ناک کے قریب اون کے گچھے سے تھے۔ فیدوشکا ھاتھ میں رندہ لئے اس کے پیچھے دوڑ رھا تھا۔ اور پھر دیکھتے دیکھتے وہ بھی اون کے گھنے گچھوں میں گھرکر کشتانکا کے ساتھ ساتھ مزے میں بھونکنے لگا۔ اس نے اور کشتانکا نے بڑے پیار، بڑی محبت سے ایک دوسرے کی ناکیں سونگھیں اور سڑک پر دوڑتے چلے گئے۔

۳ - نت نئی خوشگوار دوستیاں

کشتانکا کی آنکھ کھلی تو دن کا اجالا پھیلا ہوا تھا - گلی میں شور سا تھا - ایسا شور تو ظاہر ہے صرف دن کے وقت ہی ممکن تھا - کمرے میں اس کے علاوہ چڑیا کا بچہ بھی نہ تھا - کشتانکا نے انگڑائی لی، جمائیاں لیں، اور پھر خفا خفا سی، الجھی الجھی سی، کمرے کے چکر لگانے لگی - کبھی اس کونے کو سونگھتی کبھی اس کونے کو - اور پھر میز کرسیوں کا معائنہ کرتی ہوئی راہداری کے دروازے تک پہنچ گئی، جھانک کر دیکھا، مگر وہاں کام کی کوئی چیز نظر نہ آئی - راہداری‌والے اس دروازے کے قریب ہی ایک دروازہ اور تھا - کچھ سوچ بچار کے بعد کشتانکا نے دونوں پنجوں سے کواڑ نوچنے شروع کئے اور پھر کواڑ کھول‌کر برابروالے کمرے میں داخل ہو گئی - یہاں پلنگ پر ایک خریدار کمبل اوڑھے بےخبر سو رہا تھا - ارے یہ تو وہی کل‌والا اجنبی تھا -

''غر — ر — ر — ر،، کشتانکا غرائی - مگر پھر کل کے شاندار کھانے کا خیال آتے ہی دم ہلانے اور ہواؤں کو سونگھنے لگی -

اس نے اجنبی کے کپڑے اور جوتے سونگھے اور اسے ایسا لگا جیسے ان سے گھوڑوں کی خوشبو آ رہی ہو - بڈروم میں ایک دروازہ اور تھا - مگر وہ بھی بند تھا - کشتانکا نے دروازے کو پنجوں سے کھرچ کھرچ کر زور لگایا - اپنے سینے سے دھکیلا اور آخر کھول ہی لیا - دروازہ کھلتے ہی ناک میں بڑی عجیب سی، بڑی غلط قسم کی بو کا بھبکا گھسا - اور کشتانکا کو جیسے یقین ہو گیا کہ اب ضرور کسی ناگوار حادثے سے دوچار ہونا ہے - اور چوکنےپن سے ادھر ادھر دیکھتی اور غراتی ہوئی اس چھوٹے سے کمرے میں داخل ہو گئی جس کی دیواروں پر چپکا ہوا کاغذ نہایت غلیظ تھا - اندر داخل ہوتے ہی اسے گھبرا کر پیچھے ہٹنا پڑا - حد ہو گئی کیا خوفناک منظر تھا نظر کے سامنے! ملگجے رنگ کا ایک بطخا، زمین پر گردن جھکائے، پر پھیلائے پھنکارتا ہوا اس کی طرف لپک رہا تھا - قریب ہی چھوٹے سے ایک گدے پر سفید رنگ کا ایک بلا براجمان تھا - کشتانکا کو دیکھتے ہی بلا بھی اچھل‌کر کھڑا ہو گیا، کمر تن گئی، دم زور زور سے ہلنے لگی اور جسم کے بال غصے میں کھڑے ہو گئے - بلا بھی کشتانکا پر غرایا - سچی بات تو یہ ہے کہ کشتانکا بچاری کا ڈر کے مارے رنگ فق تھا - مگر بھلا وہ اپنی پریشانی ظاہر کیوں ہونے دیتی - فوراً زور زور سے بھونکتی ہوئی بلے کی طرف لپکی... اب تو بلے کی کمر بالکل کمان کی طرح تن گئی، ایک دفعہ میاؤں کیا اور تڑپ‌کر کشتانکا کے سر پر پنجا مارا - کشتانکا اچھل‌کر پیچھے ہٹی، چاروں پاؤں پر بیٹھی اور بلے کی طرف رخ کرکے، ناک اٹھاکر زور زور سے بھونکنے لگا - اس بیچ میں بطخا دبے پاؤں کشتانکا کے پیچھے پہنچ گیا - دیکھتے دیکھتے اس نے بھی کتے کی کمر پر بڑی زور سے چونچ ماری، کشتانکا اچھلی اور بطخے پر جھپٹ پڑی -

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟،، اچانک پیچھے سے کسی نے خفگی سے کہا۔ اور اجنبی منہ میں سگار دبائے، ڈریسنگ گاؤن سنبھالتا کمرے میں داخل ہوا۔ ''کیا مطلب ہے اس سب کا؟ چلو اپنی اپنی جگہ!،،

اس نے بلے کے پاس پہنچ کر اس کی تنی ہوئی کمر پر دھپ رسید کیا اور بولا:

''کیوں جی فیودر تیموفیئچ۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کر دیا شروع جھگڑا۔ اف بدمعاش، چلو لیٹو اپنی جگہ پر، جلدی!،،

پھر بطخے کی طرف مڑکر اسے ڈانٹا:

''ایوان ایوانیچ، تم بھی چلو، اپنے کونے میں!،،

بلا بڑی فرماں‌برداری سے دم دبا کر اپنے گدے پر لیٹ گیا اور جھٹ آنکھیں بند کرلیں۔ چہرے کے اتار چڑھاؤ اور مونچھوں کے پھڑکنے کے انداز سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ حضرت شرمندہ ھیں کہ غصے سے باؤلے ہوکر کیوں خواہ مخواہ جھگڑا مول لیا۔ کشتانکا نے بھی فوراً شکایتاً کیاؤں کیاؤں شروع کردی اور بطخے نے گردن لمبی کر کے جلدی جلدی غصے میں کچھ بولنا شروع کیا۔ ہاں وہ صاف بول رہا تھا۔ مگر بےمعنی الفاظ میں۔

''اچھا، ٹھیک ہے، ٹھیک ہے!،، ماسٹر نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو دوستی اور محبت سے رہو۔،، اس نے پیار سے کشتانکا کو تھپکا اور بولا: ''لال‌جھبرو، دیکھو ڈرو نہیں تم۔ ارے بڑے زوردار دوست ھیں یہ دونوں۔ کبھی شکایت کا موقع نہیں دیں گے تمھیں۔ ھاں یہ تو بتاؤ کہ تمھارا نام کیا رکھا جائے؟ بےنام کی تو تم رہ نہیں سکتیں‌میری جان!،،

اجنبی پل بھر کچھ سوچتا رہا، پھر بولا:

''میں بتاؤں، تمھارا نام ہوگا 'خالہ اماں'... سمجھ گئیں‌نا؟ 'خالہ اماں'!،،

اجنبی کئی بار ''خالہ خالہ،، پکارتا ہوا باھر نکل گیا۔ اب کشتانکا نے بیٹھ کر ذرا صورت‌حال کا جائزہ لینا شروع کیا۔ بلا اپنے گدے پر بالکل دم سادھے بیٹھا تھا۔ وہ سوتا بن گیا تھا۔ بطخا اب بھی گردن تان تان‌کر پنجے پٹخ پٹخ کر مسلسل کچھ کہہ رہا تھا، جلدی، جلدی، غصے میں۔ ظاھر تھا بطخا تھا بڑا ھوشیار۔ اپنی ھر لمبی تقریر کے بعد ایک قدم پیچھے ھٹتا — کچھ حیران پریشان سا۔ اور خود ھی اپنی تقریر پر حد درجہ خوشی کا اظہار کرتا... کشتانکا اس کی تقریر سنتی رھی اور ''غر — ر — ر — ر، غر — ر — ر،، کرکے جواب دیتی رھی۔ اور آخر کونے کونے گھوم کر فضا اور ماحول کو سونگھنے میں محو ھو گئی۔ ایک کونے میں پہنچی تو چھوٹا سا ایک ڈبہ رکھا نظر آیا۔ ڈبے میں کچھ بھیگے ہوئے مٹر کے دانے، اور پانی میں بھیگے ہوئے روٹی کے ٹکڑے رکھے نظر آئے۔ کشتانکا نے مٹر چکھے مگر اچھے نہ لگے۔ پھر بھیگی روٹی کو آزمایا اور کھاتی چلی گئی۔ بطخے نے اجنبی کتے کو اپنا کھانا کھاتے دیکھا، مگر رتی بھر خفا نہ ہوا۔ بلکہ وہ تو اور بھی جوش سے بولنے لگا۔ یہی نہیں دوستی کے اظہار میں خود بھی ڈبے کے پاس پہنچا اور ایک آدھ مٹر اٹھا کر کھا گیا!

۴ - جنگلے کے چمتکار

تھوڑی دیر بعد اجنبی پھر ان کے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک عجیب سی چیز تھی کچھ جنگلے جیسی، جیسے گیارہ کا ہندسہ ہو۔ لکڑی کے اس کھردرے فریم کے اوپری حصے پر ایک گھنٹی اور ایک پستول بندھی ہوئی تھی۔ گھنٹی کے لٹکن اور پستول کے گھوڑے سے ڈوریاں سی بندھی تھیں۔ اجنبی نے یہ چوبی جنگلا کمرے کے بیچوں بیچ رکھ دیا۔ بڑی دیر تک اس میں کچھ باندھتا، کھولتا رہا پھر بطخے سے بولا:

''ایوان ایوانیچ کہو کیا خیال ہے، ہو جائے ذرا...!''

بطخا بڑے انداز سے چلتا ہوا اس کے پاس پہنچا اور امید بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

''تو چلو، کرو شروع'' اجنبی نے کہا۔ ''بالکل شروع سے ہو جائے، سب سے پہلے ذرا جھک کر آداب تو بجا لاؤ۔ چلو سیدھے دیکھو نظر کی سیدھ میں!''

ایوان ایوانیچ نے صراحی‌دار گردن بڑھائی، بڑے انداز سے ہر سمت میں سلام کیا اور زور زور سے پاؤں مارے۔

''شاباش! یہ بات! چلو اب مرو تو جلدی سے!''

بطخے نے پیٹھ کے بل لیٹ کر ہوا میں ٹانگیں جما دیں۔ اس قسم کے دوچار اور معمولی کرتب کروانے کے بعد اچانک اجنبی نے گھبرا کر سر پکڑا اور پریشان اور خوفزدہ چہرہ بنا کر چلایا:

''بچاؤ، بچاؤ، آگ! ہائے ہم جل کر مرے، بچاؤ!..''

ایوان ایوانیچ تیزی سے جنگلے کی طرف دوڑا، اور چونچ میں ڈوری پکڑ کر زور زور سے گھنٹی بجانی شروع کر دی۔

افوہ کتنا خوش ہوا اجنبی، بڑے پیار سے بطخے کی گردن سہلا کر بولا:

''شاباش ایوان ایوانیچ، شاباش! اور اب جلدی سے جوہری تو بن جاؤ بیٹا جو سونا وار ہیرے بیچتا ہے۔ اور اب ذرا دوکان پر تو جاؤ، اوہو وہاں تو چور لگے ہوئے ہیں، بولو اب کیا کروگے تم؟''

بطخے نے دوسری ڈوری چونچ میں دبائی اور ایک دفعہ جو جھٹکا دیا تو ایسے زور سے پستول دغی کہ کان کے پردے پھٹ جائیں۔ کشتانکا تو پستول کا شور سن کر پھڑک اٹھی، ایسی مست ہوئی کہ جنگلے کے چکر کاٹ کاٹ کر خوب بھونکی۔

''لیٹ جاؤ خالہ اماں!'' اجنبی چلایا۔ ''چپ، خاموش!''

ایوان ایوانیچ کا کام پستول داغنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوا۔ گھنٹے بھر تک اجنبی بطخے کو ڈوری سے باندھ کر اپنے چاروں طرف دوڑاتا رہا۔ بار بار ہوا میں ہنٹر چمکتا، اور بطخا طرح طرح کی رکاوٹوں کے اوپر چھلانگ لگاتا نظر آتا۔ کبھی روک کے

اوپر چھلانگ لگا رہا ہے ۔ کبھی چھلوں کے بیچ میں سے کود رہا ہے اور کبھی بےچارے کو اکڑوں لیٹنا پڑتا ۔ یعنی دم پر بیٹھ کر ٹانگیں ہوا میں اچھالنا ۔ کشتانکا کا یہ عالم تھا کہ ایوان ایوانیچ سے نظریں ہٹانا ناممکن تھا ۔ کئی بار تو وہ ایسی مست ہو کر جھومی کہ بےقرار ہو کر تیزی سے بھونکتی ہوئی اس کی طرف دوڑ پڑی ۔ اور جب اجنبی اور بطخا دونوں تھکن سے نڈھال ہو گئے، تو اجنبی نے پیشانی سے پسینہ پونچھا اور زور سے آواز لگائی :

''ماریا، جلدی سے ھاورونیا ایوانوونا کو لے کر آؤ ۔ جلدی!،،

پل بھر بعد کچھ غرغراھٹ سی سنائی دی ۔ کشتانکا بھی جواباً غرائی ۔ غصے سے تن کر کھڑی ہو گئی، مگر احتیاط شرط ہے، جلدی سے اجنبی کی طرف کھسک کر اس کی پناہ میں ہو لی ۔ دروازہ کھلا، ایک بوڑھی عورت نے جھانک کر اندر دیکھا اور کچھ بولتی ہوئی، ایک بد شکل کالی سورنی کو اندر آنے دیا ۔ سورنی نے کشتانکا کی غراھٹ کو قطعی نظرانداز کر کے اپنی تھوتھنی اٹھائی، اور خوشی سے غرائی ۔ صاف ظاہر تھا کہ مالک سے اور اپنے ساتھیوں — یعنی بلے اور ایوان ایوانیچ سے مل کر اسے بہت خوشی ہو رہی تھی ۔ اور جب وہ بلے کے پاس گئی اور تھوتھنی سے اس کے پیٹ پر ایک ھلکا سا دھپ مارا اور بطخے سے کچھ بولی تو اسکی ہر ہر حرکت سے اس کی چھوٹی سی دم کی تڑپ سے صاف ظاہر تھا کہ سورنی دوستی کرنا چاھتی ہے ۔ اور تب کشتانکا نے سوچا کہ ایسی ھستی پر غرانا اور بھونکنا تو غلط ہوگا ۔

مالک نے جنگلا ہٹا کر زور سے آواز دی :

''فیودر تیموفیئچ، ہو جائے ایک ھاتھ!،،

بلے نے کاھلی سے انگڑائی لی، اور کچھ ھچکچاتا ہوا سورنی کی طرف بڑھا، جیسے مجبوراً فرض پورا کر رہا ہو ۔

''تو 'اھرام مصر' سے شروع کریں؟،، مالک بولا ۔

بڑی دیر تک وہ انھیں کچھ بتاتا سمجھاتا رہا ۔ پھر جیسے حکم دیا ''ایک.... دو... تین!،،

''تین،، کہنا تھا کہ ایوان ایوانیچ نے پر پھڑپھڑائے اور اچھل کر سورنی کی پیٹھ پر سوار ہو گیا... اور جب بطخا اپنے پروں اور گردن کی مدد سے بیلنس کر کے سورنی کی کھردرے بالوں بھری پیٹھ پر اچھی طرح جم گیا تو فیودر تیموفیئچ آگے بڑھا — بےدلی سے، کاھلی کے ساتھ ۔ اس کے ایک ایک انگ سے ناپسندیدگی عیاں تھی ۔ جیسے اپنے آرٹ کو گھٹیا سمجھ رہا ہو، مجبوراً بلا ٹال رہا ہو ۔ ھاں تو بلا کاھلی سے اٹھا، سورنی کی پیٹھ پر چڑھا، پھر بےدلی سے، ھچکچاتا ہوا بطخے کی پیٹھ پر سوار ہو کر اپنی پچھلی ٹانگوں کے بل کھڑا ہو گیا ۔ اور اس طرح بقول اجنبی ''اھرام مصر،، بن گیا ۔ کشتانکا تو خوشی سے دیوانہ ہو کر گھبرا گھبرا کر بھونکنے لگی ۔ مگر اسی لمحے بوڑھے بلے کو جماھی جو

آئی تو اس کا بیلنس بگڑا اور وہ بطخے کی پیٹھ پر سے لڑھک گیا۔ ایوان ایوانیچ بھی لڑکھڑایا اور دھپ سے گر گیا۔ اجنبی زور سے چیخا۔ ھاتھ چلا چلا کر نجانے کیا کیا گر کی باتیں سمجھا رھا تھا۔ ان کا مالک تو جیسے تھکن نام کی کسی چیز کو جانتا ھی نہ تھا۔ گھنٹے بھر تک، ''اھرام مصر،، بنوانے کے بعد وہ ایوان ایوانیچ کو بلے پر چڑھنے کا گر سکھانے لگا۔ اور پھر بلے کو سگرٹ پینا سکھایا، چند اور گر سکھائے اور پھر کچھ اور سکھائے۔

اور آخر آج کا سبق ختم ھوا۔ اجنبی نے چہرے سے پسینہ پونچھا اور کمرے سے باھر نکل گیا۔ فیودر تیموفیئچ نے جھنجھلا کر غراتے ھوئے اپنے مخصوص گدے پر سر پٹک کر آنکھیں بند کر لیں۔ ایوان ایوانیچ اپنی ناند کی طرف چلدیا اور سورنی کو بڑی بی واپس لے گئیں۔ اتنے بہت سے نئے تجربوں کا مزا بھلا ھو، دن کب اور کیسے گزرا، کشتانکا کو پتہ ھی نہ چلا، اور جب شام ھوئی تو اس کا گدا بھی گندی دیواروں والے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اور اس طرح وہ بھی فیودر تیموفیئچ اور بطخے کی ھم کمرہ بن گئی۔

٥- گن ھی گن

ایک مہینہ بیت گیا۔

کشتانکا ھر شام بڑھیا ڈنر کھانے اور ''خالہ اماں،، کے نام سے بلائے جانے کی عادی ھو چلی تھی۔ اب تو اسے اجنبی سے اور اپنے نئے ساتھیوں سے بھی لگاؤ ھو گیا تھا۔ زندگی بڑے سکون، بڑے آرام سے بیت رھی تھی۔

ھر نیا دن ایک ھی انداز سے شروع ھوتا۔ عام طور پر ھر صبح ایوان ایوانیچ سب سے پہلے اٹھتا، اٹھتے ھی سیدھا ''خالہ اماں،، کے پاس یا بلے کے پاس پہنچتا، اور گردن گھما گھما کر بڑے جوش، بڑے یقین سے کچھ بولنا شروع کردیتا، مگر کیا بولتا تھا، یہ آج تک سمجھ میں نہ آیا۔ کبھی کبھی تو ھوا میں گردن بڑھا کر ایک لمبی تقریر کرتا، جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رھا ھو۔ شروع شروع میں تو کشتانکا اسکی لمبی لمبی تقریریں سن سن کر اسے بڑا عقلمند سمجھتی تھی، مگر جلد ھی بطخے کا سارا رعب ختم ھو گیا۔ اب وہ بچارا اسکے سامنے لمبی لمبی تقریریں کرتارھتا مگر کشتانکا ھرگز دم ھلا کر اس کی داد نہ دیتی، بلکہ اسے زمانے بھر کی نیندکا دشمن، سمابکو سمجھتی، اور تو اور اب تو وہ بلا جھجک اسکی تقریروں کے جواب میں غصے سے غرا کر غر — ر — رکر اٹھتی۔

فیودر تیموفیئچ بالکل دوسری قسم کا نہایت نیک شریف بندہ تھا۔ نیند ٹوٹ بھی جاتی تو کوئی آواز نہ نکالتا، نہ ھلتا، نہ آنکھ کھولتا، اجی اس کا بس چلتا تو کبھی جاگتا ھی نہ۔ ارے کون نہیں جانتا تھا کہ اسے زندگی کا زیادہ چاؤ نہیں ھے، کسی بھی بات، کسی بھی چیز سے دلچسپی نہیں تھی بلے کو، ھر چیز کی طرف ایک بےنیازی، ایک

نفرت کا انداز تھا اس کا، ارے اور تو اور وہ تو بڑھیا سے بڑھیا راتب کھاتے ہوئے بھی نفرت کا اظہار کرتا جاتا تھا۔

کشتانکا تو آنکھ کھلتے ہی کونے کونے گھومنے اور سونگھنے لگتی۔ بس وہ اور بلا، دو ہی تو تھے جنھیں سارے گھر میں گھومنے کی اجازت تھی۔ بطخے کو تو گندی دیواروں والے کمرے کی دھلیز پار کرنے کی بھی مناہی تھی۔ اور هاورونیا ایوانوونا دور احاطے میں بنے ہوئے چھوٹے سے کسی اصطبل میں رہتی تھی، بس سبق کے وقت اندر آتی۔ ان کا مالک ذرا دیر میں اٹھتا تھا۔ اٹھتے ہی چائے پیتا اور انھیں نت نئے کرتب سکھانا شروع کر دیتا۔ ہر روز لکڑی کا جنگلا، ہنٹر اور حلقے اندر لائے جاتے اور روز وہی کرتب شروع ہو جاتے۔ ٹریننگ کا سلسلہ تین چار گھنٹے چلتا رہتا۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی تو فیودر تیموفیئچ کا تھکن سے ایسا برا حال ہو جاتا کہ بچارا شرابیوں کی طرح لڑکھڑانے لگتا، اور ایوان ایوانیچ چونچ کھول کھول کر بھاری بھاری سانس لینے لگتا۔ ادھر مالک کا منہ سرخ ہو جاتا، اور بار بار پیشانی پونچھنے پر بھی پسینہ صاف نہ کرپاتا۔

ٹریننگ کے ان کلاسوں اور ڈنر نے زندگی کو بڑا رنگین بنا دیا تھا، مگر شامیں بڑی بھاری گزرتی تھیں۔ مالک تو شاموں کو ہمیشہ ہی کہیں چلا جاتا تھا، جاتے ہوئے بلے اور بطخے کو بھی لیجاتا۔ ''خالہ اماں،، بچاری اکیلی رہ جاتی تو اپنے گدے پر پڑ جاتی اور اس کا دل اداسیوں کا اڈا بن جاتا...

دیکھتے دیکھتے وہ اداسیوں کے بادل میں گھر جاتی، اداسیاں کچھ اس طرح بڑھتی چلی جاتیں جیسے کمرے میں رات کا اندھیرا پھیلتا چلا جائے۔ کچھ ایسا ہوتا کہ بچارا پلا ساری سدھ بدھ کھو بیٹھتا، نہ بھونکنے کی خواہش ہوتی، نہ کھانے کو جی چاہتا، نہ کمرے میں اچھل کود کو من کرتا، نہ نظر اٹھاکر کسی چیز کی طرف دیکھنے کو دل چاہتا۔ اور تب تصور کے افق پر کچھ عجیب عجیب سے ہیولے ابھرتے، نیم کتے، نیم انسان، بڑے دلچسپ بڑے جاذب نظر، مگر ایک سے ایک ناقابل فہم، سمجھ ہی میں نہ آتا کہ کون کیا ہے۔ وہ سامنے آتے تو ''خالہ اماں،، دم ہلانے لگتی، اور اسے لگتا کہ اس نے انھیں کبھی کہیں دیکھا ہے، ان سے محبت کی ہے۔ اور جب نیند سے بوجھل آنکھیں بند ہونے لگتیں تو ''خالہ اماں،، کو ایسا محسوس ہوتا کہ ان ہیولوں سے گوند، لکڑی کی چھیلن اور وارنش کی خوشبو پھوٹتی ہے!

اور جب کشتانکا اپنی نئی زندگی کی عادی ہو گئی، اور جب یہ سوکھا سارا لمٹنگو دوغلا پلا بڑھ کر چمکتی ہوئی چکنی اور بڑھیا کتیا ہو گئی، تو ایک دن ٹریننگ سے پہلے اس کے نئے مالک نے اسے سہلایا اور بولا:

''بس بہت ہو گیا خالہ اماں، اب تم بھی ذرا کام دھام میں لگو! بہت دن پاؤں پسار کر سو لئے دوست، اب آؤ ذرا تمھیں فنکار بنا ڈالیں... کیوں خالہ، بنوگی نہ آرٹسٹ؟،،

اور اجنبی نے اسے مختلف کرتب سکھانے شروع کردئے۔ پہلے سبق میں اس نے

''خالہ اماں،، کو پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہونے اور چلنے کا گر سکھایا اور ''خالہ،، کو اس کرتب میں بڑا مزہ آیا۔ دوسرے سبق میں اسے پچھلی ٹانگوں پر اچھل کر شکر کا ٹکڑا پکڑنا تھا جو اس کے گرو صاحب ہوا میں اس کے سر سے بھی اونچا پکڑے کھڑے تھے۔ اور پھر نت نئے سبق ہوتے رہے، اور ''خالہ اماں،، نئی نئی باتیں سیکھتی رہی، ناچنا سیکھا، ڈوری سے بندھے دوڑنے کا سبق لیا، موسیقی کی دھن پر بھونکنے کا فن سیکھا، گھنٹی بجانے میں مہارت حاصل کی، اور پستول تک داغنے لگی۔ اور مہینے بھر کے اندر اندر ''اھرام مصر،، والے کرتب میں فیودر تیموفیئچ کی جگہ سنبھالنے کے قابل ہو گئی۔ ''خالہ اماں،، بڑے جوش سے سب کرتب سیکھ رہی تھی اور اپنی کامیابی پر خوب نازاں تھی۔ زبان باہر لٹکی ہوئی ہے اور وہ ڈوری سے بندھے بھاگ رہی ہے۔ چھلانگ لگا کر حلقے میں سے گزر رہی ہے۔ بوڑھے فیورد تیموفیئچ کی کمر پر سوار ہو کر چڑھی کھا رہی ہے، اف کس قدر مزہ آتا تھا ''خالہ اماں،، کو ان سب کرتبوں میں۔ جب جب اس کا کرتب کامیاب ہوتا تو وہ خوش ہو کر تیز آواز میں بھونکتی۔ اور اس کا گرو اس کی کامیابی پر حیران بھی ہوتا، خوش بھی، اور مارے خوشی کے ھاتھ ملنے لگتا۔

''واہ کیا گن ہے! کیا گن ہے!،، وہ کہتا۔ ''لاجواب گن۔ ارے خالہ اماں، تم تو ضرور کامیاب اداکار بنوگی!،،

اور ''خالہ اماں،، کے کان یہ لفظ ''گن،، سنتے سنتے اس کے ایسے عادی ہوئے، کہ اب تو وہ ''گن،، کا لفظ سن کر یوں اچھلتی مانو یہی اس کا نام ہو۔

٦ - ایک تکلیف دہ رات

''خالہ،، نے ایک رات خواب دیکھا کہ ایک دربان ھاتھ میں جھاڑو لئے اس کے پیچھے دوڑ رہا ہے، اور اس کی نیند ٹوٹی تو وہ خوف سے کانپ رہی تھی۔

کمرے میں بالکل اندھیرا تھا اور بلا کی گھٹن۔ پسو کاٹ رہے تھے۔ ''خالہ،، تو کبھی آج تک اندھیرے سے نہیں ڈری تھی، مگر اس رات نجانے کیوں دل خوف سے لرز گیا اور وہ بھونکنے کو بےقرار ہو اٹھی۔ برابر والے کمرے میں مالک نے گہرا سانس لیا۔ ذرا سی دیر بعد سورنی غرائی اور پھر سناٹا چھا گیا۔ کھانے پینے کی طرف توجہ کرنے سے دل کا بوجھ کچھ ھلکا سا ہو جاتا ہے۔ ''خالہ اماں،، کی توجہ بھی کھانے پینے کی طرف مبذول ہو گئی۔ اسے یاد آیا کہ کیسے دن میں اس نے فیودر تیموفیئچ کے کھانے سے مرغی کی ٹانگ چرائی تھی۔ کیسے اس ٹانگ کو ڈرائنگ روم میں الماری اور دیوار کے بیچ والے کونے میں چھپا دیا تھا، ارے وھیں جہاں ڈھیروں مکڑیوں کے جالے تھے، ڈھیروں گردا تھا۔ کیا خیال ہے اس وقت جا کے دیکھا جائے کہ ھڈی وھاں ہے یا نہیں؟ کون جانے مالک کی نظر پڑ گئی ہو اور وہ ھضم کر بیٹھا ہو۔ مگر صبح سے پہلے کمرے سے

نکلنے کی اجازت ھی کہاں تھی۔ ''خالہ اماں،، نے کس کر آنکھیں بند کیں اور جلد سے جلد سونے کی کوشش کرنے لگی، کیونکہ تجربے نے اسے سکھا دیا تھا کہ اگر جلدی سو جاؤ، تو صبح جلدی ھو جاتی ھے۔ مگر اچانک کہیں قریب ھی کچھ عجیب عجیب قسم کی چیخ ابھری اور ''خالہ اماں،، چونک کر اچھلی اور تن کر کھڑی ھو گئی۔ آواز ایوان ایوانیچ کی تھی، مگر یہ چیخ ھمیشہ کی طرح جوشیلی بڑبڑاھٹ جیسی نہیں تھی، یہ تو بڑی وحشیانہ، بڑی تیز، بڑی عجیب سی چیخ تھی، جیسے کوئی دروازہ زور سے چرچرا اٹھے۔ اندھیرے میں ھاتھ کو ھاتھ سجھائی نہیں دے رھا تھا، ایسے میں خاک پتہ چلتا کہ بات کیا ھے، اور ''خالہ اماں،، اور بھی خوفزدہ ھو گئی، سارے ڈر کے غر - ر - رکرنے لگی۔

کچھ وقت گزرا، بس یوں سمجھو کہ ایک ھڈی کھانے بھر کا وقت بیت گیا مگر پھر دوبارہ کوئی چیخ نہیں ابھری۔ رفتہ رفتہ ''خالہ اماں،، کی پریشانی اور گھبراھٹ ذرا کم ھوئی اور نیند سے بوجھل آنکھیں بند ھونے لگیں۔ اچانک خواب کی دنیا سے دو بڑے بڑے کالے کتے ابھرے۔ پچھلے سال گھنے بال گر گئے ھونگے، مگر ان کے پہلوؤں اور رانوں پر ابھی تک پرانے بالوں کے گچھے موجود تھے۔ وہ ایک بڑی سی ناند میں منہ ڈالے ملگجے سے رنگ کی کوئی پتلی پتلی چیز پی رھے تھے جس سے سفید سفید بھاپ اٹھ رھی تھی اور جس کی خوشبو سے منہ میں پانی آ رھا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر پر دونوں سر اٹھاکر ''خالہ اماں،، کو دیکھتے، اور دانت نکوس کر غرانے لگتے: ''کچھ نہیں دیں گے تمھیں ھم!،،۔ مگر دیکھتے دیکھتے سمور کے کوٹ والا ایک کسان دوڑتا ھوا مکان سے نکلا اور ھنٹر گھما گھما کر انھیں وھاں سے بھگا دیا اور تب ''خالہ اماں،، ناند کے پاس پہنچی اور جلدی جلدی منہ مارنے لگی۔ مگر جیسے ھی کسان پھاٹک سے نکلا، دونوں کالے کتے غراتے ھوئے اس پر ٹوٹ پڑے، اور اچانک ھوا میں وھی تیز چیخ ابھری۔

''غی... غی - ی، غی - ی - ی - ی!،، ایوان ایوانیچ چلایا۔

''خالہ اماں،، ھڑبڑا کر جاگی، اچھل کر کھڑی ھوئی، اور گدے سے قدم اٹھائے بغیر ھی زور زور سے بھونکنے اور رونے لگی۔ نجانے کیوں اسے لگا کہ یہ چیخ ایوان ایوانیچ کی نہیں کسی اور کی تھی۔ اور پھر نجانے کیوں سورنی بھی اپنے باڑے میں زور سے غرائی۔

:

اور پھر سلیپر گھسٹنے کا شور سنائی دیا اور مالک ڈریسنگ گاؤن پہنے، ھاتھ میں موم بتی لئے اندر داخل ھوا۔ موم بتی کی جھلملاتی ھوئی روشنی گندی دیواروں اور چھت پر ناچنے لگی اور اندھیرا چھٹ گیا۔ اور تب ''خالہ اماں،، نے دیکھا کہ کمرے میں دور دور کوئی اجنبی نہیں تھا۔ ایوان ایوانیچ زمین پر بیٹھا تھا، نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کے پر پھیلے ھوئے تھے اور چونچ کھلی ھوئی تھی۔ ایسا لگ رھا تھا جیسے وہ بہت تھکا ھوا، بہت پیاسا ھو۔ بوڑھا بلا فیودر تیموفیئچ بھی جاگ رھا تھا، شاید وہ بھی چیخ سن کر اٹھ گیا ھوگا۔

''کیا ہوا ایوان ایوانیچ؟،، مالک نے بطخے سے پوچھا - ''چلا کیوں رہے تم؟ کچھ تکلیف ہے کیا؟،،

بطخے نے کوئی جواب نہیں دیا - مالک نے آہستہ سے اسے چھوا، اسکی کمر تھپتھپائی اور بولا: ''عجیب چیز ہو تم بھی، نہ خود سوتے ہو، نہ دوسروں کو سونے دیتے ہو...،،

اور مالک موم‌بتی ہاتھ میں لئے لئے کمرے سے نکل گیا - کمرے میں ایک دفعہ پھر اندھیرا پھیل گیا اور ''خالہ اماں،، پھر خوفزدہ ہوئی - بطخا چیخا بھی نہیں، لیکن پلے کو پھر ایسا محسوس ہوا جیسے کمرے میں کوئی اجنبی گھس آیا ہو - اور سب سے بھیانک بات یہ تھی کہ اس اجنبی کی ٹانگ میں دانت گاڑنا بھی ناممکن تھا، کیونکہ وہ نہ تو نظر آتا تھا، نہ اس کا کوئی جسم تھا - نجانے کیوں ''خالہ اماں،، کو لگا کہ اس رات ضرور کوئی خوفناک بات ہو کے رہے گی - فیودر تیموفیئچ بھی پریشان سا تھا - ''خالہ اماں،، اندھیرے میں اسے گدے پر پہلو بدلتے سن رہی تھی - کبھی جمائیاں لیتا، کبھی سر ادھر ادھر کرنے لگتا -

گلی میں کہیں کسی پھاٹک پر کسی نے دستک دی اور سورنی پھر اپنے باڑے میں کراہ اٹھی - ''خالہ اماں،، بوکھلا کر رونے لگی، اور پھر اپنے اگلے پنجے پھیلا کر اپنا سر ان پر رکھ کر پڑ گئی - اسے ایسا لگا کہ دروازہ پیٹنے کی اس آواز میں، سورنی کے اس طرح غرانے میں، جو نجانے کیوں آج رات جاگ رہی تھی، اس اندھیرے میں، اس خاموشی میں غرض آج رات کی ہر بات میں کوئی ایسی بھیانک، ایسی تکلیف‌دہ بات تھی جیسی ایوان ایوانیچ کی چیخ میں تھی - ہر چیز پر پریشانی اور بےچینی طاری تھی — مگر کیوں؟ یہ اجنبی کون تھا جو نظر بھی نہیں آتا تھا؟ پل بھر کو ''خالہ،، کے قریب ہی کہیں دو ہری ہری روشنیاں سی جل کر بجھ گئیں، ارے یہ تو فیودر تیموفیئچ اسکی طرف بڑھ رہا تھا - پہلی ملاقات سے لیکر آج تک پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ وہ ''خالہ اماں،، کی طرف آیا ہو - کیا چاہئے اسے؟ ''خالہ،، نے اسکے پنجے چاٹے، اور آنے کی وجہ پوچھے بغیر ہی مختلف مدھم سروں میں غرائی -

''غی — ی — ی!،، ایوان ایوانیچ چلایا - ''غی — ی — ی!،،

دروازہ پھر کھلا اور مالک پھر موم‌بتی اٹھائے اندر داخل ہوا -

بطخا اب بھی اسی انداز میں بیٹھا تھا، چونچ کھلی ہوئی، پر پھیلے ہوئے، آنکھیں بند -

''ایوان ایوانیچ!،، مالک نے اسے پکارا -

بطخے کو جنبش بھی نہ ہوئی - مالک اس کے قریب ہی زمین پر بیٹھ گیا، پل بھر خاموشی سے اسے تکتا رہا، پھر بولا:

''بات کیا ایوان ایوانیچ، تم مر تو نہیں رہے، بھائی - اف یاد آیا، ہاں یاد آیا! ،، اچانک وہ سر پکڑ کر چلایا - ''اب میں سمجھ گیا یہ سب کیسے ہوا - آج تم گھوڑے کی ٹاپوں میں آ گئے تھے نا؟ اف میرے خدا، میرے خدا!،،

''خالہ اماں،، کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ مالک کہہ کیا رہا ہے، مگر اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بھی ڈر رہا ہے کہ کوئی خوفناک بات ہونےوالی ہے۔ ''خالہ اماں،، اندھیرے میں چھپی ہوئی کھڑکی کی طرف منہ اٹھاکر رونے لگی، اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس کھڑکی سے کوئی خوفناک اجنبی اندر جھانک رہا ہے۔

''وہ مر رہا ہے، خالہ اماں،، اس کے مالک نے کہا اور غم اور دکھ سے ہاتھ ملنے لگا۔ ''ہاں خالہ ہاں، مر رہا ہے وہ۔ موت آج تمھارے کمرے میں گھس آئی ہے۔ اب کیا کریں ہم، بولو، کیا کریں؟،،

مالک کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔ وہ اسی طرح گھبرایا گھبرایا، ٹھنڈی سانسیں لیتا، لرزتا ہوا واپس اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ''خالہ اماں،، اندھیرے کے خیال سے اتنی خوفزدہ تھی کہ مالک کے پیچھے پیچھے اس کے بڈروم میں پہنچ گئی۔ مالک پلنگ پر بیٹھ گیا۔ وہ بار بار دکھی آواز میں دوہرا رہا تھا: ''اف میرے خدا، کیا کروں میں اب؟،،

''خالہ،، بوکھلائی ہوئی سی اسکے قدموں میں بھٹک رہی تھی، سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اتنی دکھی کیوں ہے، کہ وہ سب اتنے پریشان کس لئے ہیں۔ ''خالہ اماں،، بڑے غور سے مالک کی ایک ایک بات، ایک ایک حرکت کا معائنہ کر رہی تھی کہ شاید اس طرح یہ گتھی سلجھانے میں کچھ مدد مل جائے۔ اور تو اور فیودر تیموفیئچ بھی، جو کبھی بھول کر بھی اپنے گدے سے نہیں اٹھتا تھا، بھٹکتا ہوا سا مالک کے کمرے میں چلا آیا، اور مالک کے قدموں سے پیٹھ رگڑنے لگا۔ باربار سر جھٹک رہا تھا، جیسے پریشان کن خیالات کو ذہن سے نکالنا چاہتا ہو۔ بوڑھا بلا بڑی الجھن سے باربار پلنگ کے نیچے جھانکنے لگتا، جیسے اسے کچھ شبہ سا ہو رہا ہو۔

مالک نے ایک پلیٹ میں تسلے سے تھوڑا سا پانی انڈیلا، اور پھر بطخے کی طرف چلدیا۔

''لو پانی پی لو، ایوان ایوانیچ،، پلیٹ بطخے کے سامنے رکھ کر اس نے بڑی محبت سے کہا۔ ''لو پیارے، پانی پی لو!،،

مگر ایوان ایوانیچ نہ جگہ سے ہلا، نہ آنکھ کھولی۔ مالک نے پلیٹ پر اس کا سر جھکا کر اسکی چونچ پانی میں ڈبو دی مگر ایوان ایوانیچ نے پھر بھی ایک بوند تک نہ لی۔ اس کے پر اور پھیل گئے، اور سر اسی طرح پلیٹ میں پڑا رہا۔

''نہیں، کچھ نہیں ہو سکتا اب۔،، مالک کے دل سے ایک آہ نکلی۔ ''سب ختم ہو گیا۔ ایوان ایوانیچ دم توڑ چکا ہے!،،

اور اس کے گالوں پر چمکدار بوندیں ٹپکنے لگیں، بالکل ویسی جیسی بارش‌والے دن کھڑکی کے شیشوں پر ٹپکتی نظر آتی ہیں۔ ''خالہ اماں،، اور فیودر تیموفیئچ کچھ نہیں سمجھے مگر خوفزدہ نظروں سے بطخے کو دیکھتے ہوئے مالک سے اور سٹ کر بیٹھ گئے۔

''بچارا ایوان ایوانیچ!،، سالک کی آواز میں بین کی کیفیت تھی۔ ''اور میں سوچ رہا تھا کہ بہار آئےگی تو تمھیں دیہات لے جاؤں‌گا، تمھارے ساتھ ھری بھری گھاس پر گھوموں‌گا۔ میرے پیارے ساتھی، میرے اچھے دوست، تم ختم ھو گئے، اب تمھارے بغیر کیا کروں‌گا میں؟،،

اور ''خالہ اماں،، کو ایسا لگا کہ اس کا بھی یہی انجام ھوگا، یعنی وہ بھی نجانے کیوں ایک دن اسی طرح آنکھیں بند کرلےگی، اسکی آنکھیں بند ھو جائیں‌گی، پنجے پھیل جائیں‌گے، منہ کھل جائےگا اور ھر کھڑا بیٹھا اسے ایسی ھی خوفزدہ نظروں سے دیکھےگا۔ شاید فیودر تیموفیئچ کے ذھن میں بھی ایسے ھی خیالات جنم لے رھے تھے۔ بوڑھا بلا آج سے پہلے کبھی اتنا اداس، اتنا دکھی نظر نہیں آیا تھا۔

اور پھر صبح کی روشنی پھیلنے لگی، اور وہ ان‌دیکھا اجنبی، جس کے خیال ھی سے ''خالہ اماں،، کے رونگٹے کھڑے ھو جاتے تھے، کمرے سے غائب ھو گیا۔ اور جب دن خوب نکل آیا تو دربان اندر داخل ھوا، اور بطخ کو اٹھاکر واپس چلدیا، ذرا سی دیر بعد بوڑھی ملازم آئی اور اسکی ناند اٹھاکر لے گئی۔

''خالہ اماں،، نے ڈرائنگ روم میں جاکر الماری کے پیچھے نظر ڈالی۔ سالک نے مرغے کی ھڈی نہیں کھائی تھی، وہ اب بھی اسی طرح گرد اور مکڑی کے جالوں میں گھری پڑی تھی۔ مگر ''خالہ،، کا دل اداس تھا، عجیب بےلطفی کی کیفیت تھی، رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ اس نے تو پلٹ‌کر ھڈی کو سونگھا بھی نہیں، خاموشی سے صوفے کے نیچے بیٹھ‌کر باریک سی آواز میں آھستہ آھستہ رونے لگی۔

۷ - پہلا کھیل ناکام

ایک شام سالک، گندی دیواروں‌والے اس کمرے میں آیا اور ھاتھ ملتے ھوئے بولا:

''ھوں... تو...،،

کچھ اور کہنا چاھتا تھا مگر کہے بغیر ھی چلا گیا۔ ''خالہ اماں'' نے ٹریننگ کے سبقوں کے درمیان سالک کے ایک ایک اشارے، چہرے کے ایک ایک اتار چڑھاؤ کا اچھی طرح جائزہ لیا تھا۔ دیکھتے ھی سمجھ گئی کہ سالک گھبرایا ھوا اور پریشان ھے، بلکہ شاید خفا بھی ھے۔ تھوڑی ھی دیر میں سالک پھر آیا اور بولا:

''آج میں خالہ اماں اور فیودر تیموفیئچ کو اپنے ساتھ لیجاؤں‌گا۔ خالہ، آج 'اھرام‌مصر، والے کرتب میں تم ایوان ایوانیچ غریب کی جگہ لوگی۔ خدا جانے تماشا کیسا رھےگا، نہ کچھ تیاری ھے، نہ ٹریننگ۔ گنتی کے چند رھرسل ھوئے ھیں! اف آج ضرور ذلیل ھونا پڑےگا، آج ضرور ناکامی کا منہ دیکھنا قسمت میں لکھا ھے!،،

وہ دوبارہ باھر نکل گیا اور پلٹا تو سمور کے کوٹ اور اونچے ھیٹ میں ملبوس تھا۔

وہ بلے کے قریب پہنچا، اسے اگلے پنجوں سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنے کوٹ کے دامن میں رکھ لیا، مگر فیودر تیموفیئچ کے تو کان پر جوں تک نہ رینگی، پٹھے نے آنکھ کھول کر دیکھنے تک کی تکلیف گوارا نہ کی۔ اسکو تو جیسے کسی بات کی پرواہ ھی نہ تھی۔ دن دن بھر پسرا پڑا رھے یا ٹانگیں پکڑ کر اٹھا لیا جائے، گدے پر آرام کرے یا مالک کے سمور کے کوٹ کے دامن میں پناہ حاصل کرے، اسکی بلا سے...

''چلو تم بھی آؤ خالہ آؤ۔،، مالک نے آواز دی۔

''خالہ اماں،، کے خاک پلے نہ پڑا کہ جانا کہاں ھے۔ مگر دم ھلاتی ھوئی ساتھ ھو لی۔ اگلے لمحے وہ برف گاڑی میں سوار مالک کے قدموں میں بیٹھی تھی اور مالک کو پریشانی گھبراھٹ اور سردی سے کپکپاتی آواز میں بڑبڑاتے سن رھی تھی:

''آج ضرور رسوا ھوں گے۔ آج تو مارے گئے!،،

برف گاڑی ایک بڑے سے، عجیب و غریب مکان کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ مکان کیا تھا مانو کسی نے شوربے کا پیالہ الٹ کر رکھ دیا ھو۔ شیشے کے تین دروازوں والے اس مکان کی لمبی چوڑی راہداری درجنوں روشنیوں سے جگمگا رھی تھی۔ دروازے مسلسل شور مچاتے ھوئے کھل اور بند ھو رھے تھے اور ان گنت آدمی مسلسل اندر ھو رھے تھے، جیسے کسی کے جبڑے انھیں نگل رھے ھوں۔ اف کتنے بہت سے آدمی تھے، اور گھوڑے بھی تو تھے، جب دیکھو تب دروازے تک بھاگے چلے آ رھے ھیں، مگر کتا تو ایک بھی نظر نہیں آ رھا تھا۔ مالک نے ''خالہ اماں،، کو اپنے بازو میں تھام کر کوٹ کے دامن میں چھپا لیا جہاں فیودر تیموفیئچ پہلے ھی براجمان تھا۔ اف کتنا اندھیرا اور گھٹن تھی وھاں، مگر تھا گرم گرم۔ دو ھرے ھرے شعلے سے پل بھر کو اسکی طرف لپکے، اصل میں بلے صاحب نے اپنے پڑوسی کے ٹھنڈے ٹھنڈے پنجوں سے گبھرا کر پل بھر کو آنکھیں کھولی تھیں نا! ''خالہ اماں،، نے جھٹ اس کے کان چاٹے، اور ذرا آرام سے بیٹھنے کے چکر میں ادھر ادھر کسمسائی، اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے پنجوں سے بلے کو دبایا، اور مزے میں آکر اپنا سر کوٹ کے دامن سے باھر نکالا، مگر فوراً ھی بگڑ کر غرائی اور جھٹ سر اندر کر لیا۔ اصل میں اسے باھر کچھ نیم اندھیرا سا بڑا کمرہ نظر آیا جس میں بھانت نھانت کے وحشی جانور براجمان تھے۔ کمرے کے دونوں طرف لٹکتے ھوئے پردوں اور چوبی جنگلوں کے پیچھے سے ایک سے ایک خوفناک چہرے باھر جھانک رھے تھے۔ یہ بڑے بڑے کانوں اور سینگوں والے گھوڑوں کی تھوتھنیاں نظر آئیں اور ایک موٹا بھدا سا ھیولا نظر آیا جس کے ناک کی جگہ یہ لمبی سی دم تھی۔ اور اسکے منہ سے ھاتھ ھاتھ بھر لمبی، چبائی ھوئی دو ھڈیاں لٹک رھی تھیں۔

بلے نے ''خالہ اماں،، کے پنجوں کے نیچے سے دھنسی دھنسی آواز نکالی، مگر اسی لمحے کوٹ کے دامن کھلے اور ماسٹر نے حکم دیا ''اچھلو!،، اور فیودر تیموفیئچ اور ''خالہ اماں،، کود کر نیچے آ گئے۔ اب وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں تھے جس کی سرمئی

دیواریں لکڑی کی تھیں، کمرے میں فرنیچر کے نام کی صرف ایک میز تھی، بڑے سے آئینے والی اس میز کے قریب ہی ایک اسٹول تھا اور کونوں میں کچھ گدڑے کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ کمرے میں نہ موم بتیاں تھیں نہ قرینے کا کوئی لیمپ، بلکہ ان کی جگہ دیوار میں لگے ہوئے ایک چھوٹے سے پائپ میں پنکھے کی شکل کی ایک تیز روشنی لٹک رہی تھی۔ فیودر تیموفیئچ نے چاٹ چاٹ کر اپنا فر صاف کیا، جسے کتے کے پنجوں نے خراب کر دیا تھا۔ فر صاف کرتے ہی حضرت اسٹول کے نیچے گھس کر لیٹ گئے۔ ان کا مالک کپڑے اتارنے لگا، چہرے سے اب بھی پریشانی نمایاں تھی، گھبراھٹ میں اب بھی ھاتھ مل رہا تھا۔ ھاں تو اس نے کپڑے اتارے، ٹھیک جس طرح گھر پر اتارتا تھا، لحاف میں گھستے وقت یعنی نیکر بنیان کے علاوہ اور سب کپڑے اتار دئے، اور پھر اسٹول پر بیٹھ گیا اور آئینے میں دیکھ دیکھ کر اپنے ساتھ وہ وہ کرتب شروع کئے کہ اللہ توبہ... سب سے پہلے تو سر پر ایک وگ جمائی۔ بیچ میں مانگ اور ادھر ادھر بالوں کے دو گچھے سے ابھرے ہوئے، مانو سینگ ھوں۔ اور پھر کوئی سفید سی چیز چہرے پر تھوپ لی، اب اس سفید چہرے پر رنگ سے بھویں بنائیں، مونچھیں بنائیں اور دونوں گالوں پر یہ بڑے بڑے لال دھبے لگائے۔ ارے صاحب اس نے تو اس پر بھی بس نہیں کی۔ چہرے اور گردن پر ڈھیروں رنگ تھوپنے کے بعد اس نے ایک عجیب بے تکا سا لباس پہننا شروع کیا، ''خالہ اماں،، نے بھلا کا ھے کو کبھی ایسا عجیب لباس دیکھا ھوگا۔ نہ کسی کے گھر میں نہ گلی کوچوں میں۔ ذرا سوچو تو چھینٹ کی یہ لمبی پتلون۔ اس پر اتنے بڑے بڑے پھول چھپے ہوئے، ارے بھئی ایسے کپڑے تو مزدوروں وغیرہ کے گھر میں پردوں اور فرنیچر کے کام آتے ھیں، اور ذرا دیکھو تو سہی یہ کیسی پتلون تھی کہ مالک کی بغلوں تک پہنچ رہی تھی۔ پتلون کا ایک پائینچہ بھورے رنگ کی چھینٹ کا تھا تو دوسرا چمکدار پیلا تھا۔ خیرجی مالک تو جیسے اس پتلون میں سارا کا سارا چھپ گیا، اوپر سے حضرت نے چھوٹی سی صدری پہنی جس کی پشت پر یہ بڑا سنہرا ستارہ لٹکا تھا اور گریبان میں خوب لیس اور جھالر والا بڑا سا کالر تھا۔ اب اس نے مختلف رنگوں کے موزے چڑھائے اور چمچماتے ھرے رنگ کے جوتے پہنے۔

''خالہ اماں،، کی تو نگاھوں کے سامنے ھر چیز جیسے گھوم گئی، اجی اس کی تو روح اور دل کو بھی جیسے چکر آ گیا۔ سفید چہرے اور بوری کی سی شکل کے اس ھیولے کی خوشبو تو مالک جیسی ھی تھی، اس کی آواز بھی مالک کی جانی بوجھی آواز کی طرح تھی، مگر ''خالہ،، کے ذھن کو باربار جھٹکے سے لگتے اور دل میں دس طرح کے شبہے سر اٹھانے لگتے، اس کا بس چلتا تو اس رنگ برنگے ھیولے سے دور کہیں بھاگ کر خوب خوب بھونکتی۔ یہ نئی جگہ، یہ پنکھے کی شکل کی روشنی، یہ بو، مالک کی یہ کایا پلٹ — اس سب نے دل میں ایک ھلچل سی مچادی تھی، عجیب وسوسے پیدا ھو رہے تھے، ایسا لگ رھا تھا جیسے آج ضرور کسی خوفناک چیز کا سامنا کرنا پڑے گا، مثلاً ناک کی جگہ

دم‌والی بے‌ہنگم تھوتھنی کا۔ اور تو اور دیوار کے اس پار کوئی ناقابل برداشت بینڈ بج رہا تھا، اور تھوڑی تھوڑی دیر پر تو وہ قیامت کا شور مچتا کہ خدا ھی بچائے۔ بس فیودر تیموفیئچ کا سکون دیکھ کر ذرا ڈھارس بندھ رہی تھی۔ وہ تو اسٹول کے نیچے ایسا بےخبر سو رہا تھا جیسے گھبرانے کی کوئی بات ھی نہ ھو، اس نے تو اسٹول ھلانے پر بھی آنکھیں کھول کر نہ دیں۔

دیکھتے دیکھتے سفید واسکٹ اور ڈریس کوٹ میں ملبوس ایک صاحب نے چھوٹے کمرے میں جھانک کر دیکھا اور کہا:

''مس آرابیلا اسٹیج پر پہنچ چکی ھیں، اس کے بعد — آپ۔،،

''خالہ اماں،، کے مالک نے کوئی جواب نہیں دیا، میز کے نیچے سے ایک چھوٹا سا بکس نکالا، اور بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔ مالک کے ھونٹوں سے، اس کے ھاتھوں کی حرکت سے صاف ظاھر تھا کہ وہ پریشان اور گھبرایا ھوا ھے، ''خالہ اماں،، اس کے اکھڑے اکھڑے سانسوں کی آواز صاف سن رھی تھی۔

''جارج صاحب آئیے!،، کسی نے دروازے کے پیچھے سے آواز لگائی۔ مالک اٹھا، تین دفعہ سینے پر صلیب کا نشان بنایا، اور پھر بلے کو اسٹول کے نیچے سے نکال کر بکس میں بٹھا لیا۔

''آؤ خالہ چلیں،، اس نے نرم سی آواز میں کہا۔

''خالہ اماں،، کی خاک سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سب ھو کیا رھا ھے، پھر بھی وہ مالک کے پھیلے ھوئے ھاتھ کی طرف بڑھی، مالک نے اسکے سر کو چوما اور اسے فیودر تیموفیئچ کے پہلو میں بکس میں رکھ لیا۔ اور پھر گھپ اندھیرا چھا گیا... ''خالہ اماں،، بلے سے ٹکرائی، بکس کی دیواروں کو کھرچا، اور اتنی خوفزدہ ھو گئی کہ منہ سے آواز ھی نہ نکلی مگر بکس تھا کہ مسلسل ھل رھا تھا، لرز رھا تھا۔ مانو منہ‌زور لہروں پر تیر رھا ھو...

''یہ لیجئے ھم آگئے!،، مالک نے زور سے آواز لگائی۔ ''ھم آج پھر آ گئے آپ کی خدمت میں!،،

اور ''خالہ اماں،، کو ایسا لگا کہ مالک کی اس گرج‌دار آواز کے بعد بکس کسی سخت چیز سے ٹکرایا، اور لو، لہروں پر تھرکنا بند ھو گیا۔ باھر سے بہت گہری بہت اونچی آواز میں کوئی غرایا، اور کسی نے کسی کے تھپڑ لگایا، اور وہ کوئی — شاید ناک کی جگہ دم‌والا وہ خوفناک ھیولا — غرایا اور ایسی زور سے ھنسا کہ بکس کے تالے تک لرز گئے۔ اور اس بھیانک قہقہے کے جواب میں مالک کی تیز تھرتھراتی ھوئی ھنسی کی آواز ابھری — ھائے گھر پر تو وہ ایسے کبھی نہیں ھنستا تھا۔

''ھا!،، وہ چلایا، خوب زور سے، تاکہ ھیولے کی غراھٹ کا شور اس کی آواز کے نیچے دب جائے۔ ''معزز حاضرین! میں ابھی پہنچا ھوں، سیدھا اسٹیشن سے آ رھا ھوں۔

میری دادی نے آخری منزل پار کر ہی لی۔ میرے لئے بہت کچھ چھوڑا ھے بڑی بی نے! اس بکس میں بڑا بوجھ ھے، ضرور سونا بھرا ہوگا، ھا، ھا! شرطیہ کہتا ہوں دس بیس لاکھ سے کم کا مال نہیں ہوگا۔ آئیے ذرا ہو جائے نظارہ، کھول کر دیکھیں تو سہی...،،

بکس کا تالا کھلنے کی آواز آئی، اور تیز روشنی نے ''خالہ اماں،، کی آنکھوں میں چکاچوند سی مچا دی ۔ وہ تڑپ کر بکس سے کودی اور شور ہنگامے سے بوکھلا کر دیوانہ‌دار مالک کے گرد چکر کاٹنے لگی۔ دوڑتی گئی اور باریک اور تیز آواز میں بھونکتی گئی۔

''ھا!،، مالک نے نعرہ لگایا ''چچا فیودر تیموفیئچ، میری پیاری خالہ، میرے پیارے عزیزو، میرے رفیقو! لعنت ہو تم پر!،،

وہ اوندھے منہ ریت پر گرا اور بلے اور ''خالہ،، کو دبوچ کر انہیں بے تحاشہ چومنا اور گلے لگانا شروع کر دیا۔ وہ ''خالہ اماں،، کو کس کر اپنے بازوؤں میں تھامے ہوئے تھا، اور ''خالہ،، نظریں گھما گھما کر اس نئی دنیا کو دیکھ رہی تھی جس میں تقدیر نے اسے لا پٹکا تھا۔ اس نئے ماحول کی شان و شوکت دیکھ کر خوشی اور حیرت سے پل بھر کو وہ بھونچکی رہ گئی۔ اور پھر تڑپ کر مالک کے بازوؤں سے نکلی اور جذبات کی شدت سے لٹو کی طرح گول گول گھومنے لگی۔ کتنی بڑی تھی یہ نئی دنیا، کتنی روشن تھی، زمین سے چھت تک جدھر نظر پڑتی تھی چہرے ہی چہرے، چہرے ہی چہرے نظر آ رہے تھے۔

''خالہ اماں، خدا کے لئے، بیٹھ جاؤ!،، مالک چلایا۔

اس حکم کا مطلب سمجھتے ہی وہ اچھل کر ایک کرسی پر چڑھی، جم کر بیٹھی اور مالک کی طرف دیکھنے لگی۔ مالک نے غور سے اسے دیکھا، نگاہوں میں ہمیشہ کی طرح گمبھیرتا اور محبت کا رنگ تھا۔ مگر ایک عجیب سی ہنسی نے اس کے چہرے، خاص کر ہونٹوں اور دانتوں کو بڑا بھدا اور بدشکل بنا دیا تھا۔ ہر طرف بکھرے ہوئے ہزاروں چہروں کے سامنے بظاہر بہت خوش اور مگن نظر آنے کی کوشش میں وہ ہنسا، اچھلا، کودا اور کندھے جھٹکنے لگا۔ ''خالہ اماں'' کو اس کی خوشی پر پورا بھروسہ تھا، اور اچانک اسے ایسا لگا کہ وہ ہزاروں آنکھیں اسکے سراپا کو گھور رہی ہیں، اور صاحب اس نے اپنا لومڑی جیسا سر اٹھایا اور خوش ہو ہو کر بھونکنے لگی۔

''تم وہیں بیٹھی رہو خالہ اماں،، مالک نے حکم دیا۔ ''اور میں اور چچا ذرا کمارینسکی ناچ ناچیں گے۔،،

فیودر تیموفیئچ بڑی بےنیازی سے کھڑا اس لمحے کا انتظار کر رہا تھا جب اسے کوئی احمقانہ حرکت کرنے کا حکم دیا جائے گا۔ وہ ناچا، مگر نہایت بےجان انداز سے، حددرجے بےپروائی سے اور گھنے طریقے سے، اس کی ایک ایک حرکت سے، اسکی دم اور کانوں سے، غرض ہر چیز سے صاف ظاہر تھا کہ اسے یہ ھجوم، یہ روشنیاں، یہ مالک اور خود اسکی اپنی ذات، ہر چیز قابل نفرت نظر آتی ھے۔ ہاں تو اپنے کرتب دکھا کر اس نے ایک لمبی چوڑی جمائی لی اور مزے سے بیٹھ لیا۔

''هاں خالہ!،، مالک نے اس سے کہا۔ ''آؤ اب ہم تم کچھ کریں — ہو جائے پہلے ایک گنا اور پھر ناچ، کیوں ٹھیک ہے؟،،

وہ جیب سے پائپ نکال کر بجانے لگا۔ ''خالہ اماں،، کو تو گیت سنگیت سے خدا واسطے کا بیر تھا، اس نے گھبرا گھبرا کر کرسی پر پہلو بدلنا اور رونا جو شروع کیا تو ہر طرف سے واہ واہ اور تالیوں کا شور اٹھا۔ مالک نے جھک کر سلام کیا، اور جب ہر طرف خاموشی چھا گئی تو پھر پائپ بجانا شروع کر دیا... اس نے ایک زور کی تان لگائی ہی تھی کہ اچانک تماشائیوں کی ایک قطار سے — بہت اوپروالی قطار سے — کسی کی بےقرار سی آواز گونجی:

''پاپا!،، بچے کی آواز بہت بلند تھی۔ ''ارے یہ تو کشتانکا ہے!،،

''روپے میں سولہ آنے کشتانکا ہے!،، شراب میں دھت جھنجھناتی سی آواز ابھری۔ ''کشتانکا! میری جان قسم فیدوشکا! سولہ آنے کشتانکا ہے۔ ہئے، کشتانکا، کشتانکا!،،

گیلری میں کسی نے زور سے سیٹی بجائی اور ایک بچے اور ایک بوڑھے نے زور سے پکارا: ''کشتانکا، کشتانکا!،،

''خالہ اماں،، چونکی، اور گڑبڑا کر آواز کی سمت میں دیکھا اور اچانک آنکھوں میں چکاچوند سی ہوئی، ٹھیک جس طرح پہلے جگمگاتی روشنیوں نے آنکھوں کو خیرہ کیا تھا، اب کی دفعہ دو چہروں کی جوت نے خیرہ کیا — ایک چہرہ بالوں بھرا اور شراب کے نشے میں دھت تھا، کھیسیں نکلی ہوئی تھیں، دوسرا چہرہ بھرا بھرا تھا، گلابی گال، آنکھوں میں ڈر کی لکیر۔ ''خالہ اماں،، کو بہت کچھ یاد آیا، وہ گرتی پڑتی کرسی سے اتری، ریت پر تڑپی چھڑپی، پھر تڑپ کر اچھلی، اور خوشی سے چلاتی ہوئی ان دو چہروں کی طرف دوڑ پڑی۔ اور پھر تو وہ شور مچا کہ کان کے پردے پھٹنے لگے۔ کبھی شور، چیخیں، کبھی سیٹیاں، اور کسی بچے کی تلوار کی دھار جیسی تیز آواز ابھری: ''کشتانکا، کشتانکا!،،

''خالہ اماں،، جنگلے پر سے پھلانگتی تماشائیوں کے شانے پر سے کودتی ہوئی دوڑی اور آخر ایک باکس میں جا کودی۔ اگلی صف تک جانے کےلئے اسے ایک اونچی دیوار پھاندنا تھی۔ وہ کودی، مگر چھلانگ لگانے میں ناکام ہوکر دیوار سے نیچے پھسل گئی۔ اور تب ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ ایک ہاتھ سے دوسرے میں، دوسرے سے تیسرے میں، وہ ہاتھ اور چہرے چاٹتی، اوپر سے اوپر اٹھتی چلی گئی، یہاں تک کہ آخر ہاتھوں ہاتھ گیلری میں پہنچ گئی...

آدھ گھنٹہ بھی نہ بیتا تھا کہ کشتانکا گلی میں ان لوگوں کے پیچھے قدم اٹھاتی نظر آئی جن سے گوند اور وارنش کی بو آ رہی تھی۔ لوکا الیکساندریچ کے قدم لڑکھڑا رہے تھے، مگر خدا بھلا کرے بیتے دنوں کے تلخ تجربوں کا قدم بےساختہ نالی سے دور ہی دور اٹھ رہے تھے۔

''میں اپنی ماں کی کوکھ میں آیا ہی گناہ کے نتیجے میں،، وہ بڑبڑایا۔ ''ارے کشتانکا

تو تو نری احمق ھے۔ آدمی کے سامنے تو ایسی حقیر لگتی ھے جیسے کاریگر تکھان کے سامنے کوئی معمولی بڑھئی لگے!..،،

فیدوشکا سر پر باپ کی ٹوپی جمائے، بوڑھے کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ کشتانکا انکی پشت کو تک رہی تھی اور اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ برسوں سے یونہی ان کے ساتھ ساتھ جا رہی ھے اور وہ خوش تھی کہ اس زندگی میں پل بھر کو بھی کبھی کوئی بادھا نہیں پڑا۔

اسے گندی دیواروں‌والا چھوٹا سا کمرہ یاد آیا، بطخا یاد آیا، فیودر تیموفیئچ کا خیال آیا، بڑھیا سے بڑھیا راتب اور روز کی ٹریننگ یاد آئی، اور پھر سرکس کا خیال آیا — مگر کچھ اس طرح جیسے وہ کسی طول طویل، الجھے سے اداس خواب کا حصہ ھوں۔

ایوان ترگینف

بیژن مرغزار

۱۸۵۲ء میں ایک کتاب ''شکاری کی یادداشتیں،، شائع ہوئی جس کے مصنف ایوان ترگینف کو اس وقت تک کم ہی لوگ جانتے تھے۔ یہ کتاب ایسے افسانوں پر مشتمل تھی جن میں روس کے وسطی، کالی مٹی والے علاقے کو، اس کے گاؤں کی زمین پر اگے ہوئے کالے گیہوں کے کھیتوں، گندے ایک ہی طرح کے کسانوں کے گھروں، روشن جنگلوں، پرسکون ندیوں، گاڑیوں کے چلنے کے چوڑے راستوں اور ''عام لوگوں میں کے،، رنگارنگ کرداروں — بنیادی طور پر کسان غلاموں — بے پڑھے لکھے لیکن نمایاں طور پر بااستعداد، دیانتدار روح اور دانش رکھنے والے انسانوں کو، ان کے سارے حسن و امتیاز کے ساتھ قاری کے سامنے پہلی بار پیش کیا گیا تھا۔ اس کتاب سے اس کے مصنف کو شہرت ملی۔ انھیں افسانوں میں ایک افسانہ تھا ''بیژن سرغزار،، جس میں کسانوں کے بچوں سے مصنف کی ہمدردی اور عوامی قصوں کہانیوں اور توہمات کی امتیازی شاعرانہ خصوصیت کی جھلک ملتی ہے۔

''شکاری کی یادداشتیں،، میں اس کے ساتھ ہی بچوں کے پڑھنے کےلئے افسانے ''گھنا آدمی،،، ''لووف،،، ''گانےوالے،، بھی تھے۔ ترگینف کا افسانہ ''موموِ،، بچوں کےلئے تخلیقات میں کلاسیکی درجہ رکھتا ہے۔ یہ ایک کتے کی کہانی ہے جس کا مالک کسان غلام دربان گراسیم مجبور ہے کہ اسے اپنے آقا کے احمقانہ حکم کے مطابق پانی میں ڈبو کر مار ڈالے۔

لیو تالستائی کی فرمائش پر ترگینف نے رسالہ ''بچوں کا آرام،، کےلئے افسانہ ''بٹیر،، لکھا اور فرانسیسی ادیب شارل پیرو کے قصوں کا ترجمہ بھی روسی زبان میں کیا اور انھیں اپنے پیش لفظ کے ساتھ شائع کیا۔

ایوان ترگینف ۱۸۱۸ء میں پیدا ہوئے اور ان کی وفات ۱۸۸۳ء میں ہوئی۔

جولائی کا ایک حسین دن تھا۔ ایسا دن جو صرف اس وقت ممکن ہے جب موسم میں ٹھیراؤ ہو، جب صبح کا آسمان عام طور سے صاف ہوتا ہو اور صبح سویرے دھوپ میں آنکھوں کو خیرہ کرنےوالی تیزی اور چبھن نہ ہو، بلکہ سورج کی سرخی شفق بن کر چھلکتی ہو، جب سورج تپتے ہوئے امسدار سوکھے کے دنوں کے سورج کی طرح، نہ آگ یا تپے ہوئے لوہے کا گولا بن کر ہر کھڑے بیٹھے کو تپاتا نظر آئے، نہ اس میں وہ دھندلاپن اور گہری سرخی ہو، جو آندھی طوفان کی نقیب بنجاتی ہے۔ جب سورج کی کرنیں نرم اور نکھری نکھری سی ہوں، مانو موتی جیسے شفاف اور نازک جھروکے سے خیرمقدم کررہی ہیں، جب اس کی شعاعیں آپ کو تازہ دم کردیں، جب سورج مگن دھرتی کی گود سے اٹھتی ہوئی ہلکی ہلکی بھاپ میں نہایا ہوا سا لگے، کبھی اپنی بکھیری ہوئی سرخ دھند میں ڈوبے اور کبھی اس کے جھروکوں سے جھانکتا نظر آئے، جب آسمان پر کہیں بھی ایسے بادل نظر نہ آئیں جو آنےوالے خراب موسم کا پیش خیمہ بن جاتے ہیں، سب کہیں دور، بکھرے بکھرے بادلوں کے باریک سرے سانپ کی طرح لہر لہر چمک کر برائے نام سی پھوار برسائیں اور ان کی چمک بھٹی میں تپ کر نکھری ہوئی چاندی کو شرمائے، جب دیکھتے دیکھتے سورج کی نچلی کرنیں ایک دفعہ پھر ابل پڑیں اور صبح کی خوش اور مگن روشنی جیسے ہوا کے دوش پر آئے اور چاروں طرف بکھر جائے۔ جب دوپہر ہوتے ہوتے آسمان کی بلندی پر سنہرے روپہلے، نازک کناروںوالے بہت سے گول گول بادل کچھ اس طرح گھر آئیں، جیسے کسی چھلکتے ہوئے پاٹدار دریا میں بہت سے چھوٹے بڑے جزیرے ابھرے ہوئے ہوں۔ جب ان بادلوں کے حریری بازوؤں سے نیل گگن کی نیلاہٹ بکھرتی رہے، اور وہ بالکل ساکت و خاموش رہیں، لیکن اور زیادہ بلندی پر، دور افق کے قریب بادل تیزی سے دوڑتے ہوئے اس طرح امڈیں کہ آسمان کی نیلاہٹیں نظر سے بالکل اوجھل ہوجائیں۔ مگر یہ بادل خود آسمان کی طرح نیلے ہوں۔ اور پھر یہ دل کے دل بادل گرمی اور روشنی کا گہوارہ بنجائیں۔ آسمان کا رنگ کچھ ہلکا نیلا، کچھ سرخی مائل سا ہو جائے اور دن دن بھر افق تا افق اس کے رنگ میں ذرہ بھر تبدیلی نہ آئے۔ نہ کہیں اندھیرا بڑھے، نہ گھٹا

گہری ہو ۔ البتہ کبھی کبھی اوپر سے نیچے کی طرف نیلی نیلی دھاریاں سی بنتی بگڑتی نظر آئیں ۔ یعنی برائےنام بوندا باندی ہوجائے ۔ جب شام ہوتے بادل چھٹ جائیں اور ان کے آخری چند ٹکڑے — کالے مبہم اور دھواں دھواں سے ٹکڑے — سرخی کے لبادہ اوڑھے، ڈوبتے سورج کے عین مقابل بکھر جائیں، ٹھیک اس جگہ جہاں سورج اسی سکون سے ابھرا تھا، جس سکون سے آسمان پر چڑھتا چلا گیا تھا ۔ اور یہ اودی سی روشنی کچھ دیر تک دھندلکے میں لپٹتی ہوئی زمین پر چھائی رہے ۔ پھر شام کا ستارہ، کسی نتھری ہوئی شمع کی طرح نزاکت سے، آھستہ آھستہ ٹمٹماتا ہوا آسمان پر چمکنے لگے ۔ ایسے دنوں میں ہر رنگ میں نرمی و نزاکت پیدا ہوجاتی ھے، ہر رنگ نکھرا نکھرا لگتا ھے، مگر زیادہ شوخ نہیں ۔ یہ وہ دن ھیں جب ہر شے پر جذبات‌پرور نرمی سی چھائی رہتی ھے ۔ ایسے دنوں میں گرمی اکثر بڑھ جاتی ھے ۔ کہیں کہیں تو میدانوں کی ڈھلانوں سے بھاپ سی اٹھتی نظر آتی ھے ۔ لیکن زمین سے ذرا سا اوپر اٹھتی ہوئی ہواؤں کی لہریں گرمی کی اس یلغار کو پیچھے دھکیلتی ھیں، اس کی شدت کو کچھ کم کرتی ھیں ۔ اور گرم ہواؤں کے یہ بگولے جو موسم میں ٹھیراؤ پیدا ہونے کا ثبوت ھیں، اونچے ستونوں کی شکل میں کھیتوں اور پرتی زمینوں پر بنی پگڈنڈیوں پر تھرکتے نظر آتے ھیں ۔ نتھری ہوئی خشک ہوا میں جڑی بوٹیوں کی تلخ خوشبو، موٹے اناج کی باس اور کٹی ہوئی رائی کی بو بسی رہتی ھے ۔ آدھی رات گئے تک ہوا میں نمی محسوس نہیں ہوتی ۔ کھیت کھلیان میں کام کرنےوالے تو فصل کی کٹائی کے لئے ایسے موسم کی آس لگائے بیٹھے رہتے ھیں...

ایسا ھی ایک دن تھا جب میں تولا صوبے کے چیرنسکی ضلع میں پہنچ گیا تھا ۔ یہاں مجھے بہت شکار ملا : بہت سے پرندے مارے ۔ میرا شکاری بیگ یوں بھرا ہوا تھا کہ شانہ ٹوٹا جارہا تھا ۔ اور سینے پر بوجھ محسوس ہورہا تھا ۔ اور جب آخرکار میں نے گھر جانے کا ارادہ کیا تو شام کی سرخی پھیل رہی تھی ۔ اور اگرچہ ہوا ابھی تک ہلکی تھی، لیکن ڈوبتے سورج کی کرنیں اب اسے روشنی دینے سے محروم تھیں ۔ اس میں ایک قسم کا بھاری‌پن پیدا ہو چلا تھا ۔ اور ٹھنڈے سائے پھیل رہے تھے ۔ میں نے تیزی سے جھاڑیوں سے بھرے ہوئے خطے کو پار کیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ٹیلے پر چڑھا تو یقین تھا کہ سامنے جانا بوجھا میدان پھیلا نظر آئےگا — دائیں ھاتھ پر شاہ بلوط کے جنگل اور دوسری طرف چھوٹا سا سفید گرجا ۔ مگر بدقسمتی سے وھاں تو یہ سب کچھ تھا ھی نہیں ۔ وھاں تو ماحول قطعی اجنبی تھا ۔ قدموں تلے ایک تنگ سا میدان تھا اور ٹھیک نظر کے سامنے بیدمجنوں کے جھنڈ ایک موٹی دیوار کی شکل میں راستہ روکے کھڑے تھے ۔ میں گھبرا کر ٹھٹھک گیا، چاروں طرف نظر دوڑائی اور سوچا : ''ارے میں تو نجانے کہاں پہنچ گیا ۔ شاید ذرا زیادہ ھی دائیں طرف مڑگیا ہوں،، ۔ میں اپنی غلطی پر حیران ہوتا ہوا مڑا اور تیزی سے پہاڑی سے اترا تو بڑی بدبودار اور جمی ہوئی سیلی سی دھند میں لپٹ گیا ۔ جیسے کسی تہہ‌خانے میں پہنچ گیا ہوں ۔ گھاٹی کی تہہ میں اونچی اور گھنی گھاس سفیدسی نمی

میں ڈوبی اس طرح کھڑی تھی، جیسے ہوا میں سبزپوش اڑ رہا ہو۔ اف! گھاس کے اس تختے کو پار کرنا آسان کام نہ تھا — ناممکن تھا۔ میں بائیں طرف کو مڑا، تیزی سے گھاس کے جھنڈ سے نکلا اور دوسری طرف پہنچ کر بید مجنوں کے جھنڈ کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ آسمان پر اڑتے ہوئے ان گنت چمگادڑ عجیب پراسرار انداز میں چکر کاٹتے ہوئے، نیند میں ڈوبی ہوئی، بید مجنوں کی پھننگوں پر اتر رہے تھے۔ پرندوں کی اڑان سے بےنیاز ایک باز تیزی سے ہوا کو کاٹتا ہوا اپنے گھونسلے کی طرف اڑ گیا۔ جیسے اسے بہت دیر ہوگئی ہو۔ ''بس اس نکڑ تک پہنچنے کی دیر ہے،، میں نے سوچا۔ ''وہاں ضرور قریب کوئی راستہ ہوگا۔ ایک ورست کا چکر تو یقیناً پڑ ہی گیا ہوگا مجھے...،،

خدا خدا کرکے میں جنگل کے سرے تک پہنچ ہی گیا۔ مگر وہاں بھی کہیں کوئی پگڈنڈی، کوئی سڑک نظر نہ آئی۔ میرے سامنے نیچی جھاڑیوں کا میدان پھیلا ہوا تھا۔ تعجب ہے انھیں ابتک کاٹا نہیں گیا تھا۔ ان کے بعد دور دور تک بنجر میدان نظر آرہا تھا۔ میرے قدم رک گئے۔ ''اف کیا مصیبت ہے۔ کہاں ہوں آخر، میں؟،، اور میں نے دل ہی دل میں اندازہ لگانا شروع کیا کہ دن میں کس کس راستے سے، کس کس سمت میں گیا تھا۔ ''اوهو، تو یہ پراخین جھاڑیاں ہیں!،، آخر میں نے سوچا اور خوشی سے اچھل پڑا۔ ''بالکل صحیح، اور یہ ہوگا سندیئف جنگل۔ مگر آخر میں یہاں پہنچا کیسے؟ اتنی دور نکل آیا؟ تعجب ہے... تو اب پھر دائیں طرف کو چلنا چاہئے...،،

میں جھاڑیوں سے گزرتا ہوا دائیں طرف کو چل پڑا۔ رات طوفانی بادل کی طرح بڑھ رہی تھی۔ اور شام کی ہواؤں کے ساتھ، اوپر نیچے، ہر سمت سے اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ اچانک میں جھاڑ جھنکاڑ سے بھری ہوئی ایک اجاڑ پگڈنڈی پر پہنچ گیا۔ میں قدم بڑھاکر فوراً اس پر ہولیا۔ اور غور سے سامنے دیکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ چاروں طرف تیزی سے اندھیرا پھیل رہا تھا۔ سناٹا ہی سناٹا تھا۔ البتہ کبھی کبھی کوئی بٹیر زور سے چیخ اٹھتا یا رات کا مسافر کوئی پرندہ، کوئی آواز نکالے بغیر، نرم نرم پروں سے ہوا کو کاٹتا اور نیچے نیچے اڑتا ہوا اچانک مجھ سے ٹکراتا اور ڈرکر جلدی سے دوسری طرف کو اڑ جاتا۔ میں جھاڑیوں میں راہ بناتا ہوا آخر میدان کے سرے تک پہنچ گیا۔ اب تھوڑے فاصلے کی چیزیں بھی دھندلا گئی تھیں۔ چاروں طرف کہرے میں لپٹا ہوا تاریک میدان تھا۔ اور اس کے اوپر لمحہ لمحہ بڑھتے ہوئے دل کے دل بادل اندھیرے کو اور گہرا کررہے تھے۔ اس سرد اور دبیز ماحول میں میرے قدموں کی چاپ دھنسی دھنسی سی محسوس ہورہی تھی۔ سلگجے آسمان پر اب پھر نیلاہٹ پھیل رہی تھی۔ مگر یہ نیلاہٹ رات کی تھی اور اس پر ستارے ٹمٹما رہے تھے۔

جسے میں دور سے جنگل سمجھا تھا، وہ دراصل تاریک اور گول پہاڑی نکلی۔ ''خدایا یہ کہاں پہنچ گیا میں؟،، میں نے بہ‌آواز بلند کہا۔ اور تیسری دفعہ رک کر سوالیہ نگاہ سے اپنی زرد چتیوں‌والی انگریزی نسل کی کتیا دیانکا کو دیکھا کہ وہ تمام جانوروں

میں سب سے زیادہ عقل‌مند جانور ہے۔ مگر اپنی تمام‌تر عقل کے باوجود دیانکا بھی اس علاقے کے جغرافیے کے بارے میں مجھے کوئی معقول جواب نہ دے سکی، نہایت وفاداری سے دم ہلاکر اور تھکی ہوئی آنکھیں جھپکا کر رہ گئی۔ کتیا کے سامنے مجھے اپنی حالت پر شرمندگی کا احساس ہوا اور میں نے پریشانی میں قدم تیز کردئیے، جیسے اچانک سمجھ میں آگیا ہو کہ کدھر جانا ہے۔ پہاڑی کا چکر کاٹ کر میں ایک وادی میں پہنچ گیا۔ یہ وادی زیادہ گہری نہیں تھی اور اس میں کھیتی کیاری کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔ اچانک میرے پورے وجود پر کچھ عجیب سے جذبات طاری ہوگئے۔

وادی کیا تھی، پھیلے ہوئے کڑاہ کی طرح تھی۔ اس کی تہہ میں بڑے بڑے کئی سفید پتھر نہایت قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔ جیسے کسی خفیہ ملاقات کےلئے اکٹھا ہوئے ہوں۔ وادی اس قدر گونگی بہری تھی، اس پر جھکا ہوا آسمان اس قدر اداس اور بےرنگ تھا کہ میرا دل بھر آیا۔ پتھروں کے درمیان کوئی جانور کمزور اور دکھی سی آواز میں منمنا رہا تھا۔ میں پھر تیزی سے پہاڑ پر چڑھ گیا۔ ابھی تک امید تھی کہ گھر لوٹنے کا راستہ ڈھونڈ نکالوں‌گا۔ مگر اب تو مجھے یقین ہوچلا تھا کہ میں قطعی طور پر راہ سے بھٹک گیا ہوں۔ اب تو جگہ کو پہچاننے کی کوشش فضول تھی۔ میں اندھادھند آگے بڑھ رہا تھا، دور ابھرے ہوئے ستاروں کی طرف۔ کوئی آدھے گھنٹے اسی طرح چلتا رہا۔ پاؤں سن سن بھر کے ہو رہے تھے۔ ایسے سنسان اور غیرآباد علاقے میں زندگی بھر بھلا کبھی کاہے کو گیا ہوں‌گا میں! نہ کہیں آگ جلتی نظر آرہی تھی نہ کوئی آواز تھی۔ پہاڑی کے بعد پہاڑی ابھری ہوئی تھی۔ اور پھر میدان، اور میدان۔ اور جھاڑیوں کا یہ عالم تھا جیسے اچانک زمین کا سینہ چیر کر میری ناک کے نیچے ابھر آئی ہوں۔ میں چلتا رہا، چلتا رہا، اور آخر سوچا کہ یہیں کہیں پڑکر رات گزار لوں، کہ اچانک ایک خوفناک گھاٹی کے دہانے پر پہنچ گیا۔ میں نے ایک جھٹکے سے آگے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکا تو مجھے رات کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں، بمشکل تمام، قدموں تلے پھیلے ہوئے میدان کا دھندلاسا احساس ہوا۔ میدان کو پاٹ‌دار دریا نے اپنے بڑے سے نیم دائرے میں لے رکھا تھا۔ دریا کا یہ وسیع نیم دائرہ ٹھیک میرے قدموں کے قریب شروع ہوا تھا۔ اس کے پانی میں فولاد کی سی چمک تھی جو کہیں زیادہ، کہیں کم پانی کے بہاؤ کا ساتھ دے رہی تھی۔ میں جس پہاڑی پر کھڑا تھا، اس کے کھڑے کگارے عین میرے قدموں تلے تھے۔ اس کے دیوہیکل خطوط کی سیاہی نیلی، حریری فضا میں الگ سے نظر آرہی تھی۔ اس مقام پر دریا بالکل شانت تھا اور بےحس و حرکت شیشے جیسا لگ رہا تھا۔ اس کے قریب ہی میرے عین نیچے پہاڑی کی ڈھلان کے پاس اچانک دو لال لال الاؤ جلتے نظر آئے جن سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ الاؤ کے گرد بہت سے لوگ جمع تھے۔ سائے سے ہل رہے تھے۔ کبھی کبھی تو گھونگھریالے بالوں بھرے چھوٹے سروں کے کچھ حصے تک نظر آجاتے تھے...

اب میری سمجھ میں آیا کہ میں ہوں کہاں۔ میرے سامنے پھیلے ہوئے سرغزار کو

مقامی باشندے بیژن مرغزار کہتے ہیں۔ مگر یہاں سے گھر واپس جانے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا، وہ بھی رات کی تاریکی میں۔ یوں بھی تھکن سے ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ میں بھی الاؤ کے پاس پہنچ کر ان لوگوں کے ساتھ رات گزاروں اور صبح ہونے کا انتظار کروں۔ لوگ یقیناً مویشی بیچنے والے تاجر ہوں گے۔ پہاڑی سے اترنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ لیکن سہارے کےلئے تھاسی ہوئی آخری ڈال ابھی ہاتھ سے چھوٹی بھی نہ تھی کہ اچانک سفید رنگ کے دو بھیانک جھبرے کتے خونخوار انداز میں بھونکتے ہوئے مجھ پر جھپٹے۔ فوراً ہی الاؤ کے قریب کئی بچوں کی نقرئی گھنٹیوں جیسی سریلی آوازیں ابھریں اور دو تین لڑکے تیزی سے زمین سے اٹھتے نظر آئے۔ میں نے بھی ان کی سوالیہ للکار کے جواب میں زور سے آواز لگائی۔ بچے فوراً میری مدد کو لپکے اور کتوں کو ڈانٹ کر خاموش کیا جو میری کتیا دیانکا کو دیکھ کر تو اور بھی چراغ پا ہورہے تھے۔ اور تب میں بچوں کے پاس پہنچا...

الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کو دور سے دیکھ کر انھیں مویشی بیچنے والے تاجر سمجھنے میں میں نے غلطی کی تھی۔ یہ تو پڑوس والے گاؤں کے کسانوں کے بچے تھے جو گھوڑوں کے غول کو گھاس چرانے یہاں لائے تھے۔ گرمیوں میں ہمارے ہاں گھوڑوں کو رات کے وقت چرانے کے لئے گھاس کے میدانوں میں لیجانے کا رواج عام ہے۔ دن میں تو مکھیاں اور گئو مکھیاں بچاروں کو پل بھر سکون کا سانس نہ لینے دیں۔ رات کو گھوڑوں کو مرغزار میں ہنکا دیتے ہیں اور صبح ہوتے غول واپس لے جاتے ہیں، کسان بچوں کےلئے تو یہ موقعہ عید تہوار سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ سروں پر ٹوپی ندارد، بدن پر پھٹے پرانے نیم گرم کوٹ پہنے مزے میں پھرتیلے ٹٹوؤں پر بیٹھے، انھیں دلکی دوڑا رہے ہیں، زور زور سے ہاتھ چلا چلا کر باتیں کررہے ہیں، چیخ چلا رہے ہیں اور فضا میں قہقہے بکھر رہے ہیں۔ کچے راستوں پر باریک گرد کے بھورے بادل سے اڑ رہے ہیں۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کا شور دور سے دور ہوتا چلا جارہا ہے اور گھوڑے کان کھڑے کئے سرپٹ دوڑ رہے ہیں۔ قافلے کے آگے ہمیشہ کوئی نہ کوئی کمیت گھوڑا دوڑتا نظر آتا۔ جھبرا ایسا کہ ایال کی گرہیں کھولے نہ کھل پائیں۔

میں نے بچوں کو بتایا کہ راہ سے بھٹک گیا ہوں اور ان کے قریب بیٹھ گیا۔ انھوں نے پوچھا کہ میں کہاں سے آیا ہوں اور پھر خاموشی سے ذراسا ہٹ کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں پتوں کانٹوں سے صاف، چکنی جھاڑیوں کے نیچے لیٹ کر چاروں طرف نظر ڈالنے لگا۔ کیسا حسین منظر تھا۔ الاؤ کے قریب لال رنگ کے گول سائے سے کچھ یوں تھرتھرا رہے تھے جیسے ابھی جل بجھیں گے۔ اندھیرے کی چادر تلے یہ سرخ دھبے خوب اجاگر تھے۔ ہر تھوڑی دیر بعد شعلے سے لپکتے اور اس دائرے کے نقوش اجاگر ہوجاتے۔ روشنی کی پتلی پتلی زبانیں سی ان ننگی جھاڑیوں پر لپکتیں اور پلک جھپکتے میں غائب ہو جاتیں۔ گہرے لمبے سائے پل بھر کو تھرکتے اور الاؤ کے

قریب تک دوڑتے چلے آتے ۔ روشنی اور تاریکی کی جنگ جاری تھی ۔ کبھی کبھی جب شعلے کمزور پڑ جاتے اور روشنی کا دائرہ مختصر رہ جاتا تو بکھرے بکھرے اندھیرے سے اچانک کسی گھوڑے کا سر ابھرتا ۔ کبھی سفید براق، کبھی بھورا ۔ وہ احمقانہ تجسس سے ہمیں تکتا، انہماک سے لمبی لمبی گھاس پر منہ مارتا اور ایک دفعہ پھر تاریکی میں ڈوب جاتا ۔ البتہ جگالی کرنے اور ہنہنانے کی آوازیں آتی رہتیں ۔ اگر آپ روشنی میں ہوں تو اندھیرے کی دنیا ذرا مشکل ھی سے نظر آتی ھے ۔ یہی وجہ تھی کہ خاصی نزدیک کی چیزیں مبہم سے دھندلکے میں لپٹی ہوئی لگ رھی تھیں ۔ لیکن اور زیادہ فاصلے پر یعنی افق کے قریب جنگلوں اور پہاڑیوں کے لمبے لمبے دھبوں جیسے خطوط دھندلے سے نظر آرھے تھے ۔ تاریک مگر صاف آسمان اپنی تمام‌تر بلندی، تمام‌تر اسرار کے ساتھ اس منظر کے اوپر جھکا ہوا تھا ۔ موسم گرما کی روسی شاموں کی مخصوص تازہ خوشبو جسم و جان کو معطر کررھی تھی ۔ ہر سانس کے ساتھ سینے میں میٹھی میٹھی سی کسک پیدا کررھی تھی ۔ چاروں طرف سناٹا تھا ۔ نہ کوئی آواز نہ شور ۔ البتہ کبھی کبھی قریب دریا میں بڑی مچھلیاں ایک دوسرے کا پیچھا کرتے ہوئے ہلکے سے چھپا چھپ کرتیں یا دریا کے کسی موڑ میں دریائی جھاڑیاں سرسرانے لگتیں ۔ البتہ ہمارے الاؤ خاموشی سے سلگ رہے تھے ۔

بچے الاؤ کے گرد بیٹھے تھے ۔ وہ دونوں کتے بھی جو کچھ دیر پہلے ہمیں پھاڑ کھانے کو بےقرار تھے وھیں پڑے تھے ۔ وہ خاصی دیر تک میرے وجود کو تسلیم نہ کرسکے ۔ ذرا ذرا دیر بعد نیند میں ڈوبی ہوئی ادھ کھلی آنکھوں سے آگ کو دیکھتے اور اپنی اھمیت کے احساس اور شان کے ساتھ غرا اٹھتے ۔ پہلے غراتے پھر آھستہ سے کِکیانے لگتے ۔ جیسے اپنی دلی تمنا پوری نہ کرسکنے پر دکھی ہوں ۔ وہ سب لڑکے کل ملا کر پانچ تھے ۔ فیدیا، پاولوشا، ایلوشا، کوستیا اور وانیا (بچوں کی آپس کی گپ شپ سنتے سنتے مجھے ان کے نام معلوم ہوگئے تھے چنانچہ آپ سے ان کا بھی تعارف کرا رہا ہوں) ۔

پہلا بچہ عمر میں سب سے بڑا تھا ۔ یہی کوئی چودہ ایک سال کا ہوگا ۔ بچہ بڑا سڈول، بہت قبول صورت تھا ۔ ذرا زیادہ ھی نازک اور خوبصورت ناک نقشہ، گھونگھریالے سنہرے بال ۔ سنہری آنکھیں اور چہرے پر مستقل مسکراھٹ کی کیفیت ۔ اس کی مسکراھٹ میں کچھ خوشی اور شوخی کا رنگ تھا تو کچھ کھوئی کھوئی سی کیفیت تھی ۔ اس کے سراپا سے صاف ظاھر تھا کہ کسی بڑے گھر کا چشم و چراغ ھے ۔ اور یہاں سرغزار میں ضرورتاً نہیں آیا، بلکہ شوقیہ آیا ھے ۔ اس کے جسم پر پیلی گوٹ والا، دھاری‌دار سوتی قمیص تھا ۔ نئی بنڈی اس کے تنگ شانوں سے جیسے گری‌سی جا رھی تھی ۔ کمر پر کسی ہوئی نیلی بیلٹ سے سینگ کا چھوٹا سا کنگھا لٹک رہا تھا ۔ اس کے ٹخنوں تک اونچے بوٹ بالکل صحیح سائز کے تھے ۔ جوتے اس کے اپنے تھے ۔ باپ کے ہرگز نہیں تھے ۔ دوسرے بچے یعنی پاولوشا کے کالے بال الجھے الجھے سے تھے ۔ آنکھیں سرمئی تھیں، رخساروں کی ھڈیاں ابھری ہوئی تھیں، رنگ زرد تھا اور چہرہ جھائیوں سے ڈھکا ہوا ۔ اس کا دھانہ بہت

بڑا مگر نہایت ڈھلا ڈھلایا تھا۔ اس کا سر بھی بہت بڑا تھا، جیسے شراب کی مٹکی۔ اور ڈیل بھدا اور بےتکا تھا۔ بچے میں کوئی بات بھی تو قابل ذکر نہ تھی۔ اس کے باوجود وہ مجھے بہت اچھا لگا۔ بہت ذہین اور کھلی طبیعت کا لگ رہا تھا۔ اور اس کی آواز میں بلا کی طاقت تھی۔ بچہ اپنے کپڑوں جوتوں پر کسی طرح بھی ناز نہیں کرسکتا تھا۔ بدن پر ایک سلگجا سا بنیان تھا اور پتلون پر (گھٹنوں کے قریب) پیوند لگے ہوئے تھے۔ تیسرے بچے یعنی ایلوشا کے چہرے مہرے میں بھی کوئی خاص بات نہیں تھی۔ طوطے جیسی ناک، لمبا کھنچا ہوا چہرہ اور کمزور نظر۔ چہرے سے بےوقوفی اور احمقانہ بےقراری عیاں تھی۔ اس کے بھنچے ہوئے ہونٹوں میں ذرا بھی جنبش نہیں تھی۔ اس کی جٹی بھویں تنی ہوئی تھیں۔ بچہ یوں بیٹھا تھا جیسے شعلوں کی وجہ سے آنکھیں بند کئے بیٹھا ہو۔ سفیدی مائل زرد بالوں کے الجھے الجھے سخت گچھے، نمدے کے بھدے ہیٹ سے جھانک رہے تھے۔ اور وہ بار بار دونوں ہاتھوں سے ہیٹ پکڑکر کانوں پر کھینچ رہا تھا۔ اس کے نئے چھال کے جوتے تھے اور کمر کے گرد موٹی ڈوری کے تین بلوں نے اس کے چھوٹے سے کالے رنگ کے فراک کو کس رکھا تھا۔ ایلوشا اور پاولوشا دونوں کی عمر لگ بھگ بارہ سال ہوگی۔ چوتھا بچہ کوستیا کوئی دس ایک سال کا ہوگا۔ اس کی خاموشی اور اداسی نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس کا چہرہ چھوٹا، جھائیوں بھرا، دبلا اور نوکیلا تھا۔ اور ٹھوڑی گلہری کی طرح کٹی ہوئی سی تھی۔ اور ہونٹ تو جیسے نظرھی نہیں آتے تھے۔ اس کی آنکھوں کو دیکھ کر عجیب‌سا احساس ہوتا تھا۔ ان بڑی بڑی کالی آنکھوں میں پگھلی پگھلی سی کیفیت اور عجیب انوکھی چمک تھی۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہوں، کوئی ایسی بات جسے ادا کرنے سے زبان قاصر ہو۔ کم سے کم اس کے پاس اس بات کے اظہار کےلئے الفاظ نہیں تھے۔ اس کا قد چھوٹا تھا، جسم کمزور اور کپڑے پھٹے پرانے۔ آخری بچے وانیا پر تو کچھ دیر تک نظر ھی نہیں پڑی۔ وہ ایک موٹی سی بوری اوڑھے زمین پر لیٹا تھا۔ کبھی کبھار ھی گھونگھریالے سنہرے بالوں والے سر کو بوری سے باھر نکالتا تھا۔ اس بچے کی عمر بہت سے بہت سات سال ہوگی۔

مختصر یہ کہ میں سب سے ذرا سا ہٹ‌کر جھاڑیوں کے نیچے لیٹا، بچوں کا جائزہ لےرہا تھا۔ الاؤ پر لٹکتی ہوئی ایک چھوٹی سی ھنڈیا میں آلو ابل رہے تھے۔ آلوؤں کی دیکھ بھال پاولوشا کے ذمے تھی۔ وہ بار بار گھٹنوں کے بل کھڑا ہوکر لکڑی کی چھپٹی سے پتیلی میں آلوؤں کو ٹٹولنے لگتا تھا۔ فیدیا ذرا ڈھلواں سی زمین پر اپنی بنڈی کو بچھائے ہوئے کہنیوں کے بل لیٹا تھا۔ ایلوشا مستقل اسی طرح آنکھیں چندھیائے کوستیا کے برابر بیٹھا ہوا تھا۔ کوستیا سر جھکائے ہوئے کہیں دور کچھ دیکھتے دیکھتے کھوسا گیا۔ وانیا بورے کے نیچے اسی طرح بےحس و حرکت پڑا تھا۔ میں سوتا بن گیا۔ رفتہ رفتہ بچے پھر آپس میں باتیں کرنے لگے۔

شروع میں تو ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں، کل کے کام دھام کے تذکرے ہوئے،

گھوڑوں کا ذکر ہوا۔ اور پھر اچانک فیدیا ایلوشا کی طرف مڑا اور میرے آنے کی وجہ سے جو بات ادھوری رہ گئی تھی، اس کی طرف پلٹتے ہوئے بولا:

''تو تم کہتے ہو تم نے گھریلو جن کو دیکھا ہے؟''

''نہیں دیکھا تو نہیں میں نے، ارے وہ کوئی نظر تھوڑی آتا ''ایلوشا نے لرزتی ہوئی کمزور آواز میں کہا۔ اس آواز میں اور اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ میں کتنی مناسبت تھی۔ ''مگر سنا ضرور ہے... اور کوئی میں نے اکیلے ہی تھوڑی سنا!''

''اور رہتا کہاں ہے وہ؟'' پاولوشا نے پوچھا۔

''کاغذ کی مل میں۔ ٹب ہاؤس کے قریب، ارے وہیں جہاں مل کے پہیے کے قریب دیوار کے ساتھ ساتھ ٹب رکھے ہوئے ہیں۔''

''تو فیکٹری جاتے ہو کیا تم؟''

''ہاں، ہاں جاتے کیوں نہیں۔ میں، میرا بھائی اودیوشکا، سب کاغذ چمکانے کا کام کرتے ہیں۔''

''واہ یار، تو فیکٹری مزدور ہے تو!..''

''اچھا۔ مگر یہ تو بتاؤ تم نے جن کو سنا کیسے؟'' فیدیا نے پوچھا۔

''بس ایسے ہی۔ میں تھا، میرا بھائی اودیوشکا، فیودر میخیئفسکی تھا، اور جی، ایوان بھینگا تھا۔ دوسرا ایوان بھی تھا، وہی لال پہاڑی والا، اور ایواشکا سوخوروکوف بھی تو تھا، اور بھی بہت سے لڑکے تھے۔ سب ملاکے ہم کوئی دس تھے۔ اس دن کی ڈیوٹی والے سبھی تھے۔ پھر کچھ ایسا ہوا کہ اس رات وہیں فیکٹری ہی میں رہنا پڑا۔ محض اتفاق سے تھوڑی ایسا ہوا۔ وہ تو یوں ہوا کہ فورمین نظاروف نے حکم لگا دیا۔ بولا: 'ابے لونڈوں، اب اس وقت کیا جاؤگے تم لوگ۔ کل کام بہت ہے۔ بس اب گھر نہ جاؤ!'، بس جی ہم رک گئے وہیں۔ سب اکٹھے لیٹ رہے۔ لیٹے ہی تھے کہ اچانک اودیوشکا بولا: 'کیوں یارو، بھوت آ گیا تب؟'، اجی ابھی اودیوشکا کے منہ کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ اچانک ٹھیک ہمارے سروں کے اوپر کسی کے قدموں کی آواز آئی۔ ہم نیچے لیٹے تھے اور وہ ٹھیک ہمارے اوپر چل رہا تھا... مل کے پہیے پر۔ ہم سنتے رہے، وہ چلتا رہا۔ اور اس کے تلے لکڑی کے تختے مڑتے اور چرچراتے رہے، اور پھر وہ ٹھیک ہمارے سروں پر پہنچ گیا۔ اور اچانک پہیے پر پانی جیسے چیخ اٹھا۔ چیختا رہا، چنگھاڑتا رہا، پہیے سے ٹکراتا رہا، اسے گھماتا رہا۔ مگر یار قسم سے فورمین نے تو جانے سے پہلے باندھ کے تختے گراکر پانی کے نکاس کی ساری راہیں بند کردی تھیں۔ ہم دم سادھے پڑے ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ تختے آخر کس نے اٹھائے کہ پانی ابل پڑا۔ خیر جی پہیہ گھومتا رہا، گھومتا رہا اور آخر خود ہی رک گیا۔ اور بھئی وہ ایک دفعہ پھر اوپر دروازے تک آیا اور لوجی زینے سے اترنے لگا۔ اور اتر بھی تو کیسے رہا تھا۔ جیسے اسے کوئی جلدی نہ ہو۔ سیڑھیاں اس کے قدموں تلے جیسے کراہ رہی تھیں۔ پھر وہ ہمارے دروازے کے

برابر پہنچ کر رک گیا، کھڑا ہے، کھڑا ہے ۔ جیسے کسی بات کا منتظر ہو ۔ اور پھر اچانک ہی دھڑ سے دروازہ کھل گیا ۔ ہمارا تو بھیا دم ہی نکل گیا ۔ گھبرا کر دیکھا — مگر وہاں کچھ ہو تو نظر آئے! اور تب ایک دم سے، ایک ناند کے برابر میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک جالی لرزی اور ہوا میں اٹھ گئی ۔ ایک دفعہ ڈبکی‌سی لگائی اور چل پڑی ۔ چل رہی ہے، چل رہی ہے ۔ مانو ہوا میں تیر رہی ہو ۔ مانو کوئی اسے جھونٹے دے رہا ہو ۔ اور بھیا دیکھتے دیکھتے پھر جگہ پر پہنچ گئی ۔ پھر دوسری ناند کے پاس ایک کانٹا کیل سے الگ ہوا اور پھر کیل پر جا لٹکا ۔ اور جی پھر جیسے کوئی دروازے کی طرف بڑھا ۔ اور اچانک اس نے کھانسنا شروع کردیا ۔ کھانس رہا ہے، بھیڑ کی طرح سمیا رہا ہے، باپ رے باپ کیسی زور کی آواز تھی اس کی! ہم تو سب ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے پڑے تھے، مانو کوئی ڈھیر پڑا ہو ۔ میا موری کیا حال تھا ڈر سے سب کا!،،

”بھلا دیکھو تو سہی!،، پاولوشا بولا ۔ ”کھانسا کیوں تھا وہ بھلا!،،

”کیا معلوم ۔ سیلن بھی تو بلا کی تھی وہاں ۔ شاید اسی لئے کھانسا ہو ۔،،

سب سوچ میں ڈوبے ہوئے خاموش تھے ۔

”ارے یار،، فیدیا نے کہا ”آلو ابلے کہ نہیں؟،،

پاولوشا نے الٹ پلٹ کر دیکھا ۔

”نہیں کچے ہیں ابھی ۔ ابے وہ دیکھ، وہ ڈبکی لگائی!،، اچانک اس نے دریا کی طرف رخ کرکے کہا ۔ ”ہو نہ ہو پائک مچھلی ہوگی ۔ اور وہ دیکھ وہ، دم‌دار ستارہ ٹوٹا!،،

”ارے نہیں یار ۔ آؤ تمھیں ایک قصہ سناؤں!،، کوستیا نے اچانک باریک سی آواز میں کہا ۔ ”ذرا دھیان سے سنو ۔ ابا نے سنایا تھا ۔ خود میرے سامنے ۔،،

”ہاں تو لے بول، ہم سن رہے ہیں دھیان سے،، فیدیا نے یوں کہا جیسے اس کی ہمت بڑھا رہا ہو ۔

”گاوریلا کو تو جانتے ہو نا تم ۔ ارے وہی کسانوں کے گاؤں‌والا بڑھئی؟،،

”ہاں، ہاں جانتے کیوں نہیں!،،

”جانتے ہو وہ ایسا چپ چاپ اور مریل سا کیوں ہے، نہ کسی سے بولتا ہے نہ بات کرتا ہے ۔ اس کی بھی ایک وجہ ہے، یارو! ابا کہتے ہیں کہ ہوا یوں کہ ایک دفعہ وہ خشک میوے چننے جنگل گیا ۔ تو جی جنگل پہنچا میوے چننے اور راستہ گیا بھول ۔ چلم چل چلم چل، خدا جانے کہاں پہنچ گیا ۔ مگر چلتا رہا، میرا یار ۔ چلتا رہا، چلتا رہا، مگر راستہ نہ ملنا تھا نہ ملا ۔ دیکھتے دیکھتے رات پڑنے لگی ۔ لوجی، وہ وہیں ایک پیڑ تلے بیٹھ گیا ۔ سوچا ’لے بھئی یہیں بیٹھ کر صبح کرلے!‘، بیٹھا تو ذراسی دیر میں اونگھ گیا ۔ پلک جھپکنے کی دیر تھی کہ چاروں طرف سے کوئی اس کا نام لےلے کر پکارنے لگا ۔ چونک کر چاروں طرف دیکھا دور دور کسی کا اتہ پتہ نہیں ۔ پھر آنکھ جھپک گئی — پھر کسی نے پکارا ۔ اس نے پھر چاروں طرف نظر دوڑائی، چاروں طرف ۔ دیکھتا کیا ہے کہ

سامنے ڈال پر بن پری بیٹھی، مزے میں جھونٹے لے لےکر اسے آواز دے رہی ہے۔ آواز دے رہی ہے اور ہنس ہنس کے باولی ہوتی جارہی ہے۔ ہنسے جارہی ہے، ہنسے جارہی ہے۔ اور پورن ماشی کا چاند آسمان پر چمک رہا ہے۔ ایسا دمک رہا ہے کہ پہلے کبھی کاہے کو ایسا دمکا ہو — تو بھائی میرے، سب کچھ ایسا صاف نظر آرہا تھا، جیسے دن ہو۔ ہاں جی تو وہ اسی طرح صاف ستھری نکھری نکھری سی شاخ پر بیٹھی مسافر کو پکارتی۔ ایسی چمکیلی، ایسی اجلی، جیسے زرد مچھلی ہوتی ہے۔ ادھر گوریلا خوف سے ادھ موا ہوا جارہا تھا۔ ادھر وہ اس غریب کا حال دیکھ دیکھ کر ہنس رہی تھی۔ ہنستی جارہی ہے، اور ہاتھ کے اشارے سے پاس بلاتی جارہی ہے۔ بس جی گوریلا اٹھ کھڑا ہوا۔ اجی وہ تو بن پری کے اشارے پر چل ہی پڑا تھا سمجھو کہ عین وقت پر اوپر والے نے عقل دے دی بدھو کو۔ جلدی سے سینے پر پاک صلیب کا نشان بنانے لگا۔ کہتے ہیں ایسا مشکل ہورہا تھا صلیب بنانا کہ اللّٰہ توبہ، ابا بتاتے تھے کہ اس کا ہاتھ ایسا ہورہا تھا جیسے پتھر۔ ہلائے نہ ہلے... واہ رے جن بھوت! مگر اس نے سینے پر ادھر صلیب کا نشان بنایا، ادھر بھائی میرے، بن پری تو ہنسنا ہی بھول گئی۔ بلکہ گھبرا کر رونے لگی۔ روتی جارہی ہے، اور بالوں سے آنکھیں پونچھتی جارہی ہے۔ اور ہاں بن پری کے بال ہرے، مانو بال نہ ہوں پٹسن ہو۔ ہاں تو بھیا گوریلا اسے دیکھتا رہا، دیکھتا رہا، پھر اس سے بولا: 'ارے جنگل کی کچی کلی۔ روتی کیوں ہے ری؟'، جانتے ہو بن پری نے کیا جواب دیا۔ بولی: 'یہ صلیب کا نشان کیوں بنایا تم نے، میرے ننھے انسان۔ ہائے ہم تم آخر دم تک ہنسی خوشی ایک ساتھ جیون بتاتے، اب روؤں نہ تو کیا کروں۔ تو نے صلیب کا نشان کیوں بنایا آخر۔ اب میں دکھ نہ جھیلوں تو کیا کروں؟ لیکن میں اکیلی نہیں ہوں۔ میرے ساتھ ساتھ تو بھی زندگی بھر دکھی رہےگا!'، بس میرے بھائی، یہ کہتے کہتے بن پری اچانک غائب ہوگئی۔ اور اس کا غائب ہونا تھا کہ گوریلا کو جیسے جوتے کے تلے میں نظر آگیا کہ جنگل سے نکلنے کا راستہ کونسا ہے۔ لیکن وہ دن اور آج کا دن اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نظر نہ آئی۔ ایسا ادھ موا سا گھومتا ہے کہ کیا کہوں!،،

''ہوں!،، فیدیا نے طویل خاموشی کے بعد سوچتے ہوئے کہا۔ ''مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے بھلا کہ جنگل کی یہ ذلیل چڑیل عیسائی مذہب کے نام لیوا کی روح کو برباد کردے۔ اور پھر اس بدبخت نے اس کمبخت چڑیل کی بات سنی ہی کہاں تھی؟،،

''اماں وہ ایک ہی بات ہے،، کوستیا بولا۔ ''گوریلا کا کہنا ہے کہ بن پری کی آواز ایسی تاریک ایسی دکھ بھری تھی جیسے مینڈک بول رہا ہو۔،،

''تمھارے ابا نے خود سنایا تھا یہ قصہ؟،، فیدیا نے پوچھا۔

''اجی روپے میں سولہ آنے خود۔ میں تو پلنگ پر پڑا ساری باتیں سن رہا تھا۔،،

''واہ کیا کرامات ہیں! مگر میں پوچھتا ہوں کہ وہ دکھی کیوں ہے۔ بات کچھ یوں ہوئی ہوگی کہ سرد بن پری کو پسند آگیا ہوگا۔ ارے جبھی تو بلا رہی تھی۔''

''ہاں اور کیا، پسند ہی تو آیا ہوگا''، ایلوشا نے جملہ بڑھایا۔ ''ظاہر ہے۔ اجی گدگدانا چھیڑنا چاہتی ہوگی کمبخت۔ ضرور یہی بات ہوگی۔ یہی تو کام ہے ان کا۔ ان بن پریوں نابکاروں کا!''

''سنو تو۔ یہاں بھی تو ہوں گی بن پریاں؟'' اچانک فیدیا نے کہا۔

''نہیں'' کوستیا نے بڑے یقین سے جواب دیا۔ ''یہ جگہ صاف ستھری ہے۔ ہر عذاب سے پاک۔ بس یہ کہ ندی پاس ہی ہے۔''

سب سوچ میں ڈوب گئے۔ اچانک کہیں دور ایک آواز ابھری۔ کھنکتی ہوئی سی طویل آواز۔ رات کے اندھیرے میں ابھرنےوالی ایسی بےمعنی آوازوں میں سے ایک جو کبھی کبھی گہرے سناٹے میں رات کی گود سے ابھرتی ہیں، بڑی دیر فضا میں معلق رہتی ہیں اور رفتہ رفتہ خود ہی ڈوبتی چلی جاتی ہیں۔ غور سے سنو تو لگے کچھ بھی نہیں ہے، مگر آواز ہے کہ ابھررہی ہے۔

ایسا لگا جیسے کوئی دیر، بڑی دیر تک، دور افق کے قریب چلایا اور پھر جنگل سے کسی دوسری آواز نے اس کا جواب دیا۔ تیز اور باریک سے قہقہے سے۔ اور پھر دریا کی سطح پر دبی دبی سی کھس کھس کی آواز تیرتی چلی گئی۔ بچوں نے سہمی ہوئی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور کانپ اٹھے...

''پاک صلیب کی طاقت ہمارے ساتھ ہے!'' ایلوشا نے سرگوشی کی۔

''اف رے ڈرپوک، کبوترو'' پاولوشا چلایا۔ ''یوں سہم گئے سب کے سب۔ دیکھو تو سہی آلو ابل گئے۔'' (یہ سنتے ہی سب کے سب بچے آلوؤں کی پتیلی کے گرد جمع ہوئے اور مگن ہوکر گرم گرم آلو کھانے لگے جن سے بھاپ نکل رہی تھی۔ لیکن وانیا اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔) ''کیوں بے، کیا بات ہے؟'' پاولوشا نے پوچھا۔

مگر وانیا چٹائی سے نہیں اٹھا۔ اور دیکھتے دیکھتے آلوؤں کی پتیلی خالی ہو گئی۔

''ارے یارو، کچھ اور بھی سنا تم نے؟'' ایلوشا نے بات چھیڑی۔ ''معلوم ہے ہمارے گاؤں وارناویتسی کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟''

''وہی پرانے باندھ کے پاس؟'' فیدیا نے لقمہ دیا۔

''ہاں، ہاں، وہیں، ٹوٹے ہوئے باندھ کے برابر میں... وہ جگہ بڑی گندی ہے۔ اور ایک دم اندھیری سنسان۔ چاروں طرف گھاٹیاں اور کھڈ ہی کھڈ ہیں۔ اور کھڈوں میں ایسے ایسے سانپ رینگتے ہیں کہ کیا کہوں!''

''مگر ہوا کیا وہاں؟ کچھ بتاؤگے کہ بس...''

''ہونا کیا تھا۔ تجھے شاید پتہ نہیں ہے فیدیا، وہاں پر ایک آدمی دفن ہے، جو برسوں پہلے وہیں ڈوب کر مرا تھا۔ تب کی بات کررہا ہوں جب تلیا میں ہاتھی ڈباؤ پانی تھا۔

مگر یار اس کی قبر آج تک موجود ہے۔ یوں الگ نظر آتی ہے۔ اور تو اور وہ خود بھی دھندلا سا دکھائی دیتا ہے۔ یوں ابھرا ہوا۔ ہاں تو یار، ہوا یوں کہ کچھ دن پہلے چودھری نے ایرمیلا شکاری کو بلوایا اور بولا: 'لے ایرمیلا پوسٹ پر جانے کو تیار ہوجا۔' ایرمیلا بچارے کو تو آئے دن وہاں جانے کا حکم مل جاتا ہے، ارے اس کے تو کتے بھی سارے سر کھپ گئے ہیں۔ نجانے کیا بات ہے اس کے پاس ٹکتے ہی نہیں کتے! اجی کبھی بھی نہیں ٹکے۔ مگر یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ شکاری وہ ایک نمبر کا ہے۔ تو جی ایرمیلا پوسٹ کےلئے روانہ ہوگیا۔ راستے میں ذرا کے ذرا شہر میں رکا اور جب واپسی کی ٹھانی تو نشے میں چور تھا۔ رات ہوچکی تھی۔ مگر تھی چاندنی رات۔ آسمان پر بڑا سا چاند جگمگا رہا تھا... ایرمیلا باندھ پر سے گزر رہا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا، راستہ ہی وہی ایک تھا۔ بس جی، خدا بھلا کرے تمہارا، ایرمیلا شکاری چلا جا رہا تھا۔ اتنے میں دیکھتا کیا ہے کہ ڈوبنےوالے کی قبر پر بھیڑ کا میمنہ پڑا ہے۔ ڈھیروں ڈھیر گھونگھریالے بالوں والا سفید جھاگ سا بچہ۔ میمنہ جیسے بڑے پیار سے اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ لے بھئی ایرمیلا نے سوچا 'لاؤ میں ہی لیجاؤں دکھیا کو۔ یہاں پڑاپڑا مرمرا نہ جائے بےچارا۔' تو جی اس نے ٹیلے پر چڑھ کر میمنے کو اٹھا لیا۔ اور وہ ننھی سی جان بڑے مزے میں آگیا اس کی گود میں۔ ایرمیلا اسے لے کر اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا۔ لو اور سنو، گھوڑا تو اسے دیکھ کر بدک اٹھا۔ الٹے پاؤں پیچھے ہٹ رہا ہے، دولتیاں چلا رہا ہے، سر جھٹک رہا ہے۔ خیر جی جیسے تیسے شکاری نے گھوڑے کو قابو میں کیا اور میمنے کو گود میں لیکر گھوڑے پر سوار ہوکر چل پڑا۔ میمنہ سوار کے سینے سے لگا ہوا تھا۔ اس نے میمنے کی طرف دیکھا تو وہ بھی سوار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے یوں غور سے شکاری کو دیکھنے لگا۔ اسے کچھ گھبراہٹ سی محسوس ہوئی، ایرمیلا شکاری کو! لو بھلا بھیڑ بکریوں نے کبھی کاہے کو کسی کو یوں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا ہوگا! خیر جی کوئی بات نہیں۔ شکاری نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا: 'میمنے رے میمنے!'، باپ رے باپ میمنے نے تو اچانک کھیسیں نکال دیں اور جھٹ بولا: 'میمنے رے میمنے!'،،

داستان گو ابھی یہیں تک پہنچا تھا کہ اچانک دونوں کتے سوتے سوتے اچھلے، تڑپ کر دوڑے اور زور زور سے بھونکتے غراتے اندھیرے میں غائب ہوگئے۔ بچے سب ایک دم سہم گئے۔ وانیا بھی اچھل کر چٹائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پاولوشا اٹھا اور زور سے چلاتا ہوا کتوں کے پیچھے دوڑ پڑا جن کے بھونکنے کی آواز پل پل دور ہوتی جارہی تھی۔ اچانک گھوڑوں کی ٹاپوں کا شور بلند ہوا۔ صاف ظاہر تھا کہ گھبرائے ہوئے گھوڑوں کا پورا غول ڈر کر سرپٹ دوڑ رہا ہے۔ پاولوشا کتوں کو زور زور سے پکار رہا تھا: ''بھورے! بھورے! کالو! اے کالو!،، چند لمحے بعد کتوں کے بھونکنے میں کچھ کمی آئی اور رفتہ رفتہ خاموشی چھا گئی۔ پاولوشا کی آواز بھی اب بہت دور سے آرہی

تھی... تھوڑی دیر اور گزری ۔ لڑکے بڑی پریشانی سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے ۔ جیسے انھیں ڈر ہو کہ ضرور کچھ نہ کچھ ہونےوالا ہے ۔ اچانک سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے کی ٹاپوں کا شور سنائی دیا اور ایک گھوڑا دوڑتا ہوا الاؤ تک آکر رک گیا ۔ پاولوشا گھوڑے کی ایال پکڑکر دھم سے اس کی ننگی پیٹھ پر سے کود گیا ۔ پھر اچانک دونوں کتے بھی اچھل کر روشنی کے دائرے میں آئے اور اطمینان سے بیٹھ گئے... لمبی لمبی لال زبانیں باھر لٹکی ہوئی تھیں ۔

''کیا ہوا ؟ کیا بات تھی؟،، لڑکوں نے پوچھا ۔

''کچھ نہیں !،، پاولوشا نے گھوڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔ ''کتے نجانے کیا سونگھ کر اچانک چونک گئے تھے ۔ اور میں ڈرا کہ کہیں بھیڑیا تو نہیں آگیا،، اس نے لمبے سانس لیتے ہوئے اطمینان سے کہا ۔

اور میں جیسے اچانک اس چھوٹے سے لڑکے پر فدا ھوگیا ۔ اس وقت تو وہ اتنا پیارا لگ رہا تھا کہ بس! اس کی صورت معمولی تھی ۔ لیکن اس وقت گھوڑسواری کے بعد چہرہ دمک رہا تھا ۔ یوں بھی کیا دلیری تھی ۔ کیسی ھمت تھی جس نے یوں پلک جھپکتے میں اس سے اتنا بڑا فیصلہ کرا دیا تھا ۔ ان جذبات نے اس کے چہرے پر ، اس کی آنکھوں میں ایسی چمک پیدا کردی تھی کہ کیا کہنے ۔ ذرا سوچو تو سہی، ھاتھ میں ھنٹر تک نہیں تھا، مگر رات کے اندھیرے میں بھیڑیے، بلکہ شاید بہت سے بھیڑیوں، کا مقابلہ کرنے، اتنا سا بچہ یوں بلا جھجک نکل کھڑا ہوا ۔ ''کیسا بہادر بچہ ھے،، میں نے اسے دیکھتے ہوئے سوچا ۔

''دیکھے تم نے، بھیڑیے تھے وھاں؟،، چوھے جیسے چھوٹے دل والا کوستیا بولا ۔

''ارے یہاں بھیڑیوں کی کیا کمی ۔ جب چاھو دیکھ لو،، پاولوشا نے جواب دیا ۔ ''البتہ صرف جاڑے میں بڑے خونخوار ھو جاتے ھیں ۔ ،،

وہ پھر الاؤ کے پاس آیا اور مزے سے زمین پر بیٹھا تو اتفاق سے ھاتھ ایک کتے کی تھوتھنی پر جا پڑا ۔ کتا تو ایسا مست ھوا کہ اس نے بڑی دیر تک سر کو جنبش ھی نہ ہونے دی ۔ بڑی خوشی اور طمانیت سے پاولوشا کو دیکھتا رھا ۔

وانیا پھر اپنی بوری پر دراز ھوچکا تھا ۔

''کیسے کیسے بھیانک قصے سنائے ھیں تو نے ھمیں ایلوشا،، فیدیا نے کہا ۔ امیر کسان کا بیٹا تھا تو اسے منڈی کے استاد گویے کی طرح راگ چھیڑنا ھی چاھئے تھا (خود کم بولتا تھا کہ اس کی شان میں کمی آ جائےگی) ۔ ''اور پھر کتوں نے کیسا شور ھنگامہ مچایا ھے ۔ دل لرز گیا ۔ مگر بات ٹھیک ھے ۔ میں نے بھی سنا ھے کہ وہ جگہ خراب ھے ۔ ،،

''وارناویتسی؟ اور کیا ۔ اور ایسی ویسی خراب ھے! اجی سنا ھے وھاں اکثر بوڑھا زمیندار نظر آتا ھے ۔ زمیندار مرحوم ۔ کہتے ھیں لمباسا کفتان پہنے، آھیں بھرتا زمین

میں نجانے کیا کھوجتا پھرتا ہے۔ ایک دفعہ تو بوڑھے دادا تروفیمیچ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اسے! 'ارے ایوان ایوانیچ، مالک، یہاں زمین میں کیا کھوج رہے ہیں آپ؟'،،

''بوڑھے دادا نے جھٹ پوچھ بھی لیا اس سے؟،، فیدیا ایسا حیران ہوا کہ بیچ میں ٹوک دیا۔

''ہاں بالکل، پوچھ لیا!،،

''بوڑھے تروفیمیچ کی ہمت کا جواب نہیں یار۔ ہاں تو پھر کیا ہوا؟،،

'' 'جادو کی جڑی بوٹی ڈھونڈ رہا ہوں، وہ کھوکھلی اور دھنسی سی آواز میں بولا۔ 'جادو کی جڑی بوٹی'۔ 'ارے مگر آپ کو اب کیا لینا دینا ان جڑی بوٹیوں سے؟' مردہ بولا: 'قبر میں دم گھٹتا ہے، تروفیمیچ۔ دباتی ہے مجھے قبر۔ نکلنا چاہتا ہوں اس سے، نکلنا چاہتا ہوں میں...'،،

''ہا، بچارا!،، فیدیا نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے وقت سے پہلے ہی چل بسا!،،

''تعجب ہے یار،، کوستیا سوچ میں کھویا ہوا سا بولا۔ ''میں تو سوچتا تھا کہ مردے صرف مرحومین والے سنیچر ہی کو نظر آسکتے ہیں۔،،

''نہیں جی مردے تو کبھی بھی نظر آسکتے ہیں،، اچانک ایلوشا نے گفتگو میں شریک ہوتے ہوئے پورے یقین سے کہا۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں سب بچوں میں ایلوشا ہی گاؤں کے ریت رواج اور رسم رسوم سے سب سے زیادہ واقف تھا۔ ''اور مرحومین والے سنیچر کے دن تو، یار، وہ لوگ بھی نظر آجاتے ہیں جو ابھی اس دنیا میں ہوں مگر سال اندر مرنے والے ہوں۔ بس رات کو چپ چاپ جاکر گرجا کے سامنے والی سیڑھیوں پر بیٹھ جاؤ۔ ہلو ڈولو بالکل نہیں، بس دم سادھے ٹھیک ناک کی سیدھ میں دیکھتے رہو۔ اجی میں کہتا ہوں، وہ سب لوگ باری باری سامنے والی سڑک سے گزرتے نظر آئیں گے جن کی اس سال مرنے کی باری ہوگی۔ پچھلے برس دادی اولیانا بیٹھی تھیں جا کے گرجا کی سیڑھیوں پر!،،

''پھر؟ دیکھا کسی کو انہوں نے؟،، کوستیا کی آواز میں بڑا تجسس تھا۔

''ہاں، کیوں نہیں۔ بڑی دیر بیٹھی رہیں، مگر کوئی نظر نہ آیا، اجی کسی کی آواز تک سنائی نہ دی۔ بس یوں لگ رہا تھا جیسے قریب کہیں کوئی کتا بھونک رہا ہو۔ مگر پھر اچانک دیکھتی کیا ہیں کہ ایک بچہ سامنے سے چلا آرہا ہے، بس ایک قمیص پہنے ہوئے۔ غور سے دیکھا — لو، وہ تو ایواشکا فیدوسیئف نکلا...،،

''وہی جو بہار میں اللہ کو پیارا ہوا تھا؟،، فیدیا نے لپک کر پوچھا۔

''ہاں وہی! منہ جھکائے چلتا رہا، ایک بار بھی سر نہ اٹھایا۔ مگر دادی اولیانا نے فوراً پہچان لیا اسے! پھر جی انہوں نے ایک بڑھیا گزرتی دیکھی۔ غور سے دیکھا، خوب آنکھیں گڑو گڑو کر — یا اللہ رحم... دیکھتی کیا ہیں کہ سامنے سڑک پر خود وہی چلی جارہی ہیں، خود دادی اولیانا۔،،

''کیا کہا، خود وہی!،،

''ھاں اللہ قسم خود اپنے آپ کو دیکھا۔''
''مگر یہ کیسے ممکن ہے، وہ تو اچھی بھلی زندہ ھیں ابھی!''
''تو سال ختم کب ھوا ابھی؟ یوں بھی ذرا دیکھو تو سہی انھیں، بس کوئی دم کی مہمان ھیں، بےچاری۔''

ایک دفعہ پھر سب خاموش ھوگئے۔ پاولوشا نے سوکھی لکڑیوں کا ایک گٹھا الاؤ پر ڈالا تو شعلہ سا لپکا اور اچانک آگ بھڑکنے سے لکڑیاں کالی پڑگئیں، زور سے چرچرائیں اور ان سے دھوئیں کے بادل سے اٹھنے لگے۔ جل کر لکڑیاں اکڑیں اور ان کے جلتے ھوئے سرے اکڑکر خوب اونچے ھوگئے۔ روشنی کا عکس جھلملایا، تھرتھرایا اور چاروں طرف بکھر گیا۔ خاص کر اوپر کی طرف لپکا۔ اور تب ایک سفید کبوتر، نجانے کہاں سے اڑتا ھوا آیا اور سیدھا اس عکس کی طرف لپکا اور ڈرکر پورے کا پورا گرم روشنی میں لپٹا ھوا۔ وھیں گول گول چکر کاٹنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے وہ پر پھڑپھڑاتا ھوا اڑا اور نظر سے اوجھل ھوگیا۔

''لگتا ھے راستے سے بھٹک گیا ھے، بےچارا!'' پاولوشا بولا۔ ''اب نجانے کہاں کہاں بھٹکےگا، پھر کسی چیز سے ٹکرائےگا اور جہاں ٹکرائےگا وھیں ٹک کر سویرا ھونے کا انتظار کرےگا۔''

''کیوں پاولوشا'' کوستیا بولا۔ ''یہ بھی تو ھوسکتا ھے کہ یہ کبوتر نہ ھو، کسی کی روح آسمان کی طرف پرواز کررھی ھو۔''

پاولوشا نے لکڑیوں کا دوسرا گٹھا بھی الاؤ میں جھونک دیا۔
''شاید!'' بڑی دیر کی خاموشی کے بعد وہ آخر بولا۔
''ایک بات بتا، یار، پاولوشا'' فیدیا نے پھر بات چھیڑی۔ ''کیا تمھارے ھاں شالامووہ میں بھی لوگوں نے اسے، کیا کہتے ھیں، دیکھا تھا۔ میرا مطلب ھے گرھن کو۔ گرھن ھی کہتے ھیں نا اسے؟''
''جب سورج کالا پڑجاتا ھے، وہ؟ ھاں کیوں نہیں؟''
''تم تو بہت ڈر گئے ھوگے یار؟''
''ھم کوئی اکیلے ھی تھوڑے ھی دھل گئے تھے، خود ھمارے زمیندار صاحب نے ھمیں پہلے ھی خبردار کردیا تھا کہ، کیا کہتے ھیں، گرھن پڑےگا۔ باپ رے باپ کیا گھور اندھیارا ھوگیا تھا۔ اجی خود زمیندار کے چھکے چھوٹ رھے تھے۔ اب گرا کہ تب گرا۔ ایک کسان کی بڑھیا نے تو جو یوں دن دھاڑے رات پڑتی دیکھی تو، جانتے ھو، جھٹ سارے برتن بھانڈے توڑ دئے! 'اب بھلا کون کھائےگا!'، وہ بولی۔ 'قیامت کا دن ھے یہ، روز حساب!'، اور ھمارے گؤں میں تو ایسی ایسی افواھیں پھیلیں کہ کیا کہوں۔ کوئی کہتا دھرتی پر سفید بھیڑیے پھیل کر لوگوں کو کھا لیں گے۔ ھر طرف گدھ اور چیل کوے اڑتے پھریں گے۔ اور تو اور یہاں تک بھی سنا کہ 'دجال، بھی آئےگا۔''

''یہ دجال کون ہے؟،، کوستیا نے پوچھا۔

''تم نہیں جانتے اسے؟،، ایلوشا جوش سے جواب دیا۔ ''ارے یار تو بھی کیسا بدھو ہے۔ دماغ میں بھس بھرا ہے کہ یسوع مسیح کے دشمن کو بھی نہیں جانتا۔ ارے تمھارے ہاں لوگ بھی کیسے ہیں! یہ دجال ایک ایسی انوکھی ہستی ہے جو ایک دن ہماری دھرتی پر آئےگی۔ اور آئےگا ایسے یہ انوکھا بندہ کہ نہ اسے پکڑ سکو، نہ اس کا کچھ بگاڑ سکو۔ ایسی عجیب و غریب ہستی ہوگی اس کی۔ اب جیسے ساری عیسائی خلقت اسے پکڑنا چاہےگی سب برچھیاں، بھالے اور زنجیریں لے لےکر گھروں سے نکل پڑیں گے۔ اسے پکڑنا چاہیں گے، پاؤں تلے روندنا چاہیں گے، مگر وہ تو انہیں بھینگا بنا دےگا۔ ایسا بھینگا بنا دےگا کہ وہ اس کے دھوکے میں خود ایک دوسرے پر ہی ٹوٹ پڑیں گے۔ پھر وہ اسے جیسے زندان میں بند کر دیں گے اور لوجی وہ تو ڈونگا بھر پانی مانگ کر جھٹ پانی میں ڈبکی لگا جائےگا۔ اب ڈھونڈتے رہو، جب تک جی چاہے۔ مجال ہے جو اس کی خاک بھی مل جائے۔ لوگ اسے زنجیروں میں جکڑدیں گے، مگر جیسے ہی وہ تالی بجائےگا، ساری کی ساری زنجیریں ٹوٹ کر گرپڑیں گی۔ اور یہ عجیب و غریب ہستی۔ یہ دجال شہر شہر، گاؤں گاؤں گھومےگا۔ اور مکاری کا یہ عالم ہوگا اس کی کہ ایک سے ایک نیک عیسائی بندے کو بےوقوف بنا دے۔ مگر کوئی بھی تو اس کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ ایسی مکار ایسی عجیب ہوگی یہ مخلوق۔،،

''ہاں بات تو ٹھیک ہے،، پاولوشا اپنی پرسکون آواز میں بولا۔ ''اس دجال کا تو ہمارے گاؤں میں بھی ہر طرف چرچا تھا۔ بڑے بوڑھوں کا کہنا تھا کہ جیسے ہی ایسا گرہن پڑا، جیسے ہی افق پر یوں دن دھاڑے سیاہی چھائی ویسے ہی دجال آجائےگا۔ اور لوجی گرہن پڑگیا۔ کیا بچہ، کیا بوڑھا، سب شہری گھروں سے نکل پڑے۔ میدان میں کھڑے آنےوالی گھڑی کا انتظار کررہے ہیں۔ اور ہمارا گاؤں تو، تم جانو، اونچے ٹیلے پر ہے۔ چاروں طرف دور دور تک جو چاہو دیکھ لو۔ سب کی نظریں گڑی تھیں۔ اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ اگلے گاؤں کے برابر والی پہاڑی سے ایک آدمی اتر رہا ہے۔ انوکھا سا آدمی، بڑا عجیب سا سر۔ ایک دم ہی سب چلا اٹھے: 'وہ آگیا دجال۔ وہ آگیا عیسی مسیح کا دشمن! جس کا جدھر منہ اٹھا بھاگا۔ گاؤں کا سرپنچ تو کھائی میں جا گرا اور سرپنچ کی گھروالی پھاٹک کی چوکھٹ میں پھنس گئی جیسے اس پر جن آگیا ہو۔ ایسا چلائی کہ خود ان کا کتا ڈرکر لوہے کی زنجیر تڑاکر ٹہنیوں کی باڑ پھاند، سر پر پاؤں رکھ کر جنگل کی طرف بھاگ نکلا۔ کوزکا کے ابا دروفیئچ چھلانگ لگا کر جئی کے کھیت میں جا گھسے۔ وہ دبک کے بیٹھ گئے اور بٹیر کی طرح چلانے لگے۔ سوچا 'انسانی روح کا یہ قاتل، یہ دشمن غریب جنگلی پرندے پر تو کیا ہاتھ ڈالےگا'۔ تو بھائی میرے یہ عالم تھا۔ ایسی ہلچل مچی تھی ساری خلقت میں۔ اور لو وہ صاحب قریب پہنچے تو دیکھتے کیا ہیں کہ وہ تو اپنے گاؤں کا ٹھٹیرا واویلا ہے۔ بےچارے نے اپنے لئے نیا جگ خریدا تھا، وہی خالی جگ سر پر دھرے چلا آرہا تھا۔،،

سارے لڑکے زور سے ہنسے اور پھر پل بھر کو خاموش ہوگئے۔ کھلی ہوا میں باتیں کرتے ہوئے لوگ اکثر یونہی اچانک خاموش ہوجاتے ہیں۔ میں نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ رات پوری شان و شوکت سے دنیا پر حکومت کررہی تھی۔ شام کی نمی اور تازگی کی جگہ اب آدھی رات کی خشک اور خوشگوار فضا نے لےلی تھی۔ ابھی تو بڑی دیر تک نیند میں ڈوبے ہوئے کھیتوں پر اس خوشگوار گرمی کی بادشاہت قائم رہےگی۔ ابھی تو سپیدۂ سحر نمودار ہونے میں بہت وقت پڑا تھا۔ صبح تو ابھی کلبلائی بھی نہ تھی۔ ہلکی سی سرسراہٹ بھی پیدا نہیں ہوئی تھی اور صبح کی سرخی نے افق پر پہلا نقش بھی نہیں بنایا تھا۔ آسمان پر چاند کا نام و نشان نہ تھا۔ یہ وہ تاریخیں تھیں جب چاند دیر میں نکلتا ہے۔ وہ بھی صبح ہوتے۔ ان گنت سنہرے ستارے جیسے آہستہ آہستہ تیررہے تھے۔ گویا کہکشاں پر کسی پری‌وش سے ملاقات طے ہوئی ہو۔ اور واقعی انہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے پاؤں تلے زمین بنا کسی جنبش کے، آہستہ آہستہ مسلسل چکر کاٹ رہی ہو۔ اچانک دریا کے اوپر دو دفعہ کچھ عجیب چھری کی دھار جیسی تیز اور تکلیف‌دہ چیخ ابھری، جیسے کوئی بین کررہا ہو۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی، پھر ویسی‌ہی چیخ سنائی دی۔ اس دفعہ آواز ذرا اور دور سے آئی تھی۔

کوستیا کانپ گیا۔ ”کیا ہے یہ؟،،

”کچھ نہیں بگلے چلا رہے ہیں،، پاولوشا نے بڑے یقین سے کہا۔

”بگلے!،، کوستیا نے اس کے الفاظ دوہرائے۔ ”مگر دیکھو نا پاولوشا، میں نے تو کل شام سنا تھا کہ،، وہ پل بھر کو خاموش ہوا، پھر بولا: ”کہ... تم نے بھی تو سنا ہوگا!،،

”کیا سنا تھا تم نے؟،،

”بتاؤں کیا سنا تھا؟ میں کامیننایا گریادا سے شاشکینو جارہا تھا۔ پہلے تو گری کا جنگل پار کیا، پھر سرغزار سے گزرا، ارے وہیں سے، جہاں گھاٹی گھوم گئی ہے۔ وہیں تو ہے وہ گہری تلیا جس میں بہار میں خوب پانی بھر جاتا ہے۔ معلوم ہے اس میں بید کے کتنے جھنڈ نکل آئے ہیں۔ تو جی میں اس تلیا کے ساتھ ساتھ جارہا تھا۔ بھائی میرے اچانک اس تلیا سے کوئی چیخا۔ کیسا بین تھا، کیسا درد تھا اس آواز میں۔ ’آوئی — ی — ی، اوئی — ی — ی، باپ رے، میں تو کانپ گیا۔ ارے رات پڑرہی تھی اور پھر وہ آواز بھی تو کیسی دکھ بھری تھی۔ میں تو مانو خود ہی رو پڑا۔ آخر تھا کیا وہ۔ بتاؤ نا کیا تھا بھلا وہ؟،،

”ارے اسی تلیا میں تو پچھلی گرمیوں میں چوروں کی ٹولی نے جنگل کے رکھوالے آکیم کو ڈبویا تھا،، پاولوشا بولا۔ ”اسی کی روح فریاد کررہی ہوگی!،،

”اوھو، ضرور یہی بات ہوگی، میرے بھائی!،، کوستیا نے بڑی بڑی آنکھوں کو اور بھی پھیلاتے ہوئے اعلان کیا۔ ”اجی مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا کہ آکیم اس تلیا میں ڈوبا تھا۔ نہیں تو بھلا میں اور بھی زیادہ ڈر جاتا!،،

’’ویسے میں نے یہ بھی سنا ہے کہ اس تلیا میں ایسے ننھے ننھے سے مینڈک ہیں جو ٹراتے ہیں تو لگتا ہے کوئی آدمی دکھ اور تکلیف سے کراہ اور رو رہا ہے۔،،

’’مینڈک؟ ارے نہیں، پاولوشا۔ مینڈک نہیں تھے وہ! کیسے مینڈک بھئی؟،، دریا کے اوپر ایک دفعہ پھر بگلے چیخے تو کوستیا جیسے بےاختیار کراہ اٹھا: ’’یوں چنگھاڑ رہا ہے جیسے جنگل کی بد روح ہو۔،،

’’بدروح چلاتی نہیں۔ گونگی ہوتی ہے، وہ تو،، اچانک ایلوشا نے لقمہ دیا۔ ’’وہ تو بس اچھل اچھل کر تالیاں بجاتی ہے اور کچھ نہیں!،،

’’تو نے دیکھا ہے اسے، جنگل کی بدروح کو؟ بول!،، فیدیا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے چوٹ کی۔

’’نہیں، میں نے تو نہیں دیکھا۔ خدا نہ کرے جو کبھی مجھے نظر آئے۔ مگر اور بہتوں نے دیکھا ہے۔ ارے ابھی پچھلے ہی دنوں ایک دفعہ ایک کسان کو مل گئی تھی راستے میں۔ اس نے تو کسان کو دھکیل دھکیل کے گھنے جنگل میں پہنچا دیا۔ بار بار ایک ہی کھیت کا چکر کاٹتا رہا بےچارا! خدا خدا کرکے صبح ہوتے اپنی کٹیا تک پہنچ پایا تھا، غریب!،،

’’تو اس نے تو دیکھا ہوگا بدروح کو؟،،

’’دیکھا تھا۔ کہتا ہے، یوں لمبی چوڑی پہاڑسی کھڑی تھی۔ گہرے بھورے رنگ کی یہ لمبی مخلوق ہے کہ کیا کہیں۔ سر سے پاؤں تک ڈھکی ہوئی۔ مانو پیڑ کے پیچھے کھڑا دیکھ رہا ہو۔ دیکھے جا رہا ہو۔ خود اسے کبھی ٹھیک طرح دیکھ نہیں پاتے، ارے چاندنی سے دور ہی دور رہتی ہے نا، اس لئے۔ مگر خود وہ آپ کو دیکھ دیکھ کر آنکھ مارتی رہے گی!،،

’’ہائے ربا!،، فیدیا نے کندھے جھٹکتے ہوئے آہستہ سے لرز کر کہا۔ ’’لعنت ہے!،،

’’مگر یہ تو بتاؤ، یہ کمبخت دنیا میں آیا کیوں؟،، پاولوشا بولا۔ ’’واقعی، کیوں آیا بھلا؟،،

’’بکو مت۔ دیکھ سن لے گا،، اچانک ایلیا نے کہا اور ایک دفعہ پھر خاموشی چھا گئی۔

’’دیکھنا ذرا، یارو، دیکھو تو سہی،، یکبارگی وانیا کی بچکانہ آواز ابھری۔ ’’دیکھنا تو سہی کیسے نرالے ہیں یہ آسمانی تارے! مانو جگنو چمک رہے ہوں!،،

اس نے اپنے تر و تازہ مکھڑے سے بوری کا سرا کھسکایا، کہنیوں کے بل اٹھا اور آہستہ سے بڑی بڑی پرسکون آنکھیں اوپر اٹھا دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسرے بچوں کی نگاہیں بھی آسمان کی طرف اٹھیں تو بڑی دیر تک جھک نہ سکیں۔

’’ارے ہاں وانیا،، فیدیا نے محبت سے پوچھا۔ ’’تیری بہن انیوتکا کیسی ہے؟ اب تو طبیعت بہتر ہے نا اس کی؟،،

’’ٹھیک ہے،، وانیا کی آواز میں ہلکی سی تتلاہٹ تھی۔

''تو کہہ دینا اس سے کہ آتی کیوں نہیں ہمارے ہاں؟''

''پتہ نہیں۔''

''ارے تو اس سے کہہ دینا کہ ضرور آئے۔''

''کہوں گا۔''

''اور ہاں کہہ دینا کہ میں بڑی بڑھیا چیزیں کھلاؤں گا اسے!''

''اور مجھے دے گا؟''

''دوں گا۔''

وانیا نے گہرا سانس لیا۔

''ارے نہیں، مجھے نہیں چاہئے کچھ۔ تم اسی کو دے دینا۔ اتنی پیاری سی ہے میری بہن!''

اور وانیا نے پھر سر زمین پر ٹکا دیا۔ پاولوشا جگہ سے اٹھا اور ہاتھ بڑھا کر خالی ہنڈیا اتار لی۔

''کدھر چلے؟'' فیدیا نے اس سے پوچھا۔

''دریا کی طرف۔ پانی لینے۔ پانی پینے کو بہت جی چاہ رہا ہے!''

کتے بھی اٹھ کر اس کے ساتھ ہولئے۔

''ذرا سنبھل کے۔ کہیں دریا میں پھسل نہ جانا!'' ایلوشا نے پیچھے سے آواز دی۔

''گرے گا کیوں بھلا؟'' فیدیا بولا۔ ''چوکس رہے گا۔''

''جی ہاں چوکس رہے گا۔ ارے کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ وہ جھکے، پانی نکالنا شروع کرے اور اچانک جل پری ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لے، تو؟ ادھر سے ادھر تک سب یہی کہیں گے۔ ہائے افسوس لڑکا پانی میں گر گیا۔ اور گرا بھی کیوں کر؟ ارے تم نے سنا؟ سینٹھوں کے جھنڈ میں جا گھسا وہ!'' اس نے کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

واقعی، سینٹھے کی جھاڑیوں میں کچھ سرسراہٹ سی ہورہی تھی۔

''کیا یہ سچی بات ہے'' کوستیا نے بات چھیڑی ''کہ باؤلی اکولینا جب پانی میں گری تھی تبھی سے پاگل ہوئی ہے۔''

''ہاں تبھی سے یہ حال ہے۔ کہتے ہیں اس سے پہلے ایسی خوبصورت تھی کہ کیا کہوں۔ جل پری نے دکھیا کو برباد کردیا۔ اسے شاید یہ خیال نہیں تھا کہ دیہاتی لوگ لڑکی کو یوں جھٹ پٹ پانی سے نکال لیں گے۔ پھر بھی ایک دفعہ کو دریا کی تہہ میں لیجاکر غریب کی صورت تو جھٹ بگاڑ ہی دی!''

(میں خود بھی کئی دفعہ اکولینا کو بھٹکتے دیکھ چکا تھا۔ دکھیا کے بدن پر چیتھڑوں گودڑوں کے سوا کچھ نہیں تھا — دبلی، سوکھی، کریلے جیسا جھلسا ہوا چہرہ، دھندلائی ہوئی آنکھوں سے وحشت ٹپکتی ہوئی اور دانت بجتے ہوئے۔ گلی کوچوں میں یہاں وہاں

گھنٹوں ایک ہی جگہ کھڑی گول گول چکر کاٹتی رہےگی۔ سوکھے مارے ہڈیالے ہاتھوں سے کلیجہ تھامے چکر کاٹ رہی ہے ، کبھی اس پاؤں پر زور دے رہی ہے، کبھی اس پر۔ مانو پنجرے میں بند جنگلی جانور ہو۔ اور کچھ سمجھتی بھی تو نہیں۔ اسے لاکھ سمجھاؤ، کچھ کہو ، کچھ بتاؤ، خاک پلے نہیں پڑتا۔ ہاں کبھی کبھی تشنجی انداز میں ہنس پڑےگی اور بس۔)

''اور سنا ہے،، کوستیا بولا۔ ''اکولینا نے دریا میں چھلانگ لگائی یوں تھی کہ عاشق نے اسے دھوکا دے دیا تھا۔،،

''بالکل یہی بات تو تھی!،،

''واسیا یاد ہے؟،، کوستیا نے دکھی آواز میں کہا۔

''کون واسیا؟،، فیدیا نے پوچھا۔

''ارے وہی جو ڈوب گیا تھا،، کوستیا نے جواب دیا۔ ''ارے اسی دریا میں تو ڈوبا تھا۔ واہ کیا لونڈا تھا۔ کیا لونڈا تھا، میرا یار! ماں اس کی، ارے، وہی فیکلیستا، کیسی پروانہ دار نثار تھی بیٹے واسیا پر۔ جیسے اس کے دل کو خبر تھی، جیسے فیکلیستا ہمیشہ سے جانتی تھی کہ بیٹا تو اس کا پانی کی بھینٹ چڑھےگا۔ ارے گرمیوں میں اکثر ہم‌یار دوستوں کے ساتھ واسیا بھی دریا میں ڈبکی لگانے جایا کرتا تھا۔ بس جہاں واسیا دریا میں گیا وہاں ماں کو جیسے کپکپی سی چھٹی۔ ہائے کیسی بےقرار گھومتی تھی۔ ارے دوسری عورتیں بھی تھیں، مگر کسی کو کوئی غم نہیں۔ تسلا اٹھائے آئیں اور مٹکتی مٹکاتی آگے بڑھ گئیں، مگر فیکلیستا کے تو مانو قدم جم جاتے تھے، تسلا وہیں زمین پر رکھ دےگی اور بار بار بیٹے کو آوازیں دےگی: 'لوٹ آ، بیٹے، لوٹ آ، میرے لال! ارے نکل پانی سے پگلے!'، اور اللہ بہتر جانتا ہے کہ ڈوبا کیسے۔ یار، کنارے پر کھیل رہا تھا، ماں بھی قریب ہی میں سوکھی گھاس اکٹھا کررہی تھی۔ اچانک کچھ آواز سی ہوئی جیسے کوئی پانی میں بلبلے بنا رہا ہو، نظر اٹھائی تو دیکھتی کیا ہے کہ پانی کی سطح پر کچھ بھی نہیں ہے۔ بس واسیا کی ٹوپی تیر رہی ہے۔ ارے وہ دن اور آج کا دن فیکلیستا کے ہوش ٹھکانے نہیں ہیں۔ آئےگی اور آکے اسی جگہ پڑ جائےگی جہاں بیٹا ڈوبا تھا۔ وہیں زمین پر لیٹ کر ریت کو کلیجے سے لگائےگی اور یاد ہے واسیا ایک گیت گایا کرتا تھا، بس ماں بھی وہی گانا گائےگی۔ گائےگی اور روئےگی۔ ہائے کیسا کیسا روتی ہے۔ کیسا خدا میاں کو برا بھلا کہتی ہے..!،،

''اے لو، وہ آگیا پاولوشا!،، فیدیا بولا۔

پاولوشا پانی سے بھری ہنڈیا ہاتھ میں لئے ہوئے آگ کے قریب آیا۔

''سنا کچھ،، اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''معاملہ کچھ گڑبڑ ہے!،،

''کیا ہوا؟،، کوستیا نے گھبرا کر پوچھا۔

''واسیا کی آواز سنی میں نے!،،

ایک دفعہ کو تو سب لرز گئے۔

''کیا کہہ رہے ہو؟ ابے کیا کہہ رہے ہو تم؟،، کوستیا نے سرگوشی کی۔

''خدا قسم! پانی لینے جھکا ہی تھا کہ کسی نے مجھے پکارا۔ سولہ آنے واسیا کی آواز تھی۔ پانی کی تہہ سے آرہی تھی آواز: 'پاولوشا، اے پاولوشا، یہاں آنا!'، میں نے سنا اور جلدی سے وہاں سے بھاگا۔ مگر پانی نکالنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔،،

''یا خدا رحم! یا خدا، اے پالنے والے رحم!،، بچے جلدی جلدی سینے پر صلیب کا نشان بنا رہے تھے اور خدا کو یاد کررہے تھے۔

''ارے یہ تو اصل میں تجھے جل پری بلا رہی تھی، پاولوشا،، فیدیا نے رائے دی۔

''لو ابھی اسی کی، ارے، اپنے واسیا ہی کی تو بات ہورہی تھی یہاں پر!،،

''یا خدا، شگون اچھا نہیں ہے، بھائیو!،، ایلوشا نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''خیر کوئی بات نہیں۔ چھوڑو!،، پاولوشا فیصلہ کن لہجے میں بولا اور جلدی سے الاؤ کے قریب بیٹھ گیا۔ ''قسمت کے لکھے کو کون بدل سکتا ہے، بھلا؟،،

لڑکے بالکل خاموش تھے۔ ظاہر ہے پاولوشا کے الفاظ نے سب کے ذہنوں پر گہرا اثر کیا تھا۔ سب الاؤ کے گردا گرد جم کر بیٹھ گئے، جیسے سونے کا ارادہ ہو۔

''کیا ہے یہ؟،، اچانک کوستیا نے سر اٹھا کر کچھ سننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

پاولوشا بھی کان لگاکر سننے لگا۔

''ارے یہ تو چہے ہیں، اڑتے ہوئے سیٹی بجا رہے ہیں۔،،

''کدھر کا رخ ہے چہوں کا؟،،

''بہت دور۔ ادھر جارہے ہیں، جہاں کبھی جاڑے نہیں پڑتے!،،

''اچھا، ایسا دیش بھی ہوتا ہے کیا؟،،

''ہاں، ہے کیوں نہیں!،،

''دور ہے کیا؟،،

''ہاں، دور، بہت دور، گرم سمندر کے برابر میں ہے۔،،

کوستیا نے لمبا سانس لےکر آنکھیں بند کرلیں۔

میں کوئی تین گھنٹے سے بچوں کے پاس بیٹھا تھا۔ آخر خدا خدا کرکے چاند نکل آیا، مگر خاصی دیر تک تو میری نظرھی نہیں پڑی اس پر، اور پڑتی بھی کیسے، چھوٹا سا اور زرد سا تو تھا۔ یہ اندھیری رات اب بھی کسی طرح کم خوبصورت نہ تھی۔ مگر بہت سے ستارے، جو کچھ دیر پہلے تک نیل گگن پر چمک رہے تھے، اب بجھے بجھے سے افق کی طرف جھکتے ہوئے زمین کے قریب آچلے تھے۔ چاروں طرف مکمل سناٹا تھا۔ ایسا سناٹا جو عموماً صبح ہونے سے پہلے ماحول پر چھا جاتا ہے۔ ہر چیز صبح سویرے کی گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔ خاموش اور ساکت۔ ہوا میں بھی اب ویسی خوشبو نہیں تھی، اس میں جیسے اچانک خوب نمی آگئی تھی۔ کتنی مختصر ہوتی ہیں موسم

گرما کی یہ خوشگوار راتیں ۔ الاؤ کے شعلوں کے ساتھ ساتھ بچوں کی آوازیں بھی جیسے بجھ سی گئی تھیں، یہاں تک کہ کتے بھی اونگھ رہے تھے ۔ ڈوبتے ستاروں کی مدھم مدھم روشنی میں گھوڑے بھی زمین پر لیٹے نظر آئے ۔ مجھ پر بھی غنودگی طاری ہورہی تھی ۔ جلد ھی میں بھی نیند کی آغوش میں کھو گیا ۔

اچانک چہرے پر صبح کی نکھری ہوئی تازہ ہوا کا جھونکا سا محسوس ہوا تو میں نے آنکھیں کھول دیں ۔ سپیدۂ سحر نمودار ہورہا تھا ۔ افق پر یہاں سے وہاں تک کہیں بھی سرخی نہیں پھیلی تھی، مگر مشرق میں آسمان پر سفیدی سی چمک رہی تھی ۔ اب ارد گرد کی ہر چیز ، دھندلی ھی سہی، مگر نظر آرہی تھی ۔ ہلکا سرمئی آسمان روشن ہو چلا تھا ۔ اور اب زیادہ خنک، زیادہ نیلا لگ رہا تھا ۔ ستارے کبھی ہلکے سے ٹمٹماتے، کبھی نظروں سے اوجھل ہوجاتے ۔ زمین سے بھاپ اٹھ رہی تھی ۔ پتیاں نم ہو گئی تھیں ۔ خاموشی میں یہاں وہاں کچھ آوازیں ابھررہی تھیں، کچھ شور سا پیدا ہوچلا تھا ۔ صبح کی نکھری ہوئی شفاف ہوا کی لہریں زمین پر ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں ۔ نتھری ہوئی ہوا کے ایک جھونکے سے میرے جسم میں خوشگوارسی کپکپی دوڑ گئی ۔ میں نے کروٹ بدلی اور زمین سے اٹھ کر بچوں کے پاس پہنچا ۔ وہ سب بجھے ہوئے الاؤ کی راکھ کے ارد گرد بےخبر سورہے تھے ۔ البتہ پاولوشا مجھے آتے دیکھ کر زمین سے تھوڑا سا اٹھ کر میری طرف دیکھنے لگا ۔

میں نے اس کو سر کا اشارہ کیا ۔ اور خیالوں میں کھویا ہوا سا دریا کی طرف بڑھ گیا ۔ ابھی دو ایک میل ھی گیا ہوں‌گا کہ اچانک ہر طرف — شبنم میں نہائے ہوئے وسیع سرغزار پر ، ہریالی سے لدی ہوئی سامنےوالی پہاڑیوں پر ، گھنے جنگلوں پر ، گرد سے اٹے ہوئے اور دور دور تک پھیلے ہوئے راستے پر ، چمکتی ہوئی جھاڑیوں پر ، تیزی سے چھٹتی ہوئی دھند کی چادر کے پیچھے سے ابھرتے ہوئے شرمائے ہوئے سے دریا پر — غرض ہر چیز پر صبح کی گرم اور لطیف سی روشنی ابھرنے لگی، پہلے ہلکی سی لالی پھیلی، پھر گہری سرخی نے اس کی جگہ لی اور پھر سنہری سنہری لہریں پھیلتی چلی گئیں ۔ ہر چیز انگڑائی لےکر نیند کی آغوش سے نکل آئی ۔ فضا میں لہریں سی اٹھیں، شور مچا، پرندوں اور پیڑپودوں نے گیت گائے اور فضا میں سرگوشیاں ابھرنے لگیں ۔ چاروں طرف بکھری ہوئی شبنم کے موٹے موٹے موتیوں میں ہیرے کی چمک پیدا ہوئی اور رنگ برنگی کرنیں پھوٹنے لگیں ۔ دور سے آتی ہوئی گرجے کے گھنٹے کی آواز، صبح کی خنکی میں نہائی ہوئی صاف ستھری اور نکھری ہوئی آواز نے بڑھ کر میرا خیرمقدم کیا اور اچانک گھوڑوں کا وہ گلہ جو رات گئے تک بیژن سرغزار میں چرتا رہا تھا، دوڑتا ہوا میرے قریب سے گزرتا چلا گیا ۔ گلے کو ہانکنے والے بچے میرے لئے اجنبی نہیں تھے...

چلتے چلتے بڑے دکھی دل سے یہ بھی لکھ دوں کہ اسی سال پاولوشا نہیں رہا ۔ وہ ڈوب کر ختم نہیں ہوا، گھوڑے سے گرکر جان جان آفریں کے سپرد کردی ۔ افسوس بڑا پیارا بچہ تھا!!

دميترى مامين سيبيرياك

ايميليا شكارى

۱۸۸۴ء میں شائع ہونےوالی کہانی ''ایمیلیا شکاری،، کے مصنف دمیتری نارکیسووچ ماسین سیبیریاک اورال میں پیدا ہوئے تھے اور وہیں جنگلوں اور نیچے پہاڑوں کے علاقے میں اپنی زندگی کا بڑا حصہ بسر کیا جہاں زار پیٹر اول (۱۶۷۲ء تا ۱۷۲۵ء) ہی کے عہد میں روسی سوداگروں نے ڈھلے لوہے اور آہن‌سازی کے کارخانے قائم کر لئے تھے۔ ماسین سیبیریاک خود یاد کرتے تھے کہ ''لکڑی کا پرانا گھر اس طرح نگاہوں کے سامنے ہے جیسے ابھی ابھی دیکھا ہو — چوک کی طرف کھلنےوالی اس کی پانچ بڑی کھڑکیاں — اس گھر کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے ایک طرف کی کھڑکیاں یورپ میں کھلتی تھیں اور دوسری طرف کی ایشیا میں...

''میرے والد نے مجھے بتایا کہ 'وہ پہاڑ تو ایشیا ہی میں ہے، اور انھوں نے افق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک پہاڑ کا ہیولا دکھایا۔ 'ہم ٹھیک سرحد پر رہتے ہیں'...،،

مصنف کے والد کارخانے کے پادری اور معمولی حیثیت کے آدمی تھے۔ لیکن انھیں کتابوں سے بےپناہ عشق تھا اور کتابیں خریدنے پر اپنی تنخواہ کا کافی حصہ صرف کر دیتے تھے۔ بیٹے کو کتابوں سے محبت باپ سے ورثے میں ملی۔

ماسین سیبیریاک نے اورال کے سوداگروں اور کارخانوں کے مالکوں اور کسانوں کی زندگیوں کے بارے میں کہانیاں لکھیں۔ ان علاقوں کے کسان کھیتی بھی کرتے تھے اور اس کے ساتھ ہی کانوں اور کارخانوں میں کام بھی کرتے تھے۔ لینن نے لکھا ہے کہ ''اس مصنف کی تخلیقات سے اورال کی مخصوص روزمرہ زندگی کی تصویر ابھرتی ہے...،،

ماسین سیبیریاک نے بچوں کےلئے تقریباً ۱۳۰ تخلیقات تصنیف کیں۔ ان میں سب سے مشہور جانوروں کے بارے میں انتہائی دلچسپ کتاب ''چڑیوں کی کہانیاں ننھی الیونوشکا کے لئے،، اور اس طرح کی کہانیاں ہیں جیسے کہ ''استودیانایا کنارے کی جھونپڑی،،، ''لےپالک،، اور ''ایمیلیا شکاری،، جن میں اورال کے قدرتی مناظر کا اور روسی محنت‌کش انسان کے بلند اخلاقی کردار کا شاعرانہ بیان ہے۔

ماسین سیبیریاک کی وفات ۱۹۱۲ء میں ۶۰ سال کی عمر میں ہوئی۔

۱

دور، بہت دور، کوہ اورال کے شمالی علاقے کے ایک ایسے سنسان اور اجاڑ جنگلی خطے میں، جہاں انسان کا گزر بھی ذرا مشکل ہی تھا، ایک چھوٹاسا گاؤں تیچکی آباد تھا۔ گاؤں کیا تھا بس لے دے کر کل گیارہ گھروندے تھے، بلکہ کہنا چاہئے کہ صرف دس۔ کیونکہ گیارھویں جھونپڑیا تو دوسری جھونپڑیوں سے الگ تھلگ، کافی دور، مانو جنگل سے ملی کھڑی تھی۔ گاؤں کے چاروں طرف سدا بہار، کانٹےدار پیڑوں کی ٹیڑھی ترچھی دیوار سی کھڑی تھی۔ فر اور چیڑ کے درختوں کی پھننگوں کے پیچھے سے کئی پہاڑیاں ابھری نظر آتی تھیں۔ ان پہاڑیوں نے تو جیسے جان بوجھ کر تیچکی گاؤں کے چاروں طرف نیلگوں سرمئی رنگ کی بڑی بڑی فصیلیں سی کھڑی کرکے گاؤں کو باھر کی دنیا سے بالکل ھی کاٹ دیا تھا۔ ان پہاڑیوں میں تیچکی سے سب سے زیادہ قریب کبڑا پہاڑ روچیوا تھا۔ اس کی جھاڑ جھنکاڑ چوٹی، پکے بالوں کی طرح سفیدسی تھی، جو ابرآلود دنوں میں تو سرمئی رنگ کے دھندلے بادلوں میں بالکل کھو جاتی تھی۔ روچیوا پہاڑ سے بہت‌سی شاخوں‌والے چشمے اور ندیاں بہتی نظر آتی تھیں۔ ایسا ھی ایک منچلا چشمہ خوشی سے اچھلتا کودتا تیچکی کی طرف دوڑ رہا تھا۔ گرمی ھو یا سردی، یہ صاف ستھرا، برف جیسا ٹھنڈا چشمہ ہمیشہ تڑپتا چھڑپتا نظر آتا، جیسے آنسو کی بوند۔

تیچکی کے گھروندے اندھادھند بنے ھوئے تھے۔ نہ کوئی نقشہ نہ پلان، جس کا جہاں جی‌چاھا جھونپڑا ڈال لیا۔ دو جھونپڑیاں تو دریا کے کنارے پر بنائی گئی تھیں، ایک پہاڑ کی بل کھائی ھوئی ڈھلان پر کھڑی تھی، باقی گھروندے بھیڑ بکریوں کی طرح دریا کے ساتھ ساتھ بکھرے ھوئے تھے۔ تیچکی میں تو گلی کوچے تک نہ تھے۔ جھونپڑیوں کے درمیان بل کھاتی، زمانے کی ستائی پگڈنڈیاں ضرور دوڑتی نظر آتی تھیں۔ اور سچی بات یہ ھے کہ تیچکی کے باسیوں کو گلی کوچوں کی ضرورت ھی کہاں تھی۔ لو بھلا کاھے میں بیٹھ‌کر وہ سڑکوں پر نکلتے؟ گاؤں بھر میں ایک آدمی کے پاس بھی نہ گاڑی تھی نہ چھکڑا۔ گرمی میں تیچکی گاؤں چاروں طرف سے ناقابل عبور دلدل، کیچڑ اور جنگلی

جھاڑ جھنکاڑ سے گھر جاتا تھا۔ یہاں تک کہ گاؤں تک پہنچنا ناممکن سا ھوجاتا۔ بڑی مشکل سے تنگ جنگلی پگڈنڈیوں کے سہارے پیدل پہنچ جاؤ تو بات الگ ھے۔ ابھی وہ بھی تو ھمیشہ ممکن نہیں تھا۔ بارش طوفان میں تو پہاڑی چشمے اور بھی زیادہ منہ‌زور ھوجاتے۔ بعض دفعہ تو تیچکی کے شکاری تین تین دن، ان منہ‌زور دریاؤں کا پانی کم ھونے کی راہ دیکھا کرتے تھے۔

تیچکی کے سارے دیہاتی پیشہ‌ور شکاری تھے۔ گرمی ھو یا جاڑا، ان کا زیادہ تر وقت جنگل ھی میں گزرتا کیونکہ جنگل بالکل پاس ھی تھا۔ وہ جب بھی جنگل سے آتے تو جھولی بھر کے آتے۔ جاڑے میں بھالو، سمور والے جانور، بھیڑیے اور لومڑیاں شکار کرتے تو موسم خزاں میں گلہریاں مارتے۔ بہار کے موسم میں جنگلی بکریاں ھاتھ لگتیں تو گرمیوں میں طرح طرح کی چڑیوں کا شکار مل جاتا۔ مختصر یہ کہ سال بھر کمرتوڑ محنت کرنا پڑتی۔ ارے صاحب اکثر تو بڑی جان جوکھوں کا کام ھوتا تھا۔

جنگل سے ملی ھوئی جھونپڑی تھی نا، بوڑھا شکاری ایمیلیا اسی میں رھتا تھا۔ وہ بس دو تھے۔ خود ایمیلیا اور اس کا چھوٹا سا پوتا گریشوتکا۔ ایمیلیا کی جھونپڑی زمین کو لگ چکی تھی، لے دے‌کر بس ایک کھڑکی تھی جس سے خدائے پاک و برتر کی دنیا نظر آتی تھی! جھونپڑی کی چھت تو نجانے کب سے سڑچکی تھی۔ چمنی کی جگہ تو بس چند ٹوٹی پھوٹی، گلی ھوئی اینٹیں ھی رہ گئی تھیں۔ ایمیلیا کی جھونپڑی میں تو نہ باڑھ تھی نہ گودام۔ کچھ بھی تو نہیں بچا تھا۔ البتہ موٹے بھدے لٹھوں سے بنی ھوئی دھلیز کے پاس رات رات بھر بھوکا لیسکو روتا رھتا تھا۔ کیا کتا تھا لیسکو۔ تیچکی کے بہترین شکاری کتوں میں سے ایک تھا وہ۔ شکار کی ھر مہم سے تین دن پہلے ایمیلیا، اس آفت مارے، دکھیا کتے کو فاقہ دینا شروع کردیتا۔ تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ مستعدی سے شکار ڈھونڈے اور ھر قسم کے جانور کا سراغ لگا سکے۔

”دادا... اے دادا!“، ننھے گریشوتکا نے ایک شام کو بمشکل دادا کو آواز دی۔ ”اب تو بارہ سنگھے اپنے بچوں کے ساتھ نکل آئے ھوں‌گے جنگل میں؟.. ھیں نا دادا؟“

”ھاں گریشوتکا، بچوں کے ساتھ“، ایمیلیا نے چھال کے نئے جوتے بنتے ھوئے جواب دیا۔

”دادا جی بارہ سنگھے کا بچہ مار لوگے نا... ھیں، دادا؟“

”ھاں، ھاں ضرور مارلیں‌گے! اب تو گرمی بھی خوب پڑرھی ھے۔ بارہ سنگھے اور ان کے بچے، گئو مکھیوں سے بچنے کے لئے، اکثر جھاڑ جھنکاڑ میں چھپتے پھریں‌گے۔ بس بیٹے میں جھٹ تیرے لئے بارہ سنگھے کا بچہ مار لوں‌گا۔“

بچے نے جواب نہیں دیا، بس ایک گہرا سانس لے‌کر رہ گیا۔ گریشوتکا بس یہی کوئی چھ سال کا ھوگا۔ بچہ پچھلے دو مہینے سے ھرن کی گرم کھال اوڑھے لکڑی کے چوڑے سے بنچ پر پڑا ھوا تھا۔ بہار کا موسم تھا، برف پگھل رھی تھی کہ بچے کو ٹھنڈ لگ گئی۔ وہ دن اور آج کا دن اس کا جی براھی چل رھا تھا۔ اس کا سانولا سلونا مکھڑا ستا

گیا تھا، رنگ زرد پڑ گیا تھا، آنکھیں یہ بڑی بڑی نکل آئی تھیں، ناک ست کے رہ گئی تھی۔ ایمیلیا دیکھ رہا تھا کہ بچہ کیسے دن پر دن، بلکہ پل پل گھل رہا ہے، مگر سمجھ میں نہیں آتا تھا اس دکھ سے بچے کو نجات دلائے تو کیوں کر۔ اس نے پوتے کو جڑی بوٹیاں بھی پکا کر کھلائیں، دو دفعہ حمام میں بھی لے گیا۔ مگر مریض کی حالت ذرا بھی نہ سدھری۔ بچے کے منہ میں کھیل بھی اڑ کر نہ جاتی۔ بس کالی روٹی کا ذراسا ٹکڑا چبالیا تو چبالیا اور کچھ بھی نہ کھاتا۔ بہار کے موسم میں ایمیلیا نے بکری کے میمنوں کو نمک لگا کر سکھا لیا تھا۔ اس کے ٹکڑے بھی بچے ہوئے تھے۔ مگر گریشوتکا تو نظر اٹھا کر اسے دیکھنے کا بھی روادار نہ تھا۔

"چلو جو اس کا جی چاہے، وہی کھالے... بارہ سنگھے کا بچہ ھی سہی!"، بڈھے ایمیلیا نے جوتے میں چھال کا آخری فیتہ لگاتے ہوئے سوچا۔ "اب تو بارہ سنگھے کا بچہ مار ھی لوں!"

ایمیلیا کی عمر یہی کوئی ستر ایک برس کی ہوگی۔ بال سفید بھک، کمر جھکی ہوئی، دبلا پتلا اور ھاتھ لمبے لمبے۔ ایمیلیا کے ھاتھوں کی انگلیاں تو اب سوکھ کر بالکل سخت ہوچکی تھیں، مانو سوکھے درخت کی ٹہنیاں ہوں۔

مگر وہ آج بھی مزے میں چل پھر لیتا تھا۔ اور شکار بھی ھاتھ لگ جاتا تھا، بس ان آنکھوں نے بڈھے کو مجبور اور بے بس کردیا تھا۔ خاص کر جاڑے میں جب برف جم کر جگمگانے لگتی تھی اور ایسی چمک پیدا ہوجاتی تھی جیسے ہرطرف ھیرے کی کنیاں پڑی دمک رہی ہوں، تب بوڑھے کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔ ایمیلیا کی آنکھوں کا یہ حال ہونے ھی کی وجہ سے تو چمنی مرمت سے محروم کھڑی تھی، چھت گل گئی تھی مگر مرمت ممکن نہ تھی، اور خود ایمیلیا کا یہ حال ہوگیا تھا کہ جب اور سب دیہاتی شکار کے لئے جنگل جاتے تو وہ اکثر ھاتھ پر ھاتھ دھرے کٹیا میں پڑا رہتا۔

اب تو بڑے میاں کو آرام کی ضرورت تھی۔ گرم گرم چولہے کے برابر مزے میں لیٹے، بیٹھے رہیں اور بس۔ مگر گھر گھرستی کا بوجھ اٹھانے والا اور تھا ھی کون۔ اوپر سے گریشوتکا کی ذمہ داری کا بار الگ ان کے کندھوں پر آن پڑا تھا۔ اس کی دیکھ بھال بھی تو لازمی تھی۔ گریشوتکا کا باپ تین سال پہلے تپ سے مر گیا تھا۔ اور ماں کو بھیڑیے چبا گئے تھے۔ جاڑے کی شام تھی۔ بچاری ننھے سے گریشوتکا کو گود میں اٹھائے، جنگل سے اپنی کٹیا کی طرف آرھی تھی کہ اچانک یہ حادثہ ہوا۔ بچہ بھی نجانے کیسے، معجزے سے بس بچ گیا تھا۔ ادھر بھیڑیے ماں کی ٹانگیں چبا رہے تھے، ادھر دکھیاری ماں نے بچے کو پہلو تلے چھپا رکھا تھا۔ مختصر یہ کہ گریشوتکا کی جان بچ گئی تھی۔

بڈھے دادا نے بچے کی ذمہ داری سنبھال لی۔ اور لو اوپر سے بیماری نے آن دبوچا۔ مصیبت تنہا نہیں آتی میرے بھائی...

۲

جون کی آخری تاریخیں تھیں۔ تیچکی میں سب سے زیادہ تپش انھیں دنوں میں ہوتی ہے۔ بڈھے اور بچے گھروں میں بند بیٹھے تھے۔ شکاری ایک عرصے سے بارہسنگھے اور ہرن کی تلاش میں جنگل میں چھپے ہوئے تھے۔ ایمیلیا کی کٹیا میں مصیبت کا مارا لیسکو تین دن سے فاقے کی وجہ سے چلا رہا تھا مانو جاڑے کا بھیڑیا ہو۔

”معلوم ہوتا ہے بڈھا ایمیلیا شکار پر جانے کی تیاری کررہا ہے،، گاؤں کی بوڑھی عورتوں نے ایک دوسرے کو اطلاع دی۔

بات ٹھیک تھی۔ بہت جلد ایمیلیا چقماق کی بندوق ہاتھ میں تھامے ہوئے کٹیا سے نکلا، لیسکو کو ساتھ لیا اور جنگل کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس کے پاؤں میں نئے چھال کے جوتے تھے، کندھے پر روٹی کا جھولا تھا، بدن پر پھٹا پرانا کفتان تھا اور سر پر ہرن کی کھال کی گرم ٹوپی۔ بڑے میاں نے برسوں سے ہیٹ پہننا چھوڑ دیا تھا۔ وہ گرمی جاڑے ہرن کی کھال کی ٹوپی پہنے رہتا، جو اس کے گنجے سر کو جاڑوں کی سردی اور ٹھٹھرن سے بھی بچاتی اور گرمی کی تپش سے بھی محفوظ رکھتی۔

”لے بھئی گریشوتکا، میں چلا۔ میرے پیچھے بالکل ٹھیک ہوجانا،، ایمیلیا نے پوتے سے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔ ”جب تک میں بارہ سنگھے کا بچہ مارکر لاؤں، تب تک میرے پیچھے بڈھی مالانیا تیری دیکھ بھال کرےگی۔،،

”بارہ سنگھے کا بچہ لاؤگے... دادا؟،،

”ضرور لاؤں گا، بیٹے!،،

”پیلاوالا؟،،

”ہاں پیلا والا!،،

”تو پھر جاؤ، میں تمہارا انتظار کروں گا۔ دیکھو دادا گولی چلاؤگے تو ذرا دھیان سے چلانا، نشانہ خطا نہ ہوجائے کہیں!...،،

ایمیلیا تو بہت دن سے بارہ سنگھوں کے شکار پر جانا چاہتا تھا۔ مگر بس بچے کو تنہا چھوڑنے کے خیال سے دل دکھتا تھا۔ مگر آج اس کی طبیعت کچھ بہتر معلوم ہوتی تھی۔ سو بڑے میاں نے سوچا قسمت آزما ہی لیں۔ اور پھر بوڑھی مالانیا بھی آتے جاتے جھانک لےگی۔ ارے کچھ بھی ہو کٹیا میں اکیلے پڑے رہنے سے تو بہتر ہی ہوگا۔

جنگل تو ایمیلیا کے لئے ایسا تھا جیسے گھر۔ لو بھلا وہ اس جنگل کو نہ جانتا تو کون جانتا! زندگی بھر سے تو وہ تھا اور جنگل تھا۔ بندوق تھی اور کتا تھا۔ جنگل کی ہر پگڈنڈی، ہر نشان، مختصر یہ کہ چاروں طرف سو ورست کی ہر چیز اسے ازبر تھی۔

اور آج کل جون کی آخری تاریخوں میں تو جنگل کی شان ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ گھاس میں بڑی نفاست سے جگہ جگہ پھول سر اٹھائے تھے اور فضا میں سرسبز گھاس کی جان‌لیوا خوشبو تھی۔ آسمان پر دمکتے ہوئے، موسم گرما کے نرم سورج کی کرنوں نے جنگل، گھاس اور نرسل کی جھاڑیوں میں کل‌کل کرتے ہوئے دریا کو اور دور ابھرتے ہوئے پہاڑوں کو سنہری روشنی سے جگمگا دیا تھا۔

واقعی چاروں طرف منظر لاجواب تھا۔ لاجواب اور دلفریب۔ ایمیلیا تھوڑی تھوڑی دیر پر رک کر چاروں طرف نگاہ ڈالتا اور اس کا جی خوش ہوجاتا۔

بڈھا شکاری بڑے بڑے پتھروں اور نوکیلی کگروں سے بچنے کی کوشش میں، سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی پر چل رہا تھا جو اسے مسلسل پہاڑ کی چوٹی کی طرف لے جارہی تھی۔ گھنے جنگل جابجا کٹے پڑے تھے، اور پگڈنڈی کے قریب سفیدے کے ننھے ننھے پودے اور خوشبودار زرد پھولوں والی ھنی‌سکل کی جھاڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ ایش کی شاخیں اور ڈالیاں، ایک ھرے خیمے کی شکل میں ڈھیر تھیں۔ یہاں وھاں چیڑ کے نوخیز درختوں کے گھنے گچھے بکھرے ہوئے تھے اور ان کی جھاڑوں جیسی شاخیں پگڈنڈی کے دونوں طرف سربلند تھیں۔ چیڑ کی پنجے نما جھاڑ جھنکاڑ ڈالیں من‌چلے انداز میں سرسرا رہی تھیں۔ پہاڑ کی آدھی چڑھائی پر پہنچ کر دور ابھرے ہوئے پہاڑ اور تیچکی گاؤں نظر آنے لگے۔ گاؤں کا منظر گہری پہاڑی وادی کی تہہ میں چھپ سا گیا تھا۔ اور کسانوں کی جھونپڑیاں دور سے کالے دھبوں جیسی لگ رہی تھیں۔ سورج کی چمک سے اپنے ہاتھ سے آنکھوں پر اوٹ کئے بڈھا شکاری بڑی دیر تک اپنی جھونپڑی کو دیکھتا، اور پوتے کے بارے میں سوچتا رہا۔

پہاڑی سے اترنے کے بعد ایمیلیا اور لیسکو نے پگڈنڈی کو خیرباد کہا اور چیڑ کے گھنے جنگل کی طرف مڑگئے۔ ایمیلیا کتے سے بولا: ”لے بھئی لیسکو، ڈھونڈ شکار ...“

لیسکو کو ایک دفعہ سے دوسری دفعہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے اپنے فرض کا پورا احساس تھا۔ اس نے اپنی نوکیلی تھوتھنی جھکائی اور دوڑتا ہوا سرسبز اور گنجان جنگل میں گھس گیا۔ ذرا کی ذرا اس کی پیٹھ کے پیلے پیلے دھبے سے نظر آئے اور پھر وہ نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔

شکار شروع ہوچکا تھا۔

چیڑ کے بڑے بڑے درخت، اپنی سوئی جیسی تیز دھاروالی شاخیں پھیلائے آسمان سے باتیں کررہے تھے۔ گھنی ڈالیاں ایک دوسرے سے اس طرح گتھی ہوئی تھیں کہ شکاری کے سر کے اوپر ان کی ایسی تاریک کمان‌سی بن گئی تھی جس سے سورج کی شعاعوں کا گزر بھی ممکن نہ ہو۔ بس یہاں وھاں سورج کی مگن کرنیں جھانک جھانک کر پیلی کائی پر سنہری چمک بکھیر رہی تھیں یا فرن کے چوڑے چوڑے پتوں میں جھلملاہٹ سی

پیدا کررہی تھیں - ایسے گھنے جنگل میں گھاس بھلا کہاں اگتی ہے - اس لئے ایمیلیا زرد زرد نرم کائی پر چل رہا تھا - مانو قالین پر گھوم رہا ہو -

شکاری نے اس جنگل میں کئی گھنٹے لگائے - لیسکو تو غائب ہو گیا تھا - بس کبھی کبھی قدموں تلے کوئی شاخ چرچرا اٹھتی، یا کوئی رنگ برنگا ھدھد اچانک ڈال پر سے ہوا میں اڑجاتا - ایمیلیا چوکنا ہوکر بڑے غور سے چاروں طرف نظر ڈال رہا تھا: کہیں جانور کے پاؤں کے نشان یا بارہ سنگھے کے سینگوں سے ٹوٹی ہوئی کوئی شاخ تو نظر نہیں آرہی، کائی پر کہیں کسی دو شاخے کھر نے ''مہر'' تو نہیں لگائی، ٹیلوں پر اگی ہوئی گھاس پر کسی چارپائے نے منہ تو نہیں مارا؟ رفتہ رفتہ اندھیرا پھیلنے لگا - بڈھا شکاری تھک چکا تھا، رات گزارنے کا ٹھکانا بھی کرنا تھا - ''شاید دوسرے شکاریوں نے جانوروں کو چونکا دیا''، ایمیلیا نے سوچا - اچانک لیسکو کے بھونکنے کی دبی دبی سی آواز سنائی دی اور سامنے کی شاخوں میں ہلکی سی جنبش ہوئی - ایمیلیا نے آہستہ سے چیڑ کے تنے سے ٹیک لگائی اور تاک میں بیٹھ گیا -

یقیناً بارہ‌سنگھا ہی تھا - دس سینگوں‌والا، اصل نسل، حسین بارہ‌سنگھا - جنگل کے باسیوں میں سب سے شاندار جانور - اس نے اپنے شاخ‌دار سینگوں کو پیٹھ کی طرف موڑا اور چوکنا ہوکر جیسے کچھ سننے لگا - ساتھ ہی ہوا کو سونگھتا جارہا تھا کہ اگلے ہی لمحے سرسبز گھنے جنگل میں بجلی کی سی تیزی سے غائب ہو جائے -

بوڑھے ایمیلیا نے بارہ سنگھے کو دیکھا ضرور، مگر جانور بہت دور تھا - گولی چلانا ممکن نہ تھا - لیسکو گھنے جنگل میں دبکا ہوا، سانس روکے، گولی دغنے کا منتظر تھا - وہ بارہ‌سنگھے کے قدموں کی چاپ سن‌رہا تھا - اس کی خوشبو ناک میں قیامت ڈھا رہی تھی...

اچانک گولی دغی اور بارہ‌سنگھا، بندوق کی گولی جیسی تیزی سے آگے کھسک گیا! ایمیلیا کا نشانہ خطا ہوگیا تھا - لیسکو پل پل بڑھتی بھوک سے بےتاب تھا - بچارے کتے کی ناک میں بارہ سنگھے کے بھنتے ہوئے گوشت کی خوشبو بسی ہوئی تھی، نظر کے سامنے بھوک کو بےقرار کرنےوالی ہڈی ابھر رہی تھی جو مالک اس کی طرف پھینکتا - اور لو اب رات کو یونہی بھوکے پیٹ سونا پڑےگا - کیا بکواس ہے...

''چلو گھومنے دو نامراد کو''، رات بتانے کےلئے سو سال پرانے گھنے چیڑ کے نیچے الاؤ کے قریب بیٹھتے ہوئے ایمیلیا جیسے دل کی بات زبان پر لےآیا - ''ہمیں تو بارہ سنگھے کا بچہ مارنا ہے بھائی... سن رہے ہو، لیسکو؟''

کتے نے شکایت بھرے انداز میں دم ہلائی اور اپنی نوکیلی تھوتھنی اگلے پنجوں پر ٹکا دی - آج قسمت میں بس روٹی کا ایک سوکھا سارا ٹکڑا ہی تھا - وہ بھی مالک کی مہربانی تھی کہ اس کی طرف پھینک دیا -

۳

ایمیلیا تین دن تک جنگل میں بھٹکتا رہا مگر بےسود۔ کوئی بارہ سنگھا بچے کے ساتھ نظر ہی نہ آیا۔ بڈھا شکاری محسوس کررہا تھا کہ اس کی طاقت جواب دے رہی ہے۔ مگر وہ خالی ہاتھ گھر لوٹنے کو کسی صورت تیار نہ تھا۔ لیسکو نے جیسے تیسے دو چھوٹے چھوٹے خرگوش سار لئے تھے۔ پھر بھی وہ بھوک سے جیسے سوکھ گیا تھا اور دل بہت اداس تھا۔

تیسری رات بھی الاؤ کے پاس جنگل ہی میں گزارنی پڑی مگر بوڑھا ایمیلیا خواب میں بھی بارہسنگھے کا زرد چتلیوںوالا بچہ ہی دیکھتا رہا کہ ایسے ہی بارہ سنگھے کے بچے کی فرمائش تو گریشوتکا نے کی تھی۔ بڑے میاں رات گئے تک اپنے شکار کا سراغ لگاتے رہے، نشانہ باندھتے رہے، مگر بارہ سنگھا ہر دفعہ شکاری کی ناک کے نیچے سے نکل بھاگا۔ شاید لیسکو بھی خواب میں بارہ سنگھوں ہی سے زور آزمائی کررہا تھا۔ جبھی تو بار بار سوتے میں ککیا ککیا کر دھنسی دھنسی آواز میں بھونک رہا تھا۔

البتہ چوتھے دن جب شکاری اور کتا دونوں بالکل بےدم ہوچکے تھے، تو اچانک محض اتفاق سے انہیں بارہ سنگھے اور اس کے بچے کے کھروں کے نشان نظر آئے۔ یہ پہاڑ کا وہ حصہ تھا جہاں پہاڑی ڈھلانوں پر چیڑ کے گھنے جنگل پھیلے ہوئے تھے۔ لیسکو نے جھٹ پٹ وہ جگہ ڈھونڈ نکالی جہاں بارہ سنگھے نے رات بتائی تھی۔ بہت جلد وہ سونگھ سونگھ کر گھاس میں چھپے ہوئے کھروں کے نشانوں کا سراغ بھی پا گیا۔

''مادہ بارہسنگھا اور اس کا بچہ ہیں،، ایمیلیا نے گھاس پر چھوٹے بڑے کھروں کے نشانوں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ ''آج صبح یہیں تھے... لیسکو سراغ تو لگا بیٹا!..،،

اس دن بلا کی امس تھی۔ سورج کی تپش بڑی بےدردی سے ہر کھڑے بیٹھے کو جھلسا رہی تھی۔ لیسکو کی زبان لٹکی ہوئی تھی اور وہ ایک ایک جھاڑی، گھاس کے ایک ایک تنکے کو سونگھ کر سراغ لگا رہا تھا۔ ایمیلیا کےلئے اب قدم اٹھانا بھی مشکل تھا۔ اچانک تڑاخ کی جانی پہچانی آواز گونجی اور سرسراہٹ سی ہوئی۔ لیسکو نے گھاس پر گرکر دم سادھ لیا۔ ایمیلیا کے کانوں میں پوتے کے الفاظ گونج رہے تھے: ''دادا بارہ سنگھے کا بچہ مارو گے نا؟.. دیکھو دادا سنہرا والا لانا!،، یہ رہی مادہ... واہ کیا بڑھیا جانور ہے۔ وہ جنگل کے سرے پر کھڑی خوفزدہ نظروں سے ایمیلیا کو تک رہی تھی۔ بھنبھناتے ہوئے کیڑوں مکوڑوں کا جھنڈ کا جھنڈ بارہسنگھے کے سر پر منڈلا رہا تھا، یہاں تک کہ جانور دو ایک بار سر جھٹکنے پر مجبور ہوگیا۔

''نہیں، تم دھوکا نہیں دے سکتیں مجھے!،، ایمیلیا نے سوچا اور دبے پاؤں کمین گاہ سے کھسکنے لگا۔

بارہسنگھے کو شکاری کی موجودگی کا پورا احساس تھا۔ مگر وہ بڑی بےجگری سے اس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لےرہی تھی۔

”اوہو، یہ سادہ سمجھے اپنے بچے سے دور رکھنے کے چکر میں ہے،، ایمیلیا نے شکار کی طرف کھسکتے ہوئے سوچا۔

مگر جب بڈھے نے بارہ سنگھے پر شست باندھنی چاھی تو جانور چوکنے انداز میں دوڑکر چند قدم دور جا کھڑا ہوا۔ ایمیلیا نے ایک دفعہ پھر بندوق تانی، ایک دفعہ پھر دبے پاؤں قریب آیا اور جیسےھی گولی چلانا چاھی، بارہسنگھا ایک دفعہ پھر لپک کر چھپ گیا۔

”بچے کو تم چھوڑوگے نہیں،، سرگوشی میں کہتے ہوئے ایمیلیا کئی گھنٹے تک جانور کا سراغ لگاتا رہا۔

انسان اور جانور کی یہ جنگ شام تک جاری رہی۔ نیک بخت جانور نے دسیوں دفعہ جان خطرے میں ڈالی مگر شکاری کو اپنے بچے کے ٹھکانے سے دور سے دور تر ھٹانے کی سہم جاری رکھی۔ بڈھا شکاری اپنے شکار کی همت پر جھنجھلا بھی رہا تھا، حیران بھی تھا۔ دیکھو نا آخر شکاری سے بچ کر کہاں جاسکتی تھی وہ۔ نجانے کتنی دفعہ ایمیلیا کو اپنے شکار کے ساتھ ساتھ جانور کی ماں کو بھی گولی کا نشانہ بنانا پڑا تھا جو اپنی زندگی کو قربان کر دیتی تھی! لیسکو سائے کی طرح مالک کے ساتھ تھا۔ اور آخر جب شکار شکاری کی نظروں سے بالکل ھی اوجھل ھوگیا تو وفادار کتا اپنی گرم گرم ناک اس سے رگڑنے لگا۔

بڑے میاں نے چوکنے انداز میں چاروں طرف دیکھا اور گھات میں بیٹھ گئے۔ ان سے کوئی بیس گز کی دوری پر خوشبودار زرد پھولوںوالی بیل کی ڈالیوں تلے وہ کھڑا تھا۔ وھی سنہرا بارہسنگھے کا بچہ جس کی تلاش میں شکاری پچھلے تین دن سے سرگرداں تھا۔ واہ، کیا لاجواب بچہ تھا! مشکل سے چند ھفتے کا ھوگا۔ سنہرے سنہرے روئیں اور پتلی ٹانگیں۔ لال رنگ کا سر اور تھوتھنی پیچھے کی طرف سوڑے مزے سے کھڑا تھا۔ اونچی ٹہنی تک پہنچنے کی کوشش میں اس نے اپنی نازک سی گردن آگے بڑھائی۔

شکاری نے دھڑکتے دل سے اپنی بندوق سنبھالی اور ننھی سی بےسہارا جان کی طرف نشانہ باندھا...

ایک لمحہ اور، اور ننھا بارہ سنگھے کا بچہ موت سے پہلے کی دل خراش چیخ مارتا ہوا، بےسدھ ھوکر زمین پر آ گرتا۔ لیکن عین اسی لمحے بوڑھے شکاری کو خیال آیا کہ ننھے بارہ سنگھے کی ماں نے کس بےجگری سے اپنے جگر کے ٹکڑے کو بچانے کی جدوجہد کی تھی۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ خود اس کے گریشوتکا کی ماں نے کس طرح جان دےکر اپنے لال کو بھیڑیوں سے بچایا تھا۔ بوڑھے ایمیلیا کا کلیجہ جیسے کسی نے مسل دیا۔

بندوق کی نال نیچے جھک گئی ۔ بارہ‌سنگھے کا بچہ اب بھی اسی طرح ھری ھری ڈالیوں کے پاس ڈول رہا تھا ۔ کبھی ڈال کی پتیوں پر منہ مارتا، کبھی پیڑوں میں سرسراتی ھوئی ھوا کو سننے لگتا ۔ ایمیلیا جلدی سے گھات سے نکلا اور آھستہ سے سیٹی بجائی ۔ ننھا سا شکار بجلی کی سی تیزی سے شاخوں کی اوٹ میں چھپ گیا ۔

’’افوہ رے ننھے شرارے!..،، بڑے میاں کے چہرے پر کھوئی کھوئی سی مسکراھٹ پھیل گئی ۔ ’’نظر پڑنے کی دیر تھی، کیسا گولی کی طرح شائیں سے بھاگا ۔ اے لیسکو... ھمارے ننھے بارہ سنگھے کی تیزی دیکھی تو نے؟ ارے اس بھگوڑے کو ابھی اور جی لینے دو... واہ کیسا شاندار ھے نامراد!..،،

بڑے میاں دیر تک وھیں کھڑے ننھے بھگوڑے کے بارے میں سوچتے اور مسکراتے رھے ۔

اگلے دن بوڑھا شکاری اپنی جھونپڑی لوٹ آیا ۔

’’اے دادا... بارہ سنگھے کا بچہ لائے نا؟،، گریشوتکا نے آتے ھی پوچھا ۔ وہ تین دن سے برابر بڑی بےچینی سے دادا کی راہ دیکھ رہا تھا ۔

’’نہیں گریشوتکا... دیکھا تو ضرور...،،

’’سنہرا تھا؟،،

’’خود سنہرا اور تھوتھنی کالی، ڈال کے نیچے کھڑا پتیاں چبا رہا تھا... میں نے نشانہ باندھا... ،،

’’اور گولی داغ دی؟،،

’’نہیں گریشوتکا ۔ ترس آگیا، ننھے سے نامراد بارہ سنگھے کے بچے پر، اس کی ماں پر ۔ ادھر میں نے سیٹی بجائی، ادھر وہ ننھی سی جان سن سے جنگل میں جاچھپا ۔ بس پل بھر کو نظر آیا اور پھر گولی کی طرح سن سے یہ جا اور وہ جا!..،،

بڑے میاں دیر تک پوتے کو بتاتے رھے کہ کیسے تین دن تک انھوں نے جنگل جنگل بارہ‌سنگھے کا بچہ ڈھونڈا، کیسے وہ اچانک ھی سامنے آیا اور کیسے سامنے سے بھاگ گیا ۔ بچہ سنتا رہا اور بڈھے دادا کے ساتھ خوش ھو ھوکر مسکراتا رہا ۔

’’ارے ھاں بیٹے ۔ میں تیرے لئے جنگلی تیتر بھی تو لایا ھوں،، ایمیلیا نے بارہ سنگھے کے بچے کی داستان ختم کرتے ھوئے کہا ۔ ’’اسے تو بہرحال بھیڑیے کھا ھی جاتے!،،

تیتر صاف کرکے ھنڈیا میں ڈال دیا گیا ۔ بیمار بچے نے خوشی خوشی تیتر کا شوربہ پیا اور نیند میں ڈوبتے ڈوبتے بھی کئی دفعہ بڑے میاں سے پوچھا :

’’تو وہ بھاگ گیا، وھی بارہ‌سنگھے کا بچہ؟،،

’’بھاگ گیا گریشوتکا!،،

’’سنہرا تھا؟،،

''بالکل سنہرا ۔ بس تھوتھنی کالی تھی ۔ اور کھر کالے تھے ۔ ،، دیکھتے دیکھتے بچہ سوگیا ۔ مگر رات بھر خواب میں ایک چھوٹے سے سنہرے بارہسنگھے کے بچے کو دیکھتا رہا جو ماں کے ساتھ خوشی خوشی جنگل میں گھوم رہا ہے ۔ بڑے میاں تنور کے اوپروالے مچان پر سو رہے تھے ۔ وہ بھی رات بھر نیند میں مسکراتے رہے ۔

نکولائی تیلیشوف

اپنے گھر

نکولائی دمیتریئیوچ تیلیشوف نے بڑی لمبی عمر پائی۔ ان کی پیدائش، روس میں کسان غلامی کے دستور کے ختم کئے جانے کے صرف ۶ سال بعد، ۱۸۶۷ء میں اور ان کی وفات ۱۹۵۷ء میں یعنی عظیم اکتوبر انقلاب کے ۴۰ سال بعد ہوئی۔

جوانی میں انھوں نے روشن خیالی کی ترویج کا کام انجام دیا، بچوں کےلئے کہانیوں اور نظموں کے مجموعے شائع کئے اور ماسکو کے نواح میں غیرمذھبی تعلیم کےلئے اسکول (جمنازیم) قائم کیا۔ ۱۸۹۴ء میں انھوں نے آنتون چیخوف کے مشورے پر، عوام کی زندگی سے بہتر واقفیت کے خیال سے، سائبیریا کا سفر کیا۔

اسی زمانے میں زار شاھی حکومت نے سائبیریائی علاقے کو آباد کرنے کےلئے روس کے یورپی حصے کے غریب کسانوں کو وھاں منتقل کیاتھا۔ اس وقت اورال کے آگے ریلوے لائن تقریباً تھی ھی نہیں۔ کسان اپنے بال بچوں سمیت باربرداری کے گھوڑوں پر گئے۔ اس طویل سفر میں وہ بھوکے رھے، بیمار پڑے، بہت سے مر گئے، بہتوں کے بچے مرگئے۔ تیلیشوف نے وسط سائبیریا میں بےگھر بے سہارا بچوں سے بھری ہوئی بارکیں دیکھیں۔ سفر سے واپس آکر انھوں نے لکھا کہ ''ان بچوں کے والدین کچھ تو مر گئے اور کچھ نے، باقی خاندان کو مفلسی اور فاقوں سے بچانے کی خاطر ان بچوں کو خیرات خانوں میں دے دیا جو ان کے خیال میں اتنے بیمار تھے کہ ان کے بچنے کی امید نہ تھی۔ انھیں توقع تھی کہ یہ مرجائیں گے اور ان کے پاس اب نہ تاب تھی نہ روپیہ۔ اس لئے وہ ان بچوں کے بغیر ھی آگے چلے گئے، یہ سمجھ کر کہ وہ تو مرے برابر ھیں۔ ان بچوں میں سے جنھیں یوں چھوڑ دیا گیا تھا، زیادہ تر تو ظاھر ھے کہ صحت‌مند نہیں ہوئے لیکن ایسے بھی اتفاقات ہوئے جب بچہ تندرست ھو گیا اور ''خدائی بچوں،، کی صف میں شامل ھو گیا۔،،

بچوں کے لئے تیلیشوف کی بہترین کہانیاں انھیں اس طرح منتقل کئے جانےوالے غمزدہ بچوں کے درویشانہ مقدر کے بارے میں ھیں۔ ماں باپ کے چھوڑے ہوئے بیمار نکولکا کے بارے میں، جو لاوارث رہ گیا تھا، تیلیشوف نے کہانی لکھی جس کا عنوان ھے ''محتاج،،۔ بوڑھا برخاست شدہ سپاھی میترچ بدنصیب بچوں پر رحم کھاکر کس طرح اپنے پیسوں سے ان کے لئے نئے سال کا تہوار مناتا ھے اس کا بیان ''میترچ کا نئے سال کا پیڑ،، نامی کہانی میں ھے۔ افسانہ ''اپنے گھر،، میں، جو ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا تھا، ایک ایسے بچے کا ذکر ھے جو اپنے ماں باپ سے بچھڑ گیا ھے اور اپنے آبائی گاؤں واپس پہنچنے کی کوشش کرتا ھے۔

۱

گرمیوں کی ایک نکھری ہوئی رات تھی۔ چاند بڑے سکون اور مسرت سے چمک رہا تھا۔ اس نے اپنی روپہلی چاندنی سے سڑکوں اور میدانوں کو لبریز کر دیا تھا۔ اور اس کی کرنوں نے جنگل کو منور کردیا تھا۔ دریا میں سونا سا گھل گیا تھا۔ یہ تھی وہ رات جب الجھے، بکھرے بالوں اور زرد چہرےوالے گیارہ سالہ سیمکا نے چوری چوری مہاجرین کی بارک کے پھاٹک سے باہر قدم نکالا۔ چوکنا ہوکر چاروں طرف نظر ڈالی، سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور اچانک اپنی تمام‌تر طاقت سے میدان کی طرف بھاگ نکلا جہاں سے ''روس‌والا،، راستہ شروع ہوتا تھا۔ کہیں کوئی تعاقب تو نہیں کررہا، لڑکا اس ڈر سے بار بار پلٹ‌کر دیکھ رہا تھا۔ نہیں، اس کے پیچھے کوئی بھاگتا نظر نہیں آیا، اور وہ کسی رکاوٹ پریشانی کے بغیر پہلے میدان کے سرے تک اور پھر بڑی سڑک تک پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ‌کر بچہ ذرا کی ذرا رکا، کچھ سوچا اور پھر آہستہ قدموں سے سڑک کے کنارے کنارے آگے بڑھتا چلا گیا۔

سیمکا ان بے‌گھر، بےآسرا بچوں میں سے ایک تھا جو وطن سے ہجرت کے بعد یتیم ہوجاتے ہیں۔ اس کے ماں باپ راستے ہی میں ٹائفس کا شکار ہوکر مر چکے تھے۔ سیمکا وطن سے دور، بہت دور، اجنبی زمین پر، اجنبی لوگوں کے درمیان بالکل اکیلا رہ گیا تھا۔ اسے آج بھی وطن یاد تھا، سفید پتھر کا گرجا گھر، پون چکیاں، ازیوپکا ندی، جہاں وہ اپنے سنگی ساتھیوں کے ساتھ مزے میں تیرتا اور نہاتا تھا۔ اور اس کا گاؤں جسے لوگ باگ بیلوئے کے نام سے یاد کرتے تھے۔ مگر کہاں تھا اس کا وطن، اس کا گاؤں، اس کی ازیوپکا ندی... یہ سب اس کےلئے اسی طرح پراسرار بن گئے تھے جس طرح خود یہ جگہ پراسرار تھی جس پر اس وقت وہ کھڑا تھا۔ بس ایک بات یاد تھی اسے کہ وہ ٹھیک اسی سڑک سے یہاں آئے تھے۔ اسے خوب یاد تھا کہ اس سڑک تک پہنچنے سے پہلے انھوں نے ایک چوڑا سا دریا پار کیا تھا، اس سے پہلے بڑی دیر تک اسٹیمر میں سفر کیا تھا، پھر ریل گاڑی میں بیٹھے تھے۔ پھر اسٹیمر میں سفر کیا تھا اور پھر ریل‌گاڑی میں سوار ہوئے تھے۔ اسے یقین تھا کہ بس سڑک تک پہنچنے کی دیر ہے، فوراً ہی دریا آجائےگا، پھر ریل‌گاڑی ملےگی، پھر

اسٹیمر اور اس طرح وہ ازیوپکا ندی تک پہنچ جائےگا... ازیوپکا ندی تک، بیلوئے گاؤں تک، اپنے آبائی گھر تک۔ اس گھر تک، جو اس کی سانسوں میں بسا ہوا تھا، جہاں وہ کیا بڈھا، کیا بچہ، ایک ایک دیہاتی کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ہاں ایک بات اور اسے اچھی طرح یاد تھی — اور وہ تھی ماں باپ کی موت۔ اسے یاد تھا کہ وہ کیسے مرے تھے، کیسے لوگ انھیں تابوتوں میں لٹاکر دور کہیں جنگل پار لےگئے، کسی سنسان سے قبرستان میں۔ سیمکا کو خوب یاد تھا کہ وہ کیسا رویا تڑپا تھا، کس کس طرح اس نے گھر جانے کی ضد کی تھی، مگر اسے یہیں، اس بارک میں رہنے پر مجبور کردیا گیا تھا۔ اسے کھانے کو روٹی اور شوربہ دیا گیا اور کہا گیا تھا: ''اب ہمیں تجھ سے کوئی مطلب نہیں،،۔ یہاں تک کہ بارک کا نگراں الیکساندر یاکوولیوچ بھی اس پر چیخا اور اسے وہیں رہنے کا حکم دے دیا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ ''خبردار گڑبڑ نہ کرنا، نہیں تو جھونٹے نوچ پھینکوںگا،،۔ مرتا کیا نہ کرتا، سیمکا کو وہیں رہنا پڑا۔ مگر دل ہر دم دکھی رہتا تھا۔ اس کے ساتھ بارک میں تین بچیاں اور ایک بچہ اور تھے۔ یہ وہ بچے تھے جن کے ماں باپ انھیں غلطی سے یہاں چھوڑ کر نجانے کس سفر پر اور کہاں چلے گئے تھے۔ مگر وہ چاروں تو اتنے ننھے منے سے تھے کہ ان سے کھیلنا، ان کے ساتھ شرارتیں کرنا ممکن ہی نہ تھا۔

اسی طرح دن اور ہفتے گزرتے رہے، سیمکا اسی طرح اس ناقابل برداشت بارک میں زندگی کے دن کاٹ رہا تھا۔ اور جا بھی کہاں سکتا تھا بےچارہ! مگر آخر وہ اس زندگی سے عاجز آ گیا۔ دیکھو نا یہی سامنے ہی تو تھا وہ راستہ، وہ سڑک جو انھیں ''روس،، سے یہاں لائی تھی! ہنسی خوشی اجازت نہ دی تو وہ خود بھاگ لےگا۔ دیر کیا لگےگی! اور ایک دفعہ پھر اپنی ازیوپکا ندی، اپنا گاؤں بیلوئے دیکھےگا۔ وہ اپنے سنگی ساتھیوں سے پھر ملیگا، استانی افروسینیا ایگوروونا کے پاس جائےگا، پادری کے لڑکوں کے ہاں جائےگا۔ کتنے بہت سے سیب اور رس‌بھریاں اگتی ہیں ان کے باغیچے میں...

پھر بھی پکڑے جانے کے خوف سے کافی دن تک سیمکا کے قدم جکڑے رہے۔ کچھ بھی ہو، اپنی ندی، اپنے سنگی ساتھیوں، اپنے گاؤں کو ایک دفعہ پھر دیکھنے کی تمنا اتنی گہری، اتنی دلکش تھی کہ سیمکا اپنی دلی خواہش، اپنا دلفریب خواب، دل میں چھپائے، مناسب موقعے کی تاک میں رہا اور موقع ملتے ہی مفت کے شوربے روٹی کو ہمیشہ کےلئے لات مارکر سڑک کی طرف نکل بھاگا۔ دل میں اس خیال سے لڈو پھوٹ رہے تھے کہ آخر گھر لوٹ رہا ہے! ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے بیلوئے جیسا لاجواب گاؤں، اس کی ازیوپکا ندی جیسا انوکھا دریا اس دنیا میں کہیں ہے ہی نہیں۔ ہو ہی نہیں سکتا!!

چاند آسمان کا سفر طے کرکے افق تک پہنچ رہا تھا۔ صبح ہو چلی تھی۔ مگر سیمکا کے قدم سڑک پر مسلسل آگے ہی آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ اوس میں نہائی ہوئی تازہ ہوا میں سانس لیتا ہوا بڑھتا رہا اور دل اس خیال سے جھومتا رہا کہ اس کا ہر قدم اسے گھر سے قریب‌تر لا رہا ہے۔

۲

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان جو کچھ بھی سوچ سکتا ہے، تصور کرسکتا ہے، وہ سب وسیع و عریض سائبیریا نے دیکھا اور سہا ہے۔ اسے اب دنیا کی کوئی بات حیران نہیں کرسکتی۔ کوئی چیز اس کے لئے نئی یا انوکھی نہیں ہے۔ زنجیروں سے بندھے ہوئے نجانے کتنے قیدیوں نے اس دھرتی پر ہزاروں میل طے کئے تھے۔ پاؤں میں پڑی بھاری بیڑیوں کا شور اٹھتا رہتا اور وہ سائبیریائی زمین کی اندرونی پرت کی کھانوں کے اندھیرے میں پتھر توڑتے اور کھدائی کرتے رہتے۔ تیشوں کی مار سے اس کی روح کو لرزاتے رہتے۔ اس کی شاہراہوں پر گھنٹیوں کا شور مچاتی ہوئی تیزگام ترونیکا* گاڑیاں خوشی خوشی دوڑتی رہتیں۔ اور تائیگا کی وسعتوں میں مفرور قیدی بھٹکتے پھرتے۔ کبھی جنگلی درندوں سے بھڑتے، کبھی آبادیاں جلاکر خاک کرتے۔ کبھی یسوع کے نام پر بھیک مانگتے۔ روس سے ہجرت کرنےوالے مہاجرین کے غول، گاڑیوں کے تقریباً اٹوٹ سلسلے اس سرزمین پر چلتے نظر آتے۔ رات ہوتی تو وہ اپنی گاڑیوں، چھکڑوں تلے پناہ لیتے اور الاؤ جلاکر آگ تاپتے۔ ان کی مڈبھیڑ واپس لوٹنےوالے دوسرے غولوں سے ہوتی — غریب، مفلس، تباہحال بھوکے اور بیمار مہاجروں کی قطاروں سے۔ ان میں سے ان گنت بندے راہ ہی میں دم توڑ دیتے، مگر یہ کسی کو ذرا بھی انوکھی بات نہ لگتی۔

دوسروں کی بہت مصیبتیں دیکھی تھیں سائبیریا نے۔ اب اسے کسی بات پر حیرت نہیں ہوسکتی تھی۔ اور جب سیمکا نے آبادی کے قریب پہنچ کر پوچھ تاچھ کی تب بھی کسی کو کوئی حیرت تعجب نہ ہوا۔

''روس کی طرف کونسا راستہ جاتا ہے یہاں سے؟،، بچہ پوچھتا۔

''سارے ہی راستے روس جاتے ہیں،، لوگ ہاتھ سے راستے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اطمینان سے جواب دیتے اور گویا اس کے سفر کی سمت کی تصدیق کر دیتے۔

اور سیمکا چلتا رہا۔ نہ تھکن کا احساس تھا، نہ دل میں خوف کی لہر۔ وہ اپنی آزادی اور نجات سے خوش تھا۔ رنگ برنگے پھولوں سے ڈھکے ہوئے میدانوں کو دیکھ دیکھ دل جھوم رہا تھا۔ ان میدانوں میں قریب سے گزرتی ہوئی ترونیکا ڈاک گاڑیوں کی گھنٹیوں کا سنگیت گونج رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ جنگلی گلاب کی جھاڑیوں تلے گھاس پر لیٹ کر گہری نیند سوجاتا، یا گرمی بہت بڑھ جاتی تو سڑک کے کنارے کھڑے پیڑوں کے جھنڈ تلے پناہ لیتا۔ سائبیریا کی نرم دل عورتیں اسے دودھ روٹی کھلا دیتیں، کبھی کبھی دیہاتی کسان رحم کھاکر اپنے چھکڑے میں بٹھاکر تھوڑا راستہ پار کرا دیتے۔

''چچا میاں، مجھے بھی بٹھالو اپنے ساتھ۔ بڑی مہربانی ہوگی چاچا جی!،، جب کوئی

---

* تین گھوڑوں کی مشہور روسی گاڑی۔ (ایڈیٹر)

گھوڑا دوڑتا ہوا قریب سے گزرتا تو سیمکا منت سماجت کر کے چھکڑوں میں بیٹھنے والے کو رام کرنے کی کوشش کرتا۔

''خالہ جی، خدا کے نام پر روٹی کھلا دو مجھے!،، گاؤں دیہات میں پہنچ کر وہ گھر گھرستنوں سے کہتا۔

سبھی اس پر رحم کھاتے اور سیمکا کو کھانے پینے کو مل جاتا...

۳

اسی طرح دو ہفتے بیت گئے۔

بہت سے گاؤں، بہت سے راستے پیچھے چھوٹ چکے تھے۔ مگر اس نے دل چھوٹا نہیں کیا۔ بڑے صبر اور برداشت سے سب کچھ جھیلتا رہا۔ بس کبھی کبھی اتنا پوچھ لیتا:

''روس ابھی بہت دور ہے کیا؟،،

''روس؟،، لوگ کہتے۔ ''ہاں دور تو ہے۔ ہمارے جانتے تو جاڑے تک پہنچ جاؤ گے اور کون جانے کچھ اور جلدی ہی پہنچ جاؤ۔،،

''جاڑا تو اب جلدی آئے گا نا؟،،

''نہیں جی، ابھی جاڑا کہاں آیا جارہا ہے۔ ابھی تو خزاں بھی شروع نہیں ہوئی!،،

جب کبھی سیمکا کسی دیہات سے گزرتا، یا کہیں دور سے کسی گرجا کا سفید کلس اور اس پر چمکتا ہوا سنہرا صلیب نظر آتا تو اس کی آنکھیں بھر آتیں اور دل جھوم اٹھتا، بدن میں حرارت بڑھ جاتی۔ وہ سر سے ٹوپی اتار گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا اور رو رو کر گڑگڑاتا:

''یا خدا! یا میرے خدا! جاڑے جلدی شروع کر دے میرے مالک!،،

کبھی کبھی سڑک کے کنارے لکڑی کے کندوں سے بنا ہوا سنسان اور اجاڑ سا کوئی صلیب نظر آجاتا۔ دور دور کوئی آبادی نہ ہوتی بلکہ کوئی کٹیا تک نہ ہوتی۔ ایک طرف جنگل ہی جنگل اور دوسری طرف دور دور تک استیپ کے چٹیل میدان۔

ایسے صلیبوں کے قریب پہنچ کر سیمکا سوچ میں پڑجاتا۔ ایسے میں اسے ماں باپ بہت یاد آتے۔ کھیتوں سے گھرا ہوا وہ پڑاؤ یاد آتا جس میں ان دونوں نے آخری سانس لئے تھے۔ اور تب سیمکا تھکن بھول جاتا، اس کے قدم اور تیز ہوجاتے اور دل کی گہرائیوں سے ایک آواز ابھرتی اور ہونٹوں تک پہنچتے پہنچتے مدھم سی سرگوشی بن جاتی:

''میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں! اپنے گھر!،،

اور آخر وہ شہر تک پہنچ گیا۔

شہر کی سرحد میں داخل ہوا تو سیمکا کی آنکھیں کھل گئیں۔ نظر کے سامنے دائیں بائیں، دونوں طرف چوبی مکان ابھرے ہوئے تھے۔ کسی کی چھت سبز، کسی کی لال

تو کسی کی سرمئی ۔ ان کے بعد پتھروں سے بنے ہوئے سفید جھک مکانوں کی قطار پھیلی ہوئی تھی ۔ گلی کوچوں میں مرغیاں کڑکڑا رہی تھیں، سور غرا رہے تھے ۔ اس کے بعد کسانوں کے گھروں کے آنگن اور احاطے ابھرے ۔ ڈاک گھر کے پھاٹک کے قریب دھاری‌دار سنگ میل نظر آیا اور اس سے آگے چوک تھا جس میں آهنی جالیوں‌والا اونچا سا گرجاگھر تھا ۔ گرجاگھر کے پھاٹک کے سامنے پہرے‌دار کےلئے لکڑی کے تختوں سے بنا ہوا سلگجے رنگ کا ایک ٹوٹا مارا سا مینار تھا جس کے اوپری سرے پر دائرنما روک کے ساتھ ساتھ ایک سپاهی پہرہ دے رہا تھا ۔ اس سے بھی آگے دوسری چوکیوں کے مینار نظر آرہے تھے ۔

سیمکا رکا نہیں ۔ شہر سے گزرتا ہوا ایک دفعہ پھر شاهراہ پر آگیا کہ وهاں اسے آزادی اور خوشی کا احساس ہوتا تھا ۔

٤

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، ویسے ویسے تمام باتیں دیکھ کر سیمکا کو یقین ہوتا جا رہا تھا کہ خزاں شروع ہورهی ہے ۔ ''خیر، کوئی بات نہیں اب جاڑا بھی چٹکی بجاتے آجائےگا!،، اس نے سوچا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا گاؤں قریب سے قریب تر ہوتا جارها ہے ۔ اب کھیتوں میں رنگ برنگی تتلیاں نظر نہ آتیں، نہ کیڑے مکوڑے چکر کاٹتے ہوئے ملتے ۔ پت جھڑ شروع ہوچکا تھا ۔ گھاس مرجھانے لگی ۔ آسمان میں اکثر سرمئی رنگ کے پھٹے پھٹے بادل آتے ۔ رات کو سردی ہوتی ۔

لیکن سیمکا سوچتا ''اب دور نہیں ہے، اب تو جلد هی آجائےگا!،، بڑی سڑک پر چلتے چلتے سیمکا کو شدید بھوک محسوس ہورهی تھی۔ صبح سے کھیل بھی اڑکر منہ میں نہیں گئی تھی ۔

اچانک جھاڑیوں میں ایک آدمی بیٹھا نظر آیا ۔ وہ آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا کچھ چبا رہا تھا ۔ سیمکا کے قدم رک گئے ۔ وہ ترسی ہوئی نظر سے دیکھ رہا تھا کہ کیسے اس آدمی نے انڈا چھیلا اور کیسے روٹی کے ساتھ انڈے کے نوالے دانت سے کاٹ کر کھانے لگا ۔

''کیا بات ہے؟،، اس آدمی نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے، نوالہ چباتے ہوئے پوچھا ۔

سیمکا خاموش رہا۔

وہ شخص خاصا عمر رسیدہ تھا ۔ چھوٹی سی سفید داڑھی، زمانے کے سردوگرم دیکھا ہوا اور دھوپ میں جھلسا ہوا چہرہ، چھوٹی چھوٹی دھنسی ہوئی آنکھیں ۔ اس کے پاؤں میں هرن کی کھال کے جوتے تھے، شانوں پر رنگ برنگے کپڑے کا کوٹ اور سر پر چھجے دار ٹوپی ۔

''کیا ہے، رے؟،، اس نے سیمکا کی طرف دیکھتے ہوئے دوبارہ پوچھا ۔

''دادا جی!،، سیمکا سہمی ہوئی آواز میں بولا ۔ ''مجھے بھی روٹی کا ٹکڑا دے دو! خدا کے نام پر دے دو دادا...،،

’’دوست، مجھے خود دوسروں نے رحم کھا کر دی ہے۔ خیر، اچھا خیر ... چل تیری ہی مان لیتے ہیں۔ ،، اس نے لڑکے کو روٹی کا ٹکڑا دیتے ہوئے پوچھا: ’’یہ حال کیا ہے تیرا؟ کہاں سے آیا ہے، رے؟،،

’’گھر جا رہا ہوں۔ روس!،،

’’روس جارہا ہے؟ ارے میں بھی تو روس ہی جارہا ہوں۔ مگر تو جا کیوں رہا ہے؟،،

سیمکا نے اسے اپنی ساری کہانی سنائی۔ الف سے بے تک۔ اس نے بتایا کہ بارک میں کیسے اس کا دم گھٹتا تھا، کیسے اپنے گاؤں پہنچنے کو دل مچلتا تھا اور آخر کیسے وہ راتوں رات نکل بھاگا۔ اجنبی اس کی باتیں سنتا رہا اور سر دھنتا رہا۔ جیسے اس کی کسی کسی بات پر تعریف بھی کر دیتا۔

’’شاباش، بیٹا!،، بڑے میاں نے سیمکا کا ہاتھ تھپکتے ہوئے کہا ’’مگر میں دیکھتا ہوں تیرا جیون بڑا دکھی ہے۔ لگتا ہے میرے ہی نقش قدم پر چلےگا تو۔ نہ کبھی گھر پہنچےگا، نہ کوئی ٹھکانا ملےگا... کتے کی سی زندگی رہےگی... بالکل کتے کی سی!،،

’’اور تم کون ہو، دادا؟،، سیمکا کو بھی دلچسپی پیدا ہوئی تو اس نے بڑے میاں کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

’’میں کون ہوں؟ کوئی نہیں ہوں میں... بس مان لو گمنام ہوں...،،

بڑے میاں نے گہرا سانس لیتے ہوئے چہرے پر ہاتھ پھیرا، جیسے منہ پونچھ رہے ہوں۔

’’ہاں بھیا... تم ابھی بچے ہو۔ اب دیکھ لو دیش نے تمھیں واپس کھینچ بلایا۔ اس کا یہی حال ہے، بالکل جیسے سگی ماں ہو ... ماں کی طرح کھینچتی ہے اپنی طرف۔ آدمی کو اس کے بغیر کہیں چین نصیب نہیں ہوتا۔ آدمی آتا ہے، اس پر ایک نظر ڈالتا ہے، ماں پر، بس ایک نظر اور دل کو جیسے قرار آجاتا ہے۔،،

’’تو بتاؤ، دادا، میں جاڑے تک پہنچ جاؤںگا نا، روس، اپنے گاؤں؟،،

’’نہیں بیٹا، نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ بس اب دو چار ہفتے میں سردیاں پڑنے لگیں‌گی۔ اور تیرے پاس تو بیٹے گرم کوٹ تک نہیں ہے... میں بھگت چکا ہوں یہ سب... خوب جانتا ہوں۔ نہیں پہنچ سکتا۔ کہہ رہا ہوں میں۔ ٹھٹھر کر رہ جائےگا، اور بس!،،

بوڑھے کی باتوں سے سیمکا کا دل ڈوب گیا۔ بڈھا اپنے خیالوں میں کھو سا گیا۔ دونوں کی نظریں جھکی ہوئی تھیں، دونوں خاموش تھے۔

سیمکا سوچ رہا تھا کہ وہ کس طرح سردی میں اکڑ کر ختم ہوجائےگا۔ دکھ اس کا تھا کہ بیلوتے میں کسی کو خبر بھی نہ ہوگی۔ بڑے میاں بھی خاموشی سے مونچھیں مروڑ رہے تھے۔ اپنے خیالوں کے سمندر میں بھٹک رہے تھے۔

’’تو پھر کہاں چلے تم؟،، اچانک اجنبی نے گھاس پر سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

’’میں تو دادا، اپنے گھر جاؤںگا!..،،

’’میں بھی گھر ہی جاؤں گا۔ تو چلو ساتھ ہی چلیں!،،
دونوں خاموشی سے سڑک پر آئے اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ گئے۔

۵

شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا... دوپہر سے مسلسل بوندا باندی ہورہی تھی۔ اور سیمکا اور اجنبی دونوں کی ہڈیاں تک ٹھٹھر چکی تھیں۔

’’چل بھیا چل،، بڑے میاں نے ہمت بڑھائی۔ ’’جلدی قدم اٹھا، نہیں تو یہ خزاں صحیح معنوں میں بڑھی چلی آرہی ہے۔ اور ہم تم ابھی، گھر کا تو سوال ہی کیا، اورال پہاڑ تک بھی نہیں پہنچے ہیں۔ بول کیا ہوگا ہمارا؟ پھنس جائیں گے، میرے بھائی!،،

’’ہاں چل رہا ہوں، دادا!،،

’’یوں ہی بہت دیر کردی ہم نے۔ ڈرتا ہوں کہیں جاڑا نہ ٹوٹ پڑے ہم پر۔ بس سمجھ لو آ گئی مصیبت!،،

سیمکا انتہائی تھکن کے باوجود مگن تھا۔ ایک ہمسفر مل جانے کی وجہ سے اس کا دل بڑا ہوگیا تھا اور وہ خوش تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ اب راستے کے سلسلے میں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ دادا کی رہبری میں صحیح سمت میں سفر ممکن تھا۔ اور پھر بھی باتیں کرتے سفر بہتر کٹ رہا تھا۔ اور دادا تو یوں بھی مسلسل اپنے روس کی، اور سائبیریا کی باتیں کررہے تھے، جہاں سونے کی کانیں ہیں۔ کبھی قیدخانوں کا ذکر کرتے، کبھی آزادی میں زندگی اور سائبیریا کی شدید سردی کا تذکرہ کرتے، کبھی موسم بہار کی نکھری ہوئی، ہری ہری گھاس کے ترانے گاتے۔ ہاں یہ گھاس بھی تو آدمی کو گھر کی طرف کھینچتی تھی۔ اس کی یاد نہ دن کو چین لینے دیتی تھی نہ رات کو۔

’’دادا جی، اب تو کافی دور نکل آئے ہیں ہم۔ ہے نا؟،، سیمکا نے پوچھا۔

’’دیکھ رہے ہو، خشک سالی کے آثار؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم روس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ پہاڑ کے اس پار پہنچ کر دیکھنا۔ وہاں تو اور زیادہ بھوک مری ہے۔ جبھی تو کہہ رہا ہوں جلدی قدم بڑھاؤ۔ روس میں تو بس روپے کی قدر ہے۔ اور ہمارے پاس، میرے بھائی، پھوٹی کوڑی نہیں ہے! جہاں سینگ سمائے سوؤ، جو ملے کھاؤ۔ ان کی بلا سے۔ سائبیریا تو، بیٹے، بہت نرم دل ہے۔ مگر چکر یہ ہے کہ اس کی رحم دلی ہمیں نہیں بھاتی۔ کیا کریں دل ہی نہیں مانتا۔ چل بیٹا۔ چل جلدی!،،

شاہراہ عام سے ذرا سا ہٹ کر ایک قافلہ پڑاؤ ڈالے نظر آیا۔ اندھیرا اور سردی بڑھ رہی تھی۔ الاؤ کے لال لال شعلے پیدل مسافروں کو جیسے اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ جنگل سے گھرے ہوئے چھوٹے سے میدان میں اندھیرے میں چاروں طرف گھوڑے بکھرے ہوئے تھے۔ انہیں چرنے کے لئے کھول دیا گیا تھا اور وہ خزاں کی سرجھائی ہوئی گھاس

پر منہ مار رہے تھے۔ سامان سے لدے ہوئے چھکڑے کھڑے تھے اور دیہاتی کسان الاؤ جلا کر آگ تاپ رہے تھے، کھانا پکا رہے تھے۔

”جو کھاؤ وہ انگ لگے“، اجنبی نے الاؤ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”دوستوں کی اجازت ہو تو ہم بھی ذرا کی ذرا آگ تاپ لیں۔“

”بیٹھو“، جذبات سے عاری چند آوازیں ابھریں۔

بڑے میاں نے بیٹھ کر الاؤ کی طرف ہاتھ پھیلا دئے۔ سیمکا بھی آگ کے قریب کھسک آیا۔ جلد ہی اس کے سیلے ہوئے کپڑے سوکھنے لگے اور ریڑھ کی ہڈی میں گرمی کی لہر سی دوڑ گئی۔

”کہاں سے آرہے ہو، بھائی؟“ الاؤ کے قریب بیٹھے ہوئے مسافروں میں سے کسی نے اجنبی کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”بڑی دور سے آرہے ہیں۔ اپنے گھر لوٹ رہے ہیں۔“

”بچہ تمھارا ہے؟“

”نہیں۔ بس ملاقات ہوگئی۔ مہاجر بچہ ہے۔ راستے میں یتیم ہوگیا۔“

”دیکھو تو سہی شرابور ہو گیا بےچارہ!“

سیمکا سب مسافروں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ وہ الاؤ کے بالکل قریب کھسک آیا تھا اور بیٹھا بڑے غور سے الاؤ کی چھپٹیوں کو تڑختے اور جلتے دیکھ رہا تھا۔ اور فضا میں اٹھتے ہوئے سفید دھوئیں کا جائزہ لےرہا تھا۔ وہ پتیلی میں چڑھے ہوئے کھانے کے ابلنے اور سنسنانے کی آواز سن‌رہا تھا۔

”تو یتیم ہوگیا بیچارہ!“ دیہاتیوں نے پوچھا اور پلٹ کر سیمکا کو دیکھنے لگے۔

پھر اناج اور روٹی کی باتیں ہونے لگیں، روزگار اور نوکری کے تذکرے ہوئے اور کھانا تیار ہوگیا تو لوگ کھانے پر بیٹھنے لگے۔

”لے کھا، بدنصیب، تو بھی کھا۔ دیکھو سردی لگ گئی ہے اس کو!“

سیمکا نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور آرام سے لیٹ گیا۔ گرم گرم کھانے کے بعد الاؤ کے قریب یوں آرام کرنا کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ چھپٹیاں تڑخ رہی تھیں۔ فضا میں درختوں کی تازہ چھال اور سیلی لکڑی کے دھوئیں کی بو بسی ہوئی تھی۔ بالکل ایسا ہی تو لگتا تھا بیلوئے میں بھی! اے کاش یہ اس کا گھر ہوتا تو اس وقت وہ آلو کھود کر الاؤ میں بھونتا اور سیمکا کو بھوبھل میں بھنے ہوئے آلو یاد آئے۔ کیسی بھینی بھینی خوشبو نکلتی ہے ان میں سے، کس طرح ہاتھ جھلستا ہے پکڑنے سے، اور زبان پر رکھو تو کیسا کر کر کرتا ہے!

سیمکا کے سر پر ستارے جگمگا رہے تھے۔ بالکل اسی طرح جس طرح بیلوئے میں جھلملاتے تھے۔ اور بچہ جیسے خود کو یقین دلانے لگا کہ بیلوئے بس اب یہیں، قریب ہی ہے۔ اس کے پاؤں اور ٹانگیں تھکن سے چور تھے۔ ٹھنڈی زمین سے کمر اور گردن میں سردی

چڑھ رہی تھی اور الاؤ کا عکس بڑے مزے میں اس کے چہرے پر کھیل رہا تھا۔ چہرے پر، سینے پر اور گھٹنوں پر۔

دیہاتی ابھی تک نجانے کیا کیا باتیں کررہے تھے۔ دادا جی بھی ان سے باتوں میں مشغول تھے۔ سیمکا کو ان کی آواز سنائی دی: ''مشکل ہے بھیا۔ بہت کٹھن ہے...،، اور دیہاتیوں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی کہ بہت مشکل ہے۔ اور پھر ان کی آوازیں دھنستے دھنستے بالکل ہلکی ہوگئیں۔ ایسی ہوگئیں جیسے شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں... اور پھر بچے کی نگاہوں کے سامنے لال لال دھبے سے ناچنے لگے۔ پھر ٹھنڈا پاٹ‌دار دریا ابھرا اور دریا کے اس پار بیلوئے پھیلا نظر آیا۔ سیمکا کا دل چاہا کہ تیرکر دریا پار کرے اور جھٹ وہاں پہنچ جائے۔ لیکن اجنبی نے جیسے اس کے قدم تھام لئے اور بولا: ''مشکل ہے، بہت مشکل!،، اور نظر کے سامنے ایک دفعہ پھر لال ہرے دھبے ناچنے لگے اور جیسے سارا نظارہ بکھر گیا...

سیمکا ایسا بےخبر سویا جیسے کسی نے مارکر ڈال دیا ہو۔

٦

صبح سویرے اس کی آنکھ کھل گئی۔ آسمان پر بادل گھرے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سیٹیاں بجاتے ہوئے، دم توڑتی ہوئی آگ سے اٹھتی ہوئی بھاپ کو اور راکھ کے بگولوں کو میدان میں بکھیر رہے تھے۔ دیہاتی روانہ ہوچکے تھے۔ بڈھا اجنبی ایک ڈھیلے پر سر ٹکائے زمین پر لیٹا تھا۔

سیمکا اٹھ‌کر بیٹھ گیا۔

''دادا جی؟،، اس نے اجنبی کو پکارا۔ مگر بڑے میاں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''دیہاتی کہاں چلے گئے؟،، اس نے سوچا اور اچانک اس کا دل اجنبی کے خیال سے پریشان سا ہوگیا۔

ہوا سائیں سائیں کررہی تھی۔ اور راکھ بکھررہی تھی۔ جلی ہوئی سیاہ لکڑیوں کی ادھ جلی ٹہنیاں چرچرا رہی تھیں۔ سارے کا سارا میدان جیسے سائیں سائیں کررہا تھا۔ ماحول کچھ عجیب سا تھا۔

''دادا جی!،، سیمکا ایک دفعہ پھر چلایا مگر ہوا کے جھونکے اس کی آواز کو دوسری طرف اڑا لے گئے۔

اس کی آنکھیں خود بخود بند ہوگئیں اور سر جھک گیا۔ سیمکا پھر لیٹ رہا۔ اور اچانک اس کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ اور اسے ایسا لگا جیسے اجنبی دادا کو بدمعاشوں نے مار دیا ہو۔ ایسا محسوس ہوا جیسے بیلوئے کہیں قریب ہی ہو، لیکن اسے کوئی ان دیکھی طاقت آگے بڑھنے سے روک رہی ہو۔ جیسے کوئی اسے پیچھے کی طرف

کھینچ رہا ہو۔ وہاں بڑے میدان کی طرف دھکیل رہا ہو جہاں وہ بدرنگ بارک تھی۔
"لے... تو پہنچ گیا گھر!"، کوئی تلخ سی آواز میں اس سے کہہ رہا تھا۔ یہی نہیں بلکہ پھر جیسے کوئی گرم گرم شوربہ لاکر اس کے حلق میں ڈالنے لگا۔ اس کے سر پر انڈیلنے لگا۔ اور تیزی سے، اور تیزی سے، یہاں تک کہ اس کے سر پر گرم گرم پہاڑ سا بن گیا۔ مگر شوربہ تھا کہ اب بھی مسلسل سر پر ٹپک رہا تھا... سر سوج کر یہ بڑا ہوگیا اور بھیجے کے اندر جیسے الاؤ سا جلنے لگا۔ سانس لینا مشکل ہوگیا اور سیمکا نے آنکھیں کھول دیں۔ اجنبی بڈھا سامنے بیٹھا بڑے دکھ بھرے انداز میں سر ہلا رہا تھا۔

"کیوں میاں"، وہ بچے کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتا ہے اور سیمکا کی نگاہیں سامنے پھیلے ہوئے آسمان، ابھرتے سورج، سفید داڑھی اور دھنسی ہوئی آنکھوں پر پھسلتی چلی جاتی ہیں۔ "کیوں بھیا؟ ہمارا تو معاملہ معلوم ہوتا ہے بگڑ ہی گیا۔"

"دادا جی"، سیمکا زیرلب کہتا ہے۔

"لے بھئی بیٹا، اب اٹھ کے بیٹھ!"

بڈھے نے اسے اٹھاکر اپنے زانو پر بٹھایا اور اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"کیوں بیٹے؟"

"کچھ نہیں، دادا"، سیمکا بدبدایا۔

"کچھ جی برا ہے، مگر جیسے تیسے چلنا تو پڑے ہی گا... کوئی یہاں ککڑ کے مرنا تو ہے نہیں۔"

قریب آدھے گھنٹے کے بعد دونوں ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالکے سڑک پر بڑھتے نظر آئے۔ اجنبی بڑے یقین اور دلجمعی سے قدم اٹھا رہا تھا۔ لیکن سیمکا کے قدم بار بار سست پڑ جاتے، اور وہ پیچھے رہ جاتا۔

"بہت دور ہے شہر کمبخت تو"، بڑے میاں نے دکھی ہوکر کہا۔ "تمھیں تو شفاخانے میں بھرتی کرنا پڑے گا۔ اب تو کوئی میری طرح تو ہے نہیں۔ تو تو بھرتی ہو سکتا ہے۔ ایک میں ہوں، کہ وہاں شہر میں تو اپنی جھلک بھی نہیں دکھا سکتا۔ یا خدا، کیا زندگی ہے۔ کیا زندگی ہے میری!"

تھوڑی دیر کے بعد سیمکا کی ٹانگوں نے بالکل ہی جواب دے دیا۔

"پاؤں نہیں اٹھ رہے، دادا! بیٹھ لیں تھوڑی دیر!"

"لے آجا، اس جھنڈ تک چل لے۔ وہاں ذرا ٹھنڈ سے بچاؤ تو ہوگا۔ لے ہاتھ پکڑ لے میرا۔ ہاں ایسے۔ چل بیٹا، چل!"

درختوں کے جھنڈ تلے پہنچ کر دونوں بیٹھ گئے۔ اجنبی نے سیمکا سے کہا کہ میرے گھٹنے پر سر رکھ لے، اور جلدی جلدی شاخیں توڑکر ان کا بستر سا بنا دیا۔

"لیٹ جا، لیٹ جا میرے چھوٹے سے دیہاتی، لیٹ جا!"

"دادا جی!"، سیمکا نے منت کی۔ "مجھے اکیلا مت چھوڑنا، دادا جی!"

یہ کہہ کر وہ بلک کر رودیا۔ اور پھر جو چپ ہوا تو منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ کان میں پھر سیٹیاں سی بجنے لگیں، بھنبھناھٹ سی ہونے لگی۔ کسی نے پھر اس کا سر پکڑکر کھینچنا شروع کردیا۔ اردگرد کی ہر چیز گھوم رہی تھی۔ بڑبڑا رہی تھی...

''اپنے گھر! اپنے گھر!،، سیمکا نے بڑی مشکل سے کہا اور پوری کوشش کر کے آنکھیں کھول دیں۔ مگر اب تو کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

کبھی نظر کے سامنے عجیب نئے نئے لوگ ابھرتے، جن سے جان نہ پہچان۔ نئی نئی بارکیں نظر آتیں۔ کبھی وہ ماں کو دیکھتا تو کبھی ازیوپکا ندی کو۔ کبھی پھر اجنبی سے لوگ نظر آتے اور کبھی اجنبی دادا اس پر جھکنے لگتا۔ دن رات ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوئے جارہے تھے۔ اور آخر سیمکا نے ایک دفعہ پھر آنکھیں کھول دیں۔

وہ کمرے میں لیٹا ہے، نرم نرم بستر پر، سر کے اوپر صاف ستھری چھت نظر آرہی ہے۔ کھڑکی کے باھر سردی میں ٹھٹھرا پت‌جھڑ کا شکار پیڑ کھڑا ہے۔

اور اس نے ڈرکر سوچا ''پھر بارک پہنچ گیا کیا؟،، اس نے چاھا کہ جھپٹ کر اٹھے اور وھاں سے بھاگ لے، مگر بدن کو مجال ہے جو ذرا سی بھی جنبش ہوئی ہو۔ سر جیسے تکیے سے چپک کر رہ گیا تھا۔

''دادا آخر کہاں ھیں بھلا؟،، بچے نے نگاھوں نگاھوں میں، وہ جانی بوجھی صورت تلاش کرتے ہوئے سوچا۔ مگر وھاں تو نہ بڑے میاں تھے، نہ جنگل تھے، نہ پختہ سڑک۔ سیمکا کے دل پر چوٹ سی لگی اور کلیجے میں ٹیس سی اٹھی۔ اجنبی دادا نے یہاں کیوں لا پھینکا تھا اسے؟ اور پھر اس کے ستے ہوئے زرد رخساروں پر آنسو بہنے لگے۔ بچہ بڑی دیر خاموش پڑا یونہی بےبسی سے روتا رہا...

۷

بیماری کے بعد ابھی کمزور سیمکا ایک دن اسپتال کا سفید لبادہ پہنے کھڑکی کے پاس کھویا کھویا سا کھڑا سنسان گلی کو دیکھ رہا تھا۔ سوکھی ہوئی پتیاں تیز ہوا کی لہروں کے دوش پر ادھر سے ادھر اڑ اور بکھر رہی تھیں۔ سیمکا کی پشت پر ھسپتال کا سپاھی دیمیدیچ کھڑا تھا۔ اپنی سوچوں میں گم۔ وہ بھی کھویا کھویا سا باھر کی دنیا کو تک رہا تھا۔ اسی نے تو سیمکا کو بتایا تھا کہ جب بڑے میاں اسے یہاں لائے تو وہ بےحد بیمار اور بالکل بےسدھ تھا۔ لے بھئی بدقسمتی سے وھاں پولیس انسپکٹر موجود تھا۔ بڑے میاں کو دیکھتے ھی بولا: ''مزاج بخیر، میرے جوان رعنا!،، بڈھا تو اس کی آواز سنتے ھی بیٹھ گیا۔ ''پھر بےنکیل گھوم رہا ہے حرامی!،، اور پلک جھپکتے میں اس نے بچارے بڈھے کو پکڑ لیا۔ بڑے میاں کو جلاوطنی کی سزا ہوئی تھی مگر وہ اب تک تین دفعہ قید سے بھاگ چکے تھے۔ اور اب تیسری دفعہ پھر پکڑے گئے تھے۔

سیمکا سپاھی کی زبانی یہ سب باتیں سن چکا تھا۔ اور اب روزانہ صبح وشام ٹھنڈا سانس لےکر دعا مانگا کرتا تھا: ''اے میرے خدا، اجنبی دادا کی حفاظت کرنا۔ میرے مالک!..،،

''اب آج سب قیدیوں کو جلاوطن کر رہے ھیں،، سپاھی نے کہا۔ ''وہ دیکھو، وہ لے جارہے ھیں۔،،

جلد ھی سیمکا کو کچھ عجیب بوجھل اور دبی دبی سی آوازیں سنائی دیں۔ دیکھتے دیکھتے شانوں پر بندوقیں سنبھالے سپاھیوں کی قطار آتی نظر آئی۔ ان کے پیچھے سرمئی رنگ کے لبادوں میں ملبوس قیدیوں کا ھجوم تھا۔ قیدیوں کے سروں پر گول ٹوپیاں تھیں اور ان کی ھتکڑیوں اور بیڑیوں کی جھنکار سے فضا بوجھل ھوگئی تھی۔ ھجوم کے دائیں بائیں پیچھے بھی مسلح سپاھیوں کی قطاریں تھیں۔ کیا قیدی اور کیا سپاھی سب سردی میں ٹھٹھر رہے تھے۔

سیمکا کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ دھڑکتے دل سے، کھڑکی کے شیشے سے چپکا، سراپا نگاہ بنا ھوا غور سے اس اداس مجمع کو دیکھ رھا تھا کہ شاید وہ جانا پہچانا چہرہ نظر آجائے۔ اچانک وہ بڑی بےتابی سے چیخا، زور سے چلایا اور کھڑکی کے شیشے سے تقریباً ٹکراتے ھوئے آواز دی:

''دادا جی، دادا! دادا جی!،،

دراصل قیدیوں کی صف میں اسے اچانک اجنبی بڑے میاں نظر آگئے تھے، وہ بیڑیوں کے بوجھ سے جھکے ھوئے کھڑکی کے عین نیچے سے گزر رہے تھے۔

''دادا جی، دادا!،، غم اور خوشی کی شدت سے سیمکا آپے سے باھر ھوا جارھا تھا۔

شور سن کر بہت سے قیدیوں نے پلٹ کر دیکھا۔ اجنبی نے بھی نظر اٹھائی۔ سیمکا نے صاف دیکھا کہ بڑے میاں نے نظر اٹھاکر تھکن سے نڈھال دھنسی ھوئی سرمئی آنکھوں سے اسے دیکھا اور پھر گہرا سانس لیتے ھوئے بہت ھی دکھی ھوکر سر کے اشارے سے جیسے اسے خداحافظ کہا۔

سیمکا کی آنکھوں سے آنسوؤں کا طوفان سا ابل پڑا۔ سینے میں دل دھڑ دھڑ کر رھا تھا۔ دیکھتے دیکھتے قیدیوں کا قافلہ سامنے سے گزرتا ھوا مکان کے کونے تک پہنچا اور موڑ پر نظروں سے اوجھل ھوگیا۔ سیمکا ابھی تک اسی طرح کھڑکی کے پٹ دھڑ دھڑا کر چلا رھا تھا: ''دادا جی!،، اور چوکیدار نے بےرنگ سی آواز میں اسے ڈانٹا:

''چلا کیوں رھا ھے بے۔ چیخنے چلانے کی کوئی ضرورت نہیں ھے۔ ارے تجھے تو جلدی ھی تیرے گاؤں بھجوا دیا جائےگا۔ بچہ ھے تو۔ تیرا بھلا یہاں کیا کام۔ بس کہہ دیا تجھے بھجوا دیا جائےگا۔ بند کر یہ چیخ پکار۔ شور نہ مچا!،،

مگر سیمکا اسی طرح چلاتا رھا۔ ٹیڑھا ترچھا ھوکر دور نکڑ کی طرف کچھ دیکھنے کی کوشش کرتا رھا۔ اجنبی اپنی بیڑیاں سنبھالے گزرتا چلا گیا تھا۔ اجنبی جو محض اتفاق سے اسے ملا اور اس کا اس قدر اپنا بن گیا تھا۔

لیونِد اندریئف

پیشکا۔ بنگلے میں

۱۹ ویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے مشہور و معروف نثر نگار لیونِد نکولائیوچ اندریئف (۱۸۷۱ء تا ۱۹۱۹ء) نے خاص طور سے بچوں کےلئے نہیں لکھا۔ لیکن آج بچوں کے پڑھنے کے لئے جن کتابوں کی سفارش کی جاتی ہے ان میں اندریئف کی کہانیاں ''بیرگاموت اور گیراسکا'' (۱۸۹۸ء) اور ''پیتکا — بنگلے میں'' (۱۸۹۹ء) ضرور شامل ہوتی ہیں۔

بچپن میں اندریئف کو فینیمور کوپر، میئن ریڈ، گستاؤ ایمر اور ایڈگر ایلن پو کی کتابیں سب سے زیادہ پسند تھیں۔ کہانی ''پیتکا — بنگلے میں'' ظاہر ہے کہ ریڈ انڈینوں کی زندگی کے دلکش ناولوں یا جاسوسی افسانوں سے بالکل ہی مختلف ہے۔ لیکن یہ کہانی بچوں کے مطالع میں صرف اس لئے قطعی طور پر نہیں شامل ہو گئی کہ اس کا ہیرو ایک لڑکا ہے بلکہ اس لئے کہ مصنف معمولی چیزوں کے بارے میں غیر معمولی طور پر باتیں کر سکتا ہے۔ شہر کے لڑکے کے شہر سے باہر کے سفر کی سادہ سی حقیقت انجان دور دیسوں کی سیاحت کی طرح بن جاتی ہے جہاں ہر قدم کسی نئی اور ان دیکھی چیز کا انکشاف کرتا ہے۔ اسی لئے کہانی کا انجام بڑا غمناک معلوم ہوتا ہے۔ کہانی کا ہیرو اپنی سابق زندگی میں، مفلسی اور بھونڈےپن کی حقیقت میں واپس آ جاتا ہے۔

لیکن اس کے باوجود صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ کہانی پڑھ کر پیتکا کےلئے رحم کا جذبہ پیدا ہوتا ہو۔ عجیب و غریب چیزوں سے مڈبھیڑ ہونے کی خوشی، آزادی اور مسرت، جس نے ذرا ہی دیر کے لئے سہی پیتکا کو شادماں کر دیا تھا، خود اس کی یاد میں بھی ہمیشہ کےلئے باقی رہ جاتی ہے اور قاری کے دل سے بھی کبھی محو نہیں ہوتی۔

حجام اوسیپ ابراسووچ نے گاہک کے سینے پر گندا سا، جھاڑن‌نما تولیہ پھیلایا اور ..نیوں سے تولئیے کے کنارے گاہک کے کالر میں پھنسا دئیے۔ کالر میں تولیہ پھنسا کر .. نے آواز لگائی — رک رک کر، تیز آواز میں:

''چھوکرے، پانی دینا!،،

گاہک نے آئینے میں اپنے سراپا پر چبھتی ہوئی تیز نظر ڈالی، اس قسم کی تیز نظر .. توجہ سے آدمی خود کو صرف حجام کی دوکان ہی میں دیکھ سکتا ہے۔ ہاں تو غور سے دیکھنے پر گاہک کو اچانک اندازہ ہوا کہ اس کی ٹھوڑی پر ایک مہاسا اور نکل آیا ہے۔ .ور اس نے بڑی ناگواری سے نظریں ہٹا لیں۔ اور اچانک اس کی نگاہیں سیدھی ایک ..ے پتلے سے ہاتھ سے جاٹکرائیں، جو ایک طرف کہیں سے نمودار ہو کر ڈریسنگ ٹیبل کی ..ف بڑھتا اور گرم پانی کا پیالہ میز پر رکھتا نظر آیا۔ نگاہیں اور اوپر اٹھیں تو آئینے ..ں سے حجام کا عکس نظر آیا۔ کتنا عجیب، کیسا ٹیڑھا ترچھا سا چہرہ تھا اس کا۔ اور .. کیسی چبھتی ہوئی، کیسی خونخوار نظریں تھیں جن سے حجام نیچے کسی کے سر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں کی جنبش سے صاف ظاہر تھا کہ کوئی تلخ اور معنی‌خیز بات کہہ رہا ہے، لیکن آواز اتنی دبی ہوئی تھی کہ سننا ناممکن تھا۔ اگر اس کی حجامت خود دوکان کا مالک اوسیپ ابراسووچ نہ کرتا بلکہ اس کا کوئی اسسٹنٹ، پروکوپی یا میخائیل کر رہا ہوتا تو یہ بھنچی بھنچی آواز بڑھ کر مبہم سی چیخ بن جاتی:

''ارے، ٹھیر تو سہی!،،

اس کا مطلب یہ تھا کہ لڑکے نے پانی دینے میں دیر لگائی تھی اور اب اس کی شامت آنے والی تھی۔

''ان کا یہی علاج ہے،، گاہک نے سوچا۔ اور سر کو ذرا سا ترچھا کر کے، ڈوبے ڈوبے کچے جیسا بڑا اور موٹا سا ہاتھ اپنی ناک کے نزدیک ہی دیکھا۔ اس کی تین ..لیاں آگے کو بڑھی ہوئی تھیں، اور باقی دو لسلسی سی تھیں، ان سے کسی گھٹیا عطر

کی بو آرہی تھی۔ جب تک جب تک کند استرہ تکلیف‌دہ سرسراہٹ کے ساتھ صابن کے نرم جھاگ اور داڑھی کے سخت بال ہٹاتا رہا، تب تک یہ انگلیاں بڑی نزاکت سے گاہک کے گال اور ٹھوڑی سہلاتی رہیں۔

جس لڑکے پر سب سے زیادہ ڈانٹ پڑتی تھی، وہ تھا پیتکا۔ دوکان کا سب سے کم‌عمر چھوکرا تھا پیتکا۔ دوسرا لڑکا نیکولکا عمر میں تین ایک سال بڑا تھا اور جلد ہی اوپر کے کام کے چھوکرے سے ترقی کرکے چھوٹا حجام بننےوالا تھا۔ آج بھی یہ حال تھا کہ جب کوئی بہت ہی معمولی درجے کا گاہک دوکان میں آتا اور مالک موجود نہ ہوتا، تو اس کی غیرحاضری کا فائدہ اٹھاکر چھوٹے حجام کاہلی کر جاتے، جھٹ نیکولکا کو بال اور داڑھی مونڈنے پر بٹھا دیتے اور خوب خوب مزے لیتے اور ھنستے کہ دیکھو تو اسے، پہاڑ جیسے مضبوط چوکیدار کی بالوں بھری گدی تک پہنچنے کے لئے پنجوں کے بل کھڑا ھونا پڑ رہا ھے۔ کبھی کبھی گاھک اتنی بری حجامت بنتے دیکھ‌کر جھنجھلا جاتا، اور چنگھاڑنا بکنا شروع کر دیتا، تب دوسرے چھوٹے حجام بھی نیکولکا پر برستے۔ مگر ایسے موقعے کم ھی آتے تھے۔ عام طور پر نیکولکا بڑے رکھ رکھاؤ سے رہتا اور بڑے آدمی کی طرح رعب رکھتا تھا۔ سگرٹ پیتا، دانت دباکر تھوکتا، غصے میں موٹی موٹی گالیاں بکتا، اور پیتکا کے سامنے خوب خوب ڈینگیں مارتا کہ وہ وادکا پی چکا ھے، لیکن غالباً جھوٹ بکتا تھا۔ اور تو اور پڑوس‌والی گلی میں کوئی دنگا فساد ھو جاتا تو نیکولکا بھی چھوٹے حجاموں کے ساتھ تماشا دیکھنے بھاگ لیتا۔ مگر جب ھنستا، قہقہے لگاتا، خوش خوش لوٹتا تو اوسیپ ابراسووچ دو تھپڑ رسید کرتا — ایک اس گال پر ایک اس پر۔

پیتکا یہی کوئی دس ایک سال کا ھوگا۔ وہ نہ سگرٹ بیڑی پیتا، نہ وادکا کی چسکیاں لگاتا، نہ گندی گندی گالیاں بکتا حالانکہ ایک سے ایک فحش گالی جانتا تھا۔ بچارا بڑی حسرت سے اپنے ساتھی کو یہ سب حرکتیں کرتے دیکھتا، اور اس پر رشک کرتا۔

جب کبھی دوکان میں کوئی گاھک نہ ھوتا تو پیتکا اور نیکولکا کی گپ‌شپ کی محفل جمتی۔ ھاں تو ایسے میں نیکولکا ھمیشہ بڑا نیک بنا رہتا۔ دونوں بیٹھ جاتے اور وہ ”چھوکرے،، کو سمجھاتا کہ فوجی سپاھیوں جیسی حجامت کیا ھوتی ھے، مانگ والی حجامت کیسے بناتے ھیں، وغیرہ وغیرہ۔

کبھی دونوں موم کے بنے ھوئے عورت کے نیم‌تن مجسمے کے قریب کھڑکی میں بیٹھ جاتے، واہ کیا سرخا سرخ گال تھے اس عورت کے، کیا چمکتی ھوئی آنکھیں تھیں، کیسی نوکیلی پلکیں تھیں۔ دونوں کھڑکی میں بیٹھ‌کر گلی کا نظارہ کرنے لگتے جہاں صبح سویرے ھی سے چہل پہل شروع ھو جاتی تھی۔ گلی کے پیڑ پودوں پر زمانے بھر کی گرد جمی رہتی، وہ بےحس و حرکت کھڑے تپتے ھوئے ظالم سورج کو تکتے رہتے اور ان کا سایہ تک گردآلود اور گرم ھو جاتا۔ سڑک کے کنارے پڑے ھوئے سب بنچوں پر گندے سندے کپڑوں‌والے سرد عورتیں بیٹھے رہتے۔ نہ سر پر ٹوپی نہ رومال، جیسے وہ یہیں کے باسی ھوں،

ان کے اپنے کوئی مکان، کوئی ٹھکانے ہی نہ ہوں۔ ان میں سے کسی نہ کسی کا الجھے بالوں بھرا سر اکثر بےجان سا ہوکر شانوں پر ڈھلک جاتا اور تھکا ہوا جسم کھلی فضا میں چند لمحے سو جانے کو بےقرار نظر آتا۔ مانو تیسرے درجے کا کوئی مسافر مسلسل ہزاروں میل کا سفر طے کر رہا ہو۔ مگر لیٹنے کی جگہ بھلا کہاں تھی وہاں۔ گہرے نیلے یونیفارم‌والا پہرےدار ہاتھ میں ڈنڈا لئے سڑک پر پہرہ دیتا رہتا، اس کا خاص خیال رکھتا کہ کوئی بندہ بنچ پر ٹانگیں تو نہیں پھیلا رہا، کوئی دکھیا گھاس پر لیٹ تو نہیں رہا۔ سورج کی گرمی نے گھاس کو جھلس دیا تھا تو کیا ہوا، وہ پھر بھی اتنی نرم، اتنی ٹھنڈی تھی کہ واہ واہ۔

نیکولکا ان میں سے بہت سی عورتوں اور مردوں کو نام بنام جانتا تھا۔ ان کے بارے میں پیتکا کو ایک سے ایک گندی داستان سنا سنا کر ہنستا تو اس کے چوہے جیسے دانت چمکنے لگتے۔ اور پیتکا دل ہی دل میں حیران ہوا کرتا کہ میرا یار کیسا عقل‌مند، کتنا نڈر ہے۔ اس کا دل چاہتا کہ کاش ایک دن وہ بھی ایسا ہی ہو جائے، مگر ابھی تو جی چاہتا تھا کہ یہاں سے کہیں اور چلا جائے... کہیں بھی، مگر چلا جائے!

پیتکا کے شب و روز آہستہ آہستہ گھسٹ رہے تھے۔ ہر روز وہی گھسی پٹی زندگی تھی — ہر دن بالکل دوسرے دن جیسا تھا، دن کیا ہوئے دو جڑواں بھائی ہو گئے۔ گرمی ہو یا سردی روز وہی آئینے نظر آتے، جن میں سے ایک چٹخا ہوا تھا اور دوسرا بالکل ٹیڑھا ترچھا تھا اور زمانے کے سرد و گرم دیکھتے دیکھتے گھس گیا تھا۔ داغ داغ دیوار پر صدیوں سے وہی ایک تصویر لٹکی ہوئی تھی۔ صبح سے شام تک پیتکا کی تواضع اسی چنگھاڑتی ہوئی آواز، انھیں تلخ الفاظ سے ہوتی تھی: ''چھوکرے، پانی دینا!،، اور وہ دن دن بھر پانی دیتا رہتا۔ اس کی زندگی میں تو تیج تہوار بھی نہیں تھے۔ اتوار کے اتوار جب سڑک کے دونوں طرف پھیلی ہوئی دوکانوں کی کھڑکیاں سڑک کو روشن نہیں کرتی تھیں، تو حجام کی دوکان بڑی رات گئے تک روشنی کی شوخ کرنیں فٹ پاتھ پر چھوڑتی رہتی۔ اور راہ‌گیروں کی نظر چھوٹے سے سوکھے سارے سراپا سے جا ٹکراتی، جو کونے میں اپنے اسٹول پر سکڑا سمٹا نظر آیا کرتا تھا خدا جانے کہاں کھویا ہوا سا، نجانے خیالوں کی دنیا کے کس پاتال میں ڈوبا ہوا، نجانے کون سے پریشان خوابوں میں الجھا ہوا۔ پیتکا بہت سوتا تھا جب دیکھو جب اونگھ رہا ہے۔ ہر وقت سونے کو دل چاہتا اور کچھ ایسا لگتا جیسے وہ حقیقت کی دنیا میں نہیں بلکہ خواب کے عالم میں زندہ ہے۔ ایک طویل اور ناگوار خواب کے عالم میں۔ اکثر ہاتھ سے پانی چھلک جاتا، یا پھر وہ تیز چیخ کی آوازیں ''چھوکرے، پانی دینا!،، — نہیں سنتا۔ دن پر دن چھوکرا سوکھتا جا رہا تھا، بہت ہی چھوٹے کٹے بالوں‌والے سر پر کھجلی کے کھپڑے جم گئے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ گاہک بڑی کراہت اور گھن سے اس سوکھے سارے چھوکرے کو، اور اس کے چہرے کی جھائیوں کو دیکھتے، جس کی آنکھیں نیند سے ہمیشہ بوجھل رہتی تھیں، منہ آدھا کھلا رہتا اور

هاتھوں اور گردن پر میل کی تہیں جمی نظر آتی تھیں۔ آنکھوں کے قریب اور ناک کے نیچے باریک باریک جھریاں سی ابھری رہتی تھیں، جیسے کسی نے تیز سوئی سے کھینچ دی ہوں، ان جھریوں کی وجہ سے لڑکا اچھا خاصا بڈھا بونا معلوم ہونے لگا تھا۔

پیتکا کو کچھ ہوش نہ تھا کہ اس کا دل اداس ہے یا خوش۔ بس ایک ہی خواہش تھی کہ یہاں سے کسی دوسری جگہ چلا جائے۔ حالانکہ اسے معلوم نہ تھا کہ یہ دوسری جگہ کہاں ہے، کیسی ہے۔ جب کبھی اس کی باورچن ماں، نادیژدا، اس سے ملنے آتی تو پیتکا بڑی بےدلی اور کاہلی سے ماں کی لائی ہوئی مٹھائیاں کھا لیتا، کبھی کسی بات کی شکایت نہ کرتا، بس ایک ہی بات کہتا کہ یہاں سے لے چلو۔ ماں کی منت ضرور کرتا مگر پھر بھول جاتا۔ بجھے بجھے دل سے ماں سے خداحافظ کہتا اور کبھی یہ بھی نہ پوچھتا کہ اب دوبارہ کب آؤگی۔ اور نادیژدا دکھی ہو ہوکر سوچتی کہ خدا خدا کرکے ایک بیٹا ملا بھی تو احمق۔

وہ اس رنگ میں کب سے زندگی گزار رہا ہے، ایک عرصے سے یا محض چند دن سے، اسے کچھ پتہ نہ تھا۔ اور پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک دن کھانے کے وقت اس کی ماں پہنچ گئی۔ اس نے اوسیپ ابراموچ سے کچھ بات‌چیت کی اور کہا کہ پیتکا کو بنگلے میں لے جائیگی۔ زاریتسینا میں، باورچن کے مالک وہیں تو رہتے تھے۔ شروع میں تو پیتکا کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ بات کیا ہے۔ مگر جلد ہی دبی دبی ہنسی نے سارے چہرے کو باریک باریک جھریوں کے جال سے ڈھانک دیا۔ اور وہ جلدی مچانے لگا کہ ماں جلدی چلو۔ نادیژدا دنیاوی رکھ رکھاؤ کے مطابق اوسیپ ابراموچ سے اس کی بیوی کی خیرخیریت پوچھنا چاہتی تھی، مگر پیتکا مسلسل اس کا ہاتھ کھینچ رہا تھا، اسے دھیرے دھیرے دروازے کی طرف دھکیل رہا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ دیہاتی بنگلہ کیا ہوتا ہے، کیسا ہوتا ہے۔ مگر جیسے دل کے اندر سے کوئی بتا رہا تھا کہ یہی وہ جگہ تھی جہاں جانے کو وہ ہمیشہ سے بےقرار تھا۔ وہ تو اپنی دنیا میں ایسا مگن ہوا کہ نیکولکا کو بھی بھول گیا۔ نیکولکا قریب ہی کھڑا، اپنی مخصوص ڈھٹائی کے انداز میں جیبوں میں ہاتھ ڈالے، نادیژدا کو گھور رہا تھا، مگر اس کی آنکھوں سے بےحیائی اور ڈھٹائی کی بجائے بڑی گہری اداسی ٹپک رہی تھی۔ ماں سے محروم لڑکا سوچ رہا تھا کہ کاش اس کے بھی کوئی ماں ہوتی، بلا سے، اس موٹی نادیژدا جیسی ہی کیوں نہ ہوتی۔ دراصل نیکولکا نے بھی کبھی کوئی بنگلہ نہیں دیکھا تھا۔

اف‍وہ اسٹیشن پر بھی کیا ہنگامہ تھا۔ طرح طرح کی آوازیں، شور، گھڑگھڑاتی ہوئی ریل‌گاڑیاں، سیٹیاں بجاتے ہوئے انجن۔ کبھی گھنے زور سے سیٹی بجتی، مانو اوسیپ ابراموچ چلا رہا ہو، کبھی باریک سی سیٹی ابھرتی، جیسے اس کی بیمار بیوی بول رہی ہو۔ ایک سے ایک مسافر، کوئی ادھر بھاگ رہا ہے، کوئی ادھر دوڑ رہا ہے، دوڑے جا رہے ہیں، مسافر ہی مسافر، جیسے ان کی کوئی منزل ہی نہ ہو۔ پیتکا کا یہ پہلا اتفاق تھا

اسٹیشن آنے کا۔ ہلکا ہلکا ایک ایک چیز کو دیکھ رہا تھا۔ دل میں عجیب جوش اور خوشی، ایک عجیب بےقراری بےچینی انگڑائیاں لے رہی تھی۔ اسے اور ماں دونوں کو ڈر تھا کہ کہیں گاڑی چھوٹ نہ جائے، حالانکہ بنگلےوالی گاڑی کے جانے میں ابھی اچھا خاصا آدھا گھنٹہ تھا۔ اور جب خدا خدا کرکے دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے اور گاڑی چلی تو پیتکا تو مانو کھڑکی سے چپک گیا، پتلی سی گردن پر دھرا چھوٹے چھوٹے بالوں‌والا سر مسلسل ہل رہا تھا، جیسے لوہے کی چول سے لٹکا جھول رہا ہو۔

وہ پیدا بھی شہر ہی میں ہوا تھا، پلا بڑھا بھی یہیں تھا۔ گاؤں دیہات اور کھیت کھلیان زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس کےلئے یہاں کی ہر ہر چیز حیرت‌انگیز حد تک نئی اور حیران‌کن تھی۔

اور ذرا دیکھو تو سہی میلوں میل دور تک کا نظارہ نگاھوں کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ اتنی دور سے تو جنگل بھی ایسے نظر آ رہے تھے جیسے گھاس کے تختے ہوں۔ اور آسمان ... یا خدا اس نئی دنیا کا آسمان کیسا نیلا، کتنا وسیع تھا! مانو آدمی چھت پر چڑھ‌کر تماشا دیکھ رہا ہو۔ پیتکا آسمان کا یہ نظارہ صرف اپنی طرف کی کھڑکی سے کر رہا تھا۔ مگر جب ماں سے کچھ کہنے کو مڑا تو سامنےوالی کھڑکی سے بھی تا حد نظر یہی نیلی چھتری پھیلی نظر آئی۔ اور اس طرف کے آسمان پر دودھ جیسے سفید پیارے پیارے بادل تیر رہے تھے۔ مانو ننھے منے فرشتے اڑ رہے ہوں۔ پیتکا کبھی اپنی‌والی کھڑکی کی طرف مڑتا، کبھی گاڑی کی دوسری طرف بھاگتا۔ اور بڑے بھولپن، بڑی سادگی سے اپنے میلے کچیلے، بےدھلے ھاتھ کبھی کسی اجنبی مسافر کے شانے پر رکھ دیتا، کبھی کسی کے گھٹنے پر۔ اور وہ سب اس کی حرکتوں پر مسکرا دیتے۔ لیکن ایک صاحب ایسے بھی تھے جو سب سے الگ تھلگ بڑی دیر سے اخبار پڑھ رہے تھے۔ اور مسلسل جمائیاں لے رہے تھے۔ نجانے انتہائی تھکن کی وجہ سے نجانے اکتاھٹ کے سبب۔ ان صاحب نے دو ایک دفعہ ذرا ترچھی اور کڑوی نظر لڑکے پر ڈالی تو نادیژدا نے جلدی سے معذرت کی: ”دراصل پہلی بار ریل میں بیٹھا ہے۔ اس لئے شوق سے سب کچھ دیکھ رہا ہے۔“

”ہوں“، صاحب آدمی نے بےزاری سے کہا اور پھر اپنے اخبار پر جھک گئے۔

نادیژدا کا دل چاھا کہ ان سے کہے کہ پیتکا پورے تین سال سے حجام کے ساتھ کام کرتا ہے، وھیں رہتا ہے، اور یہ کہ حجام نے وعدہ کیا ہے کہ وہ بچے کو اس قابل بنا دےگا کہ چھوکرا اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔ ایسا ہو جائے تو کتنا اچھا ہو۔ وہ اکیلی اور بےسہارا عورت ہے اور بیماری اور ضعیفی میں اس بچے کے سوا اس کا اور کوئی سہارا نہیں ہوگا۔ مگر ان صاحب کے چہرے پر تو ایسی سختی تھی کہ توبہ۔ نادیژدا دل ہی دل میں یہ سب سوچ کر چپ ہو رہی۔

راستے کی دائیں طرف اوبڑ کھابڑ میدان تھا جس پر مستقل سیلن کی وجہ سے گہری ہری کائی سی جمی ہوئی تھی۔ اس میدان کے چاروں طرف سرمئی رنگ کے گھروندے بکھرے

ہوئے تھے - چھوٹے چھوٹے سے، جیسے گڑیوں کے گھر ہوں - اونچے، ہرے پہاڑ کے دامن میں چاندی جیسی ندی چمک رہی تھی - اور اس کی چوٹی پر گرجا گھر تھا، وہ بھی کھلونے جیسا چھوٹا سا -

ریل گاڑی نے اچانک رفتار پکڑی اور اپنی آہنی جھنکار کے ساتھ تیزی سے پل پر چڑھ کر آئینے کی طرح چمکتے ہوئے، ریشم جیسے چکنے دریا کے عین اوپر پہنچ کر جیسے ہوا میں معلق ہو گئی - یہ سب کچھ اس طرح اچانک ہوا کہ پیتکا خوف سے لرز گیا - گھبرا کر کھڑکی سے ہٹا، مگر دوسرے ہی لمحے پھر وہیں جا چپکا - ڈرتا تھا کہیں راستے کی کوئی تفصیل نظر سے چوک نہ جائے - اب پیتکا کی آنکھوں سے وہ سوئی سوئی سی کیفیت غائب تھی اور چہرے کی جھریاں نجانے کہاں جا چھپی تھیں - ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے گرم گرم استری سے اس کے چہرے کی ساری شکنیں مٹادی ہوں، اور پھر اس میں سفیدی اور چمک بھر دی ہو -

پیتکا کو بنگلے پہنچے ہوئے دو دن ہو چکے تھے - مگر اسے جنگلوں سے بڑا ڈر لگتا تھا جو اپنی تمام‌تر خاموشی کے باوجود جیسے اس کے سر پر شور سا مچا رہے تھے - کسقدر اندھیرا تھا، کیسی سوچ میں ڈوبی ہوئی کیفیت تھی ان کی - کیسا خوفناک تھا ان کا یہ پھیلاؤ - جہاں تک نظر ڈالو جنگل ہی جنگل - مگر جنگلوں سے گھرے ہوئے ان کھلے میدانوں میں کیسی ہریالی، کیسی چمک تھی، کیسی رنگارنگی تھی - میدان میں کھلے ہوئے رنگ برنگے نکھرے ہوئے پھول جیسے گنگنا رہے تھے - وہ تو جی جان سے ان میدانوں پر فدا ہو گیا - جی‌چاہ رہاتھا بڑھ کر انہیں گلے لگا لے - مانو بھائی اپنی بہنوں کو گلے لگا رہا ہو - اور اوپر پھیلا ہوا نیل گگن ہنس رہا تھا - اپنے قریب بلا رہا تھا، جیسے ماں بچے کو بلائے - پیتکا کے دل میں جذبات کا طوفان اٹھ رہا تھا - کبھی سارے جسم سے لرز جاتا - کبھی اس کا رنگ اڑ جاتا - وہ نجانے کس کو دیکھ کر مسکراتا ہوا، کسی بڈھے کی طرح کھیتوں اور میدانوں میں گھومتا رہتا، جنگلوں سے ڈھکے ہوئے جھیل کے کناروں پر بھٹکتا رہتا - کبھی تھکن سے نڈھال ہوتا تو سانس روکے، گھنی اور پکی پکی سی گھاس پر ڈھیر ہوکر جیسے اس میں کھو جاتا، ڈوب جاتا - سارا کا سارا گھاس میں چھپ جاتا - بس اس کی ننھی سی جھائیوں بھری ناک اس سرسبز تختے سے ابھری نظر آتی - پہلے دن تو وہ یہاں وہاں سے گھوم پھر کر باربار ماں کے پاس آتا اور اس سے لگ لپٹ کر بیٹھ جاتا تھا - اور جب مالک اس سے پوچھتے کہ بنگلے میں اچھا لگ رہا ہے نا، تو گھبرا کر مسکراتا اور بوکھلا کر بولتا :

’’اچھا ہے -،،

اور پھر اٹھتا اور انہیں چنگھاڑتے ہوئے جنگلوں اور اسی خاموش تلیا کے پاس پہنچ کر جیسے ان سے باتیں کرنے لگتا، کچھ پوچھنے لگتا -

دو دن اور گزرے اور پیتکا اور فطرت کے ان نظاروں میں بڑی گہری دوستی ہو گئی - اور اس دوستی میں بڑا ہاتھ تھا ’’پرانے زاریتسینا،، کے اسکول میں پڑھنےوالے ایک لڑکے

میتیا کا۔ اسکول کے اس بچے کا رنگ زرد اور سنولایا ہوا سا تھا۔ کھوپڑی پر سیدھے سیدھے کھڑے بال تقریباً سفید تھے۔ سورج نے انھیں جھلس دیا تھا نا! پیتکا نے جب اسے پہلی بار دیکھا تو میتیا تلیا پر مچھلیاں پکڑ رہا تھا۔ یوں سرراہے ملاقات ہوتے ہی دونوں میں خوب گھٹ گھٹ کر باتیں ہونے لگیں۔ منٹوں میں دونوں ایک دوسرے کے یار بن گئے۔ اس نے ایک بنسی پیتکا کو تھمائی اور پھر اسے کہیں اور لے گیا، پانی میں ڈبکیاں لگانے اور نہانے کےلئے۔ پانی میں جانے کے خیال سے پیتکا کی جان لرزتی تھی، مگر جب ایک دفعہ اتر ہی گیا تو پھر ایسا مزہ آیا کہ نکلنے کو جی ہی نہ چاھتا تھا۔ مزے میں ہاتھ مار رہا تھا، جیسے تیر ہی تو رہا ہو۔ ناک اور بھویں پانی سے اوپر کیں، سانس روکا اور لگا پانی پر ہاتھ مارنے اور خوب خوب چھینٹے اڑانے۔ اس حلیے میں وہ بالکل ایسا ننھا سا پلا لگ رہا تھا، جو پہلی دفعہ پانی میں پھنسا ہو۔ خیر نہا دھوکر نکلا اور کپڑے پہنے تو سردی سے سارا بدن نیلا پڑ گیا تھا۔ مانو مردے کا بدن ہو۔ باتیں کرنا چاہیں تو ٹھنڈے دانت بجنے لگے۔ اور پھر ہر دم، ہر گھڑی نت نئی حرکتیں سوچنےوالے میتیا کی تجویز پر دونوں محل کے کھنڈرات کا معائنہ کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ قدیم چھت پر چڑھے، جس پر گھاس اور پودے اگ آئے تھے، بڑی دیر دونوں اس دیوھیکل عمارت کی ٹوٹی دیواروں کے درمیان بھٹکتے رہے۔ کتنا مزہ آ رہا تھا وھاں۔ ہر طرف پتھروں کے ایسے ایسے ڈھیر بکھرے ہوئے تھے جن پر چڑھنا اترنا آسان کام نہ تھا۔ اور ان کے بیچ میں برچ اور ایش کے ننھے ننھے پودے سر اٹھا رہے تھے۔ اور کیسی خاموشی تھی — موت کی خاموشی۔ ہر دم لگتا تھا کہ اب اس کونے سے کوئی اچھل کر سامنے آ جائے گا، اب اس کونے سے نکل آئے گا۔ یا پھر کھڑکی کے تڑکے ہوئے جھروکے سے کوئی بھیانک، خوفناک ہستی جھانکتی نظر آئے گی۔ رفتہ رفتہ پیتکا بنگلے میں ایسا رھلا محلا ہو گیا جیسے ہمیشہ سے یہیں رہتا آیا ہو۔ وہ تو جیسے بھول ہی گیا کہ اس دنیا میں اوسیپ ابراموویچ نام کی کسی ہستی کا، حجام کی دوکان جیسی کسی چیز کا کبھی کوئی وجود تھا، یا ہے۔

''ذرا دیکھو تو کیسا موٹا تازہ ہو گیا ہے۔ اچھا خاصا سوداگر لگ رہا ہے،، بھاری بھرکم نادیژدا نے خوش ہوکر کہا جسے باورچی‌خانے کی گرمی نے لال چقندر بنا دیا تھا جیسے تاؤ کھایا ہوا سماوار۔ اس کا خیال تھا کہ پیتکا پر بوٹی چڑھی ہے اچھے اور بھرپیٹ کھانے کی وجہ سے مگر پیتکا کھاتا ہی کہاں تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ لڑکے کا دل نہ چاھتا ہو، مگر من مارکر بیٹھنے کا وقت کہاں تھا۔ ہاں اگر چبانا نہ پڑتا۔ منہ میں رکھا اور جھٹ نگل گئے — تو دوسری بات تھی۔ مگر وھاں تو مشکل یہ تھی کہ چبانا پڑتا تھا اور وقفے وقفے سے پیر ھلانا بھی پڑتا کیونکہ خود نادیژدا آھستہ آھستہ کھاتی تھیں، چیونٹی کی رفتار سے، ایک ایک ھڈی کو اچھی طرح چباکر، اپرن سے منہ پونچھ پونچھ کر، ادھر ادھر کی بےمعنی باتیں کر کرکے... ادھر پیتکا کے سر پر ڈھیروں کام تھے۔ دن میں کوئی پانچ بار تو تیرنا اور نہانا ہوتا تھا، جوز کے پیڑ کی ٹہنی سے

بنسی گھڑنی ہوتی، کینچوے جمع کرنا ہوتے، کوئی ایک کام تو تھا نہیں۔ دم مارنے کی فرصت نہ تھی۔ یہاں تو پیتکا مزے میں ننگے پاؤں بھاگتا پھرتا تھا۔ موٹے تلوں کے بھاری بوٹوں کے مقابلے میں ہزاروں گنا زیادہ آرام تھا یوں ننگے پاؤں پھرنے میں۔ کھردری زمین کیسی محبت سے کبھی پاؤں جلاتی، کبھی اپنی تمام‌تر ٹھنڈک آپ کے پاؤں میں اتار دیتی۔ جوتے ہی کیا، اس نے تو اپنی پرانی دھرانی، اسکولی لڑکوں‌والی جیکٹ بھی اتار پھینکی تھی، جس میں وہ الگ سے الگ حجام کی دوکان کا چھوٹا موٹا حجام لگتا تھا۔ البتہ شام کو جب باندھ پر جاکر صاحب لوگوں کو کشتی‌رانی کرتے دیکھا کرتا تو جیکٹ پہنتا تھا۔ ایک سے ایک بڑھیا کپڑوں میں ملبوس، دمکتے چہروں‌والے صاحب لوگ ہنستے مسکراتے، قہقہے مارتے ہوئے پانی پر ڈولتی کشتیوں میں بیٹھتے اور کشتی آہستہ آہستہ آئینے کی طرح چمکتے ہوئے شفاف پانی کو کاٹتی ہوئی ہچکولے لینے لگتی۔ پانی کی سطح پر سر بلند درختوں کے سائے لرزنے لگتے۔ جیسے وہ ہوا کے جھونکوں سے جھوم گئے ہوں۔

ہفتہ دس دن گزرے ہوں‌گے کہ ایک دن مالک شہر سے ایک خط لے‌کر لوٹے۔ خط ”باورچن نادیژدا،، کے نام کا تھا۔ مالک نے اس خط کو جب نادیژدا کے لئے پڑھا تو وہ رو پڑی۔ یوں پھوٹ کر روئی کہ اپرن پر لگی کالک سے اس کا چہرہ بھی کالا ہو گیا۔ وہ رو روکر نجانے کیا کہہ رہی تھی۔ بس ایک آدھ لفظ جو کان میں پڑ رہا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ پیتکا کا مسئلہ زیربحث ہے۔ شام ڈھل رہی تھی۔ پیتکا پچھلے احاطے میں اکیلا ہی ”لنگڑی ٹانگ،، کھیل رہا تھا۔ وہ منہ پھلا لیتا، کیوں‌کہ اس طرح اچھل اچھل‌کر چھلانگ لگانا زیادہ آسان تھا۔ یہ احمقانہ مگر حد سے زیادہ دلچسپ کھیل اسے میتیا نے سکھایا تھا۔ اور اب پیتکا منجھے ہوئے کھلاڑی کی طرح تنہائی میں بھی کھیل کی پریکٹس میں لگا ہوا تھا۔ اتنے میں مالک ادھر آ نکلا۔ پیتکا کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا:

”کیوں بھئی، جانا ہی پڑے‌گا!،،

پیتکا نے بوکھلا‌کر کھیسیں نکال دیں۔ بولا کچھ نہیں۔

”واہ رے بدھو،، مالک نے دل ہی دل میں سوچا۔

”جانا پڑے‌گا میرے بھائی!،،

پیتکا مسکرا دیا۔ اتنے میں نادیژدا وہاں آئی اور اس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے بیٹے کو دیکھتے ہوئے مالک کی بات کی تصدیق کی:

”ہاں میرے بچے جانا تو پڑے‌گا۔،،

”کہاں؟،، پیتکا حیران تھا۔

شہر کے بارے میں تو وہ کب کا بھول بھال چکا تھا۔ اور وہ ”دوسری جگہ،، جہاں جانے کی تمنا ہمیشہ سے دل میں انگڑائیاں لیتی رہی تھی، اب اس کو مل چکی تھی۔

”حجام اوسیپ ابراموِوچ کے پاس!،،

پیتکا کی اب بھی کچھ سمجھ میں نہ آیا، حالانکہ ساری بات روز روشن کی طرح آشکارا تھی۔ اس کا حلق خشک ہو گیا، آواز بھاری ہو گئی، اس نے بمشکل بس اتنا کہا:

''مگر ہمیں تو کل مچھلی پکڑنے جانا ہے، دیکھو یہ رہی بنسی...''

''کیا کریں بیٹے، حکم آ گیا ہے تیرے مالک کا۔ لکھا ہے پروکوپی بیمار ہوکر اسپتال میں بھرتی ہو گیا ہے اور دوکان میں آدمیوں کی کمی ہے۔ رو نہ میرے بچے۔ اس کی منت سماجت کرنا شاید پھر چھٹی دے دے! بہت نیک آدمی ہے اوسیپ ابراسووچ!''

مگر پیتکا کو تو رونے کا بھی ہوش نہ تھا، بچہ کچھ سمجھ ہی نہ سکا کہ بات کیا ہے۔ مگر رفتہ رفتہ پیتکا کے خیالات کچھ یکجا ہوئے۔ اور تب پیتکا نے وہ کیا کہ ماں پریشان ہو گئی، مالک مالکن گھبرا گئے۔ وہ رویا — اس طرح نہیں، جس طرح شہر کے چوسے ہوئے، نچڑے ہوئے، سوکھے مارے بچے روتے ہیں۔ وہ تو ایسے رویا کہ اس کی چیخوں کے سامنے بڑے سے بڑے گلےباز دیہاتی کسان کی چیخیں مات تھیں۔ تڑ سے زمین پر گرا اور مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ اس کے سوکھے مارے، چھوٹے سے ہاتھ کی مٹھی بندھی ہوئی تھی، اور وہ مسلسل کبھی ماں کے ہاتھ پر مکا مار رہا تھا کبھی زمین پر۔ اور کبھی راہ میں آنےوالی کسی اور چیز پر نوکیلے کنکروں اور تیز دھاروالی ریت پر مکے برسانے سے ہاتھ میں درد ہو رہا تھا۔ مگر وہ تو خود کو زیادہ سے زیادہ تکلیف دینے پر اتارو تھا۔

رفتہ رفتہ پیتکا کا رونا تڑپنا کم ہوا تو مالک نے مالکن سے کہا، جو آئینے کے سامنے کھڑی بالوں میں سفید گلاب لگا رہی تھی:

''دیکھا تم نے، چپ ہو گیا۔ ارے بچوں کا دکھ زیادہ دیرپا تھوڑی ہوتا ہے!''

''کچھ بھی کہو، مگر میرا تو کلیجہ کٹ رہا ہے، اس دکھیارے بچے کی وجہ سے!''

''یہ تو ٹھیک ہے کہ یہ لوگ بچارے بڑی تنگی اور مشکل میں گزارا کرتے ہیں۔ مگر دنیا میں ان سے بھی زیادہ تباہ حال لوگ بستے ہیں۔ تو تیار ہو نا میری جان؟''

اور وہ دونوں دیپمان باغ کےلئے روانہ ہو گئے۔ جہاں اس شام ڈانس کا پروگرام تھا اور فوجی دھن بجنا شروع ہو گئی تھی۔

اگلے دن صبح سات بجےوالی گاڑی سے پیتکا ماسکو روانہ ہو گیا۔ نگاہوں کے سامنے ایک دفعہ پھر رات کی اوس میں نہائے ہوئے ہرے بھرے کھیت دوڑ رہے تھے۔ مگر آج ان کا رخ اس سمت میں نہیں تھا جس سمت میں اس دن تھا، آج تو وہ اس کے عین مخالف سمت میں دوڑ رہے تھے۔ اسکولی لڑکوں‌والی پھٹی پرانی جیکٹ اس کے سوکھے مارے جسم پر جھول رہی تھی۔ پھٹے ہوئے کالر سے سفید سوتی میان تہہ جھانک رہی تھی۔ پیتکا بےحس و حرکت بیٹھا تھا۔ اس نے نظر اٹھاکر شاید ہی کبھی کھڑکی کی طرف دیکھا ہو۔ بڑے قاعدے اور سلیقے سے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ دونوں ہاتھ بڑی بےنیازی سے گھٹنوں پر

دھرے تھے۔ آنکھوں سے نیند کی کیفیت اور بےزاری عیاں تھی۔ آنکھوں کے قریب اور ناک کے نیچے بڈھوں جیسی باریک جھریاں ابھر رہی تھیں۔ اور پھر کھڑکی کے باھر اچانک کھمبوں کا ھجوم دوڑتا نظر آیا، گاڑی پلیٹ‌فارم میں داخل ھوکر رک گئی۔

تیزی سے دوڑتے بھاگتے انسانوں کے ھجوم سے ٹکراتے، بچتے وہ دونوں شہر کی چنگھاڑتی ھوئی سڑک پر نکل آئے۔ اور اس بڑے، سفاک شہر نے بڑی بےپروائی، بڑی بےحسی سے اپنے اس ننھے سے شکار کو نگل لیا۔

''بنسی سنبھال کے رکھنا ماں!،، حجام کی دوکان کے سامنے پہنچ کر بیٹے نے ماں سے کہا۔

''ضرور سنبھال رکھوں‌گی بیٹا، ضرور! خدا نے چاھا تو پھر آئےگا میرے بچے!،،

اور حجام کی گندی اور بدبودار دوکان میں ایک دفعہ پھر وھی چیخ ابھرنے لگی:
''چھوکرے، پانی‌دینا!،، اور گاھکوں کو پھر آئینے میں چھوٹا سا گندا سندا ھاتھ بڑھ‌کر پانی رکھتا نظر آنےلگا اور ان کے کان میں پھر دھنسی سی آواز ابھرتی: ''ٹھیر تو سہی!،، اس کا مطلب یہ تھا کہ یا تو نیند کے ماتے بچے نے پانی چھلکا دیا ھے، یا حکم بجا لانے میں کوئی اور گڑبڑ کردی ھے۔ اور راتوں کو جس کونے میں نیکولکا اور پیتکا ساتھ ساتھ سوتے تھے، اس کونے سے جذبات بھری دبی دبی سرگوشیوں کی آواز آتی رھتی تھی۔ ایک بچہ دوسرے کو بنگلے کی ایک ایک تفصیل بتاتا۔ وہ بتاتا کہ وھاں کیا کچھ نہ تھا۔ ایسی ایسی چیزیں تھیں جنھیں نہ کبھی کسی نے دیکھا ھوگا نہ سنا ھوگا۔ اور پھر خاموشی چھا جاتی، بچوں کے اونچے نیچے سانسوں کی آواز ابھرتی اور پھر ایک اور آواز ابھرتی — بچپن کی معصومانہ اور بھولی آواز نہیں، بلکہ گرجتی ھوئی کھردری آواز:

''کیسے شیطان ھیں! مٹ جائے ان کا نام و نشان!،،

''کون شیطان؟،،

''ارے کون کیا، سب کے سب!،،

قریب ھی کہیں سڑک پر کوئی چھکڑا گذرتا ھوتا اور اس کی گرجتی ھوئی آواز بچوں کی آواز کو دبا دیتی۔

الیکسانڈر کوپرین

سفید پوڈل

الیکساندر ایوانووچ کوپرین کی بچوں کے لئے سب سے مشہور و معروف کہانی ''سفید پوڈل،، ہے۔ کوپرین ۱۹ ویں صدی کے آخر اور ۲۰ ویں صدی کے شروع کے باکمال نثرنگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۸۷۰ء میں ایک صوبائی افسر کے خاندان میں ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنی زندگی میں طرح طرح کے کام کئے۔ وہ پیشہ‌ور فوجی، باکسر، ایک تعلقے کے مینجر، تھیٹر کے اداکار، کارخانے میں دفتری کارکن رہے، پھر انھیں سرکس نے اپنی طرف کھینچ لیا، پھر وہ ہواباز بنے اور یہاں تک کہ دانتوں کے ڈاکٹر کا کام بھی سیکھا۔ ان کی کہانیاں روسی زندگی کی رنگا رنگی اور اس کے تموّل کا آئینہ ہیں۔

قدرت کے بارے میں، جانوروں اور پرندوں کے بارے میں، تھیٹر اور سرکس کی زندگی کے مختلف واقعات کے بارے میں کوپرین کی بہت سی کہانیاں ہیں ''مینائیں،،، ''ہاتھی زیمبو،،، ''چڑیا گھر میں، اور دوسری، جنھیں بچوں کے ادب میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ ''سفید پوڈل،، ۱۹۰۴ء میں لکھی گئی تھی۔ کہانی کی بنیاد ایک سچے واقعے پر ہے جو کوپرین نے خود کرائمیا میں دیکھا تھا۔

۱۹۱۷ء کے عظیم اکتوبر انقلاب کے بعد کوپرین مہاجرت کر گئے تھے۔ ۱۹۳۷ء میں وہ اپنے وطن واپس آئے۔ انھوں نے پریس کےلئے ایک بیان دیتے ہوئے کہا کہ ''سوویت نوجوانوں کے لئے اور دلوں کو موہ لینےوالے سوویت بچوں کے لئے لکھنے کا بہت جی چاہتا ہے۔،، بدقسمتی سے کوپرین کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ سال ہی بھر بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

۱

کرائمیا کے جنوبی ساحل کی تنگ پہاڑی پگڈنڈیاں خانہ‌بدوشوں کی اُس چھوٹی سی ٹولی کو بنگلوں کی ایک بستی سے اگلی بستی کی طرف لے جا رہی تھیں۔ ننھا سا سفید پوڈل * آرتو ہمیشہ آگے رہتا — اس کے بال شیر کے انداز میں کٹے ہوئے تھے۔ وہ دوڑ رہا تھا اور اس کی لمبی سی سرخ زبان ایک طرف کو لٹکی ہوئی تھی۔ چوراھے پر پہنچ کر وہ رکتا، دم ھلاتا اور مڑ کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگتا۔ نجانے راہ کے وہ کونسے نشان تھے جو اس کے سوا کسی کو بھی نظر نہ آتے، وہ ہمیشہ صحیح راستہ بھانپ لیتا، چنچل مخملیں کان ھلاتا اور چھلانگیں مارتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ کتے کے پیچھے پیچھے بارہ سالہ سرگئی بائیں بغل میں لپٹا ہوا نمدہ دبائے چلا جا رہا تھا۔ اسی نمدے پر دنیا جہان کے کرتب دکھائے جاتے تھے۔ اس کے دائیں ھاتھ میں سنہرے پروں‌والی چڑیا کا گندہ سا تنگ پنجرہ تھا۔ چڑیا کا کام تھا چھوٹے سے ڈبے سے قسمت کا حال بتانےوالے رنگین کاغذ نکالنا۔ سب سے آخر میں ٹولی کا سردار بدحال اور بوڑھا دادا مارتین لودیژکن ھانپتا کانپتا بڑھ رھا تھا۔ بوڑھے کی دوھری کمر پر شرمانکا ** لدا ہوا تھا۔

شرمانکا بہت پرانا تھا۔ اس کی طویل زندگی نے مرمت کے نجانے کتنے مرحلے طے کئے تھے اور اب وہ ھر وقت کھانستا کھنکھارتا رہتا تھا۔ اس سے دو راگ نکلتے تھے۔ کبھی لاؤپیر کے اداس جرمن والز کی دھنیں نکلتیں اور کبھی ''سفر چین'' کی ایک چلتی ہوئی دھن نکلنے لگتی۔ یہ دونوں دھنیں آج سے تیس چالیس برس پہلے بہت مقبول تھیں لیکن اب بالکل بھلائی جا چکی تھیں۔ اس کے علاوہ ساز میں دو بدحال نلکیاں تھیں۔ تیسری نلکی تو بالکل ھی بےکار ہو چکی تھی۔ اس کی باری آتے ھی راگ ٹھٹھکتا، لنگڑاتا اور آخر تھرتھرا کے رہ جاتا۔ دوسری نلکی سے بڑے مدھم مدھم راگ نکلتے، مگر مصیبت یہ تھی کہ اس کی کنجی فوراً بند نہ ہوتی، ایک دفعہ راگ چھڑ جاتا تو وھی ایک کھرج، وھی

---

* لمبے اور گھنگھریالے بالوں‌والا کتا۔ (ایڈیٹر)

** ایک باجا جس کو خانہ‌بدوش موسیقار استعمال کرتے تھے۔ (ایڈیٹر)

ایک راگ مسلسل نکلتا رہتا ۔ راگ نکلتا اور دوسری آوازوں سے ٹکراتا تو کبھی ان پر چھاتا چلا جاتا ۔ جب تک کہ اچانک بند نہ ہو جاتا ۔ ساز کی ایک ایک کمزوری پر بڑے میاں کی نظر تھی، کبھی کبھی وہ پھبتی کستے اور ان کی آواز سے دبی دبی سی اداسی جھلکنے لگتی :

''کیا کریں، بھائی، دقیانوسی زمانے کا ساز ہے... نزلہ زکام ہو گیا بچارے کو... میں نے کوئی راگ چھیڑا نہیں کہ بنگلےوالے بھڑک اٹھے : 'تھو، کیا کباڑ ہے!' کبھی میرے راگ بڑے چلتے ہوئے، بڑے اچھے جانے جاتے تھے اور آج یہ زمانہ آن لگا ہے کہ صاحب لوگوں کو میری موسیقی ایک آنکھ نہیں بھاتی ۔ انہیں تو ''جاپانی رقاصہ،، چاہئے، ''دو سروں‌والے عقاب کے سائے میں،، اور ''چڑیوں کا سوداگر،، کا والز چاہئے ۔ اور پھر نلکیوں کا یہ رنگ ہے! میں ساز مرمت کرانے لے گیا مگر مرمت سرمت کہیں سے کچھ کام نہیں بننے کا، مستری بولا : 'نئی ڈلواؤ، بابا، نلکیاں نئی ۔ بلکہ میری مانو تو اپنے اس کوڑے کباڑ کو کسی عجائب گھر کی زینت بنا دو ۔ جانو تبرک رکھا ہے...'واہ صاحب واہ، خوب کہی! نجانے کب سے میرے اور تیرے پیٹ کا دوزخ بھر رہا ہے، کیوں سرگئی، اور خدا نے چاہا تو کچھ دن اور ساتھ دے جائیگا!،،

بڑے میاں شرمانکا پر اس طرح جان دیتے تھے جیسے وہ کوئی قریبی عزیز رشتےدار بلکہ کلیجے کا ٹکڑا ہو ۔ خانہ بدوشی کی اس طویل اور کٹھن زندگی میں باجے نے کبھی ان کا ساتھ نہ چھوڑا ۔ اور اب تو وہ بڑے میاں کےلئے جیتا جاگتا رفیق بن چکا تھا ۔ کبھی کبھی انہیں کسی گندی سرائے کے احاطے میں رات بتانی پڑتی ۔ ایسے میں شرمانکا ہمیشہ بڑے میاں کے سرہانے زمین پر دھرا رہتا، کبھی کبھی اچانک اس سے ایک کمزور اداس اور تھرتھراتی ہوئی سی آواز پیدا ہوتی جیسے کوئی بےیار و مددگار بوڑھا کراہ رہا ہو ۔ لودیژکن اس کے نقشین پہلو کو تھپک کر محبت بھری آواز میں سرگوشی کرتا :

''زندگی پھولوں کی سیج نہیں ہے، میرے دوست! .. کوئی‌بات نہیں، تو جی برا نہ کر، میرے یار !،،

بڑے میاں کو اپنی جہاں‌گشتی کے چھوٹے ساتھیوں پوڈل اور ننھے سرگئی سے بھی اتنا ھی لگاؤ تھا جتنا شرمانکا سے بلکہ شاید اس سے بھی کچھ زیادہ ۔ آج سے پانچ سال پہلے بڑے میاں نے ایک شرابی رنڈوے موچی سے یہ لڑکا ''کرائے،، پر لیا تھا ۔ لڑکے کا کرایہ کوئی دو روبل مہینہ طے پایا ۔ لیکن رنڈوا موچی جلد ھی مرگیا ۔ زندگی کے تقاضوں اور محبت کے بندھنوں نے بڑے میاں اور سرگئی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک کر دیا ۔

۲

پگڈنڈی بلند اور ڈھلواں ساحل کے ساتھ ساتھ دوڑ رہی تھی، زیتون کے صدیوں پرانے جھنڈ کے سائے تلے پہنچ کر بل کھاتی چلی گئی تھی ۔ کبھی کبھی درختوں کے جھنڈ

سے سمندر کی ایک جھلک نظر آتی اور حد نظر تک ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر ایک پرسکون اور بلند دیوار کی طرح ابھرتا ہوا معلوم ہوتا۔ چاندی کی طرح جھلملاتے ہوئے سبز پتوں کے رنگارنگ جھروکوں سے اس کا رنگ اور زیادہ گہرا، اور زیادہ نیلا معلوم ہونے لگتا۔ گھاس کے تختوں، قزل کی جھاڑیوں، جنگلی گلابوں، انگور کے باغیچوں اور درختوں کے جھنڈوں میں ٹڈے تیز آواز میں شور مچا رہے تھے۔ ان کی ایکسری اور گونجدار جھنکار سے ہوا جیسے تھرتھرا رہی تھی۔ دن بہت گھٹا گھٹا سا تھا۔ ہوا کا نام و نشان نہ تھا اور تپتی ہوئی زمین پاؤں کو جھلس رہی تھی۔

سرگئی حسب معمول بڑے میاں کے آگے آگے چل رہا تھا، اچانک وہ رک کر بڑے میاں کے قریب پہنچنے کا انتظار کرنے لگا۔

"کیوں، سرگئی، رکا کیوں؟" بڑے میاں نے پوچھا۔

"بڑی سخت گرمی ہے، دادا، اب تو سہا نہیں جاتا! ذرا ایک آدھ ڈبکی لگا لیتے!"

بڑے میاں نے چلتے چلتے عادتاً شرمانکا کمر پر ٹھیک طرح جمایا اور آستین سے چہرے کا پسینہ پونچھا۔

"واہ کیا بات کہی ہے!" انھوں نے سرد آہ بھرکر کہا اور بڑے شوق سے ٹھنڈے ٹھنڈے نیلگوں سمندر کو تکنے لگے۔ "مگر، بیٹا، دوچار ڈبکیاں لگانے کے بعد تو گرمی بالکل ہی نڈھال کر دےگی۔ میرا ایک ملنےوالا چھوٹا ڈاکٹر ہے، وہ کہتا تھا کہ یہ نمک آدمی کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ ساگر کا نمک ہے، کوئی مذاق نہیں ہے!.."

"کون جانے جھوٹ بولتا ہو،" سرگئی نے بےیقینی سے کہا۔

"جھوٹ کی ایک ہی رہی، لو اور سنو، جھوٹ کیوں بولےگا بھلا؟ بڑا بھلا آدمی ہے، بچارا شراب کباب سے دور ہی دور رہتا ہے، سیواستوپول میں چھوٹا سا گھر ہے اس کا۔ یوں بھی یہاں سے سمندر تک جانے کا کوئی راستہ بھی نظر نہیں آ رہا۔ میسخور پہنچنے تک دم لے۔ وہاں پہنچتے ہی اپنے گنہگار جسم دھو لیںگے۔ دن کو کھانے سے پہلے ایک آدھ ڈبکی لگا لیں تو بڑا اچھا رہتا ہے... نہایا کھایا اور پھر ذرا کی ذرا کمر سیدھی کر لی۔ واہ کیا کہنے!"

آرتو کو پیچھے سے باتوں کی آواز آئی تو وہ مڑا اور بھاگتا ہوا ادھر آ گیا۔ چمکتی ہوئی دھوپ میں اس کی نرم نرم ہلکی نیلی ہوشیار آنکھیں جھپکنے لگیں، نگاہوں میں بڑی گھلاوٹ پیدا ہو گئی، سانس پھول گیا اور لٹکی ہوئی زبان تھرتھرانے لگی۔

"کیوں بھائی کتے، کیوں؟ بڑی گرمی ہے کیا؟" بڑے میاں نے کہا۔

کتے نے زبان موڑ کر لمبی سی جمائی لی، اس کا ننھا سا بدن تھرتھرایا اور وہ باریک سی آواز میں رو دیا۔

"کیا کریں، بھائی، کچھ بس نہیں چلتا ان کا۔ کیوں جی، وہ کیا کہاوت ہے مکھڑا پسینے میں بھیگا ہوا، بدن نڈھال،" لودیژکن تو اچانک وعظ کرنے لگا۔ "ارے تجھ سے بات

کرتے ہوئے مکھڑا نہ کہا تھوتھنی کہہ دیا، مگر بات تو وہی ہے، میاں!.. اچھا اچھا، چلو اب آگے بڑھو، چلو دوڑو، یوں سٹرگشت کرنے سے کام نہیں چلنے کا۔ سچی بات یہ ہے، سرگئی، کہ مجھے تو یہ گرمی بڑی بھاتی ہے۔ بس ذرا یہ باجا کمر توڑے دے رہا ہے۔ روزی کمانے کی جھنجھٹ نہ ہوتی تو میں تو یہیں کسی درخت کے سائے تلے گھاس پر یوں ہی پڑا رہتا۔ ہماری بوڑھی ہڈیوں کےلئے تو جانو دھوپ ہی سب کچھ ہے۔،،

پگڈنڈی نیچے گہرائی کی طرف دوڑ رہی تھی۔ پتھر جیسی سخت کشادہ اور جھلملاتی ہوئی سفید سڑک کے قریب پہنچ کر پگڈنڈی جیسے اچانک کھو گئی تھی۔ اس سے آگے کسی کاؤنٹ کا بوڑھا باغ پھیلا ہوا تھا۔ باغ کی ہریالی میں چاروں طرف دلکش بنگلے، رنگا رنگ کیاریاں، ہرے بھرے سے پودےگھر اور خوبصورت فوارے بکھرے ہوئے تھے۔ لودیژکن ان جگہوں سے خوب اچھی طرح واقف تھا، سال کے سال انگور کی فصل اترتی تو کرائمیا بھر میں خوش‌پوش دولت‌مند اور منچلے بانکوں چھیلوں کا زور رہتا۔ اس زمانے میں بڑے میاں بستی بستی گھوما کرتے تھے۔ جنوبی علاقوں کی شان و شوکت اور رنگینی بڑے میاں کے دل کے تاروں کو چھیڑنے میں ناکام رہتی، مگر سرگئی نے پہلی دفعہ اس دھرتی پر قدم رکھا تو فطرت کے حسن کو دیکھ کر قدم قدم پر جھوم اٹھا۔ میگنولیا اور اس کے کھردرے اور چمکدار پتے، جن پر قدرت کے ہاتھوں نے روغن سا کر رکھا تھا، اس کے رکابی جتنے بڑے بڑے سفید پھول، انگور کے بڑے بڑے خوشوں کے بوجھ تلے جھکی ہوئی بیلوں سے ڈھکے ہوئے سرسبز کنج، صدیوں پرانے چھتنار چنار، ان کے تناور تنے اور سیمیں چھال، تمباکو کے کھیت، چشمے اور جھرنے اور سرسبز کیاریوں، باڑھ اور بنگلوں کی دیواروں پر لہلہاتے اور مہکتے ہوئے خوش‌رنگ اور حسین گلاب — غرض کہ دھکتی اور مہکتی ہوئی اس زندگی کے حسن نے لڑکے کی سیدھی سادھی روح میں وجدانی کیفیت پیدا کر دی۔ وہ گھڑی گھڑی بڑے میاں کی آستین پکڑ پکڑ کر کھینچتا :

”دادا، ائے دادا، ذرا دیکھو تو سہی اس فوارے کی مچھلیاں سونے کی ہیں، سونے کی! خدا قسم، دادا، کھرا سونا ہے، جھوٹ نکلے تو کھڑے کھڑے سر کاٹ لو!،، لڑکا باغ کی آہنی باڑھ میں سر گھسا کر چلایا جس کے بیچوں بیچ ایک بڑا سا تالاب تھا۔ ”ارے، دادا، آڑو! دادا، ارے، دادا، کتنے بہت سے ہیں! ایک درخت پر!،،

”چل، آگے چل، بدھو، یہاں کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے،، بڑے میاں ہنستے ہوئے اسے دھکیلتے۔ ”ابھی کیا ہے، ابھی تو ہم نوواروسیئسک جائیں‌گے اور پھر دوبارہ جنوب کی طرف چل پڑیں‌گے۔ وہ ہے زوردار جگہ — دیکھنے کی چیز ہے، دیکھنے کی۔ ابھی کیا ہے، ابھی تو ہم سوچی جائیں‌گے، آدلیر اور توآپسے جائیں‌گے۔ اور پھر سوخوسی اور باتوسی۔ دیکھ کر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں‌گی۔ تو ٹھیر تو سہی، بیٹا۔ ارے پام کے درخت ہی کو لے لو۔ کیا لاجواب چیز ہے! روئیں‌دار تنا، نمدے جیسا سمجھ لو اور ایک ایک پتا اتنا بڑا کہ ہم دونوں کو ڈھک لے۔،،

''خدا قسم؟''، سرگئی نے خوشی اور حیرت سے کہا۔
''ارے تو ٹھیر تو سہی۔ خود اپنی آنکھ سے دیکھ لینا! ایک کیا، هزاروں چیزیں هیں وهاں تو! نارنگیاں هیں، لیمو هیں، دوکانوں میں دیکھا ہے نا تو نے؟''
''هاں۔''
''تو وہ بھی دیکھےگا تو۔ سیدھے درخت میں پھلتی ہے، جانو اپنے هاں کے سیب ناشپاتیوں کی طرح۔ اور وهاں بھیا، ان علاقوں کے باسی بھی بالکل عجیب هیں: ترک هیں، ایرانی هیں اور بھانت بھانت کے چرکیسیائی۔ سب کے سب لبادے پہنے خنجر لٹکائے۔ باپ رے باپ، بڑے کٹھور لوگ هیں! اجی کبھی کبھی تو کالے بھجنگ حبشی بھی نظر آجاتے هیں۔ باتومی میں تو میں نے نہ جانے کتنی بار دیکھا ہے۔''
''حبشی! جانتا هوں، جانتا هوں، ارے وهی نا جن کے سینگ هوتے هیں''، سرگئی نے یقین سے کہا۔
''نہیں، بکواس ہے، یہ سینگ وینگ کچھ نہیں هوتے ان کے! هاں، رنگ ان کے جوتے سے زیادہ کالے هوتے هیں، اجی بڑی چمک هوتی ہے ان کے رنگوں میں۔ یہ موٹے موٹے سرخ هونٹ، بڑی بڑی سفید آنکھیں اور کلی بھیڑ کے سے گھنگھریالے بال۔''
''بڑے ڈراؤنے دکھائی دیتے هوں گے، یہ حبشی تو!''
''کیا بتاؤں تجھے؟ نظر عادی نہ هو تو سچی بات ہے آدمی سہم جائے پر جب دیکھتے هیں کہ دنیا زمانے کے اور دوسرے لوگ نہیں ڈرتے تو اپنی بھی ذرا همت بندھتی ہے... ارے بیٹا، بھانت بھانت کی چیزیں هیں وهاں تو۔ خود اپنی آنکھ سے دیکھ لینا۔ بس ایک جھنجھٹ ہے، بخار کی مصیبت ہے۔ کمبخت۔ هر طرف دلدل هی دلدل هیں، گندگی ہے اور پھر گرمی کس بلا کی ہے۔ وهاں والوں کو تو، بھیا، پتہ بھی نہیں چلتا، اثر هی نہیں هوتا ان پر مگر همارے جیسے بدیسیوں کی جان پر بن جاتی ہے۔ هوں، چاهے کچھ بھی هو، میاں سرگئی، همیں تمھیں اب باتیں هوچکیں، اب کام کرنا پڑےگا۔ چل آ، اس چھوٹے پھاٹک سے اندر آجا۔ اس بنگلے میں بڑے نیک صاحب لوگ رهتے هیں۔ ارے میں کیا نہیں جانتا، میرے بھیا۔ مجھ سے پوچھ — کیا پوچھنا ہے تجھے!''
مگر آج کے دن تو جیسے بدبختی ان کی تاک میں بیٹھی تھی۔ کہیں دور هی سے دھتکارے گئے، کہیں باجے کے خرخراتے هوئے بھنچے بھنچے سر سنکر صاحب لوگوں کی تیوری چڑھ گئی، اور بالکونیوں سے اشارے کر کر کے انھیں بھگا دیا گیا۔ کہیں کہیں ملازموں نے بتایا کہ ''مالک ابھی نہیں آئے''۔ دو بنگلوں میں تماشا دکھانے میں کامیاب بھی هوئے تو انعام واجبی هی واجبی ملا۔ مگر سچی بات ہے بڑے میاں چھوٹے سے چھوٹے انعام پر بھی کبھی منہ نہ بناتے۔ سڑک پر نکلتے هوئے وہ بڑی خوشی اور اطمینان سے جیب میں تانبے کے سکے کھنکھناتے۔
''دو اور پانچ کتنے هوئے بھلا، سات کوپک''، وہ هنس کر کہتے۔ ''کیوں، بھائی

سرگئی، یہ بھی بڑی دولت ہے، میاں ۔ سات ضرب سات کتنے ہوئے — آدھے روبل برابر تو ہو ہی گئے ۔ تو جی سمجھو ہم تینوں کے لئے پیٹ بھرنے اور رات کو پڑ رہنے کا ٹھکانا تو ہو ہی گیا، بڈھے اور بدحال لودیژکن کو گھونٹ دو گھونٹ شراب بھی چاہئے، کیا کریں، بھائی! ہائے مگر ان صاحب لوگوں کو کون سمجھائے! بیس کوپک تو ہاتھ سے چھٹ نہیں سکتے، اور پانچ کوپک دینا شان کے خلاف ہے ۔ بس جی دور ہی سے نکالو نکالو ہوجاتا ہے! خالی ہاتھ لوٹانے سے بہتر ہے، بھائی، تین کوپک ہی تھما دو ۔ میں بگڑتا تو نہیں، بھلا میری اوقات ہی کیا، بگڑنا کس بات پر ۔،،

یوں بھی لودیژکن خاموش طبیعت آدمی تھا، دھکے دے دے کر نکال دو تب بھی اف نہیں کرے گا ۔ لیکن آج تو ایک موٹی تازی، خوبصورت اور بظاہر بڑی نیک‌دل خاتون نے اس کے سکون کو چکنا چور کردیا ۔ یہ عورت پھولوں کے باغیچوں سے گھرے ہوئے خوبصورت بنگلے کی مالکہ تھی ۔ اس نے بڑی توجہ سے راگ سنا اور اس سے بھی زیادہ توجہ سے سرگئی کے کرتب اور آرتو کے دلچسپ تماشے دیکھتی رہی ۔ پھر وہ بڑی دیر تک لڑکے سے اس کا نام اور عمر پوچھتی رہی اور یہ پوچھتی رہی کہ اس نے یہ کرتب کہاں سیکھے، بوڑھا اس کا کیا لگتا ہے، اس کے ماں باپ کیا کرتے تھے وغیرہ وغیرہ ۔ پھر اس نے انہیں رکنے کو کہا اور خود اندر چلی گئی ۔

دس منٹ گزرے اور پھر شاید پندرہ منٹ بیتے، اور وہ باہر نہ نکلی، وقت گزرتا رہا اور فن‌کاروں کی موہوم امیدیں بڑھتی چلی گئیں، بڑے میاں نے تو احتیاطاً ہاتھ سے منہ چھپا کر چھوکرے سے سرگوشیوں میں یہاں تک کہہ ڈالا :

”لے، لے، سرگئی ۔ قسمت کھل گئی اپنی تو ۔ میں جانتا ہوں، بیٹے، سب کچھ جانتا ہوں، وہ ضرور ہمیں جوتے یا کپڑے دے‌گی، پکی بات ہے !،،

آخر خاتون بالکونی میں آئی، سرگئی کی ٹوپی میں چھوٹا سا روپہلی سکہ ڈالا اور تیزی سے اندر چلی گئی ۔ یہ سکہ ایک بہت پرانا دس کوپک کا سکہ تھا جو دونوں طرف سے گھسا ہوا تھا، یہی نہیں بلکہ اس میں چھید بھی ہو گیا تھا ۔ بڑے میاں بڑی دیر تک حیران و پریشان کھڑے اسے دیکھتے رہے ۔ اور پھر وہ سڑک پر نکل آئے ۔ مگر بنگلے سے بہت دور پہنچنے پر بھی سکہ اسی طرح بڑے میاں کی ہتیلی پر دھرا تھا جیسے بڑے میاں اسے تول رہے ہوں ۔

”اونہہ ... اف... گھٹیا!،، اچانک وہ رکتے ہوئے بڑبڑائے ۔ ”اتنا تو میں ضرور کہوں‌گا — اور ہم تینوں احمق جی جان سے اسے خوش کرنے کی کوشش کر رہے تھے ۔ اس سے تو کمبخت کوئی بٹن وٹن ہی دے دیتی ۔ بلا سے کہیں ٹانک ہی لیتے ۔ اس کباڑ کا کیا کروں‌گا میں؟ بی بی جی سوچتی ہوگی بوڑھا رات برات کو چالاکی سے کسی کو دے دلا دیگا ۔ نہیں، بی‌بی جی، نہیں، تم نے بوڑھے کو سمجھنے میں غلطی کی، بوڑھا لودیژکن ایسی حرکت نہیں کرنے کا! کیا سمجھیں! لو یہ لو اپنی دولت، لو اپنے دس کوپک! لیجاؤ !،،

اس نے بڑے غرور اور نفرت سے سکہ پھینکا اور وہ ہلکی سی جھنکار کے ساتھ سڑک کی سفید گرد میں دفن ہو گیا۔

سو بڑے میاں، لڑکے اور کتے نے اس ڈھنگ سے سارے بنگلوں کا چکر لگا ڈالا اور اب وہ ساحل کی طرف جانےوالے تھے۔ بس ایک بنگلہ باقی تھا، بائیں ھاتھوالا آخری بنگلہ، احاطے کی اونچی سی سفید دیوار نے بنگلے کو نظروں سے اوجھل کر رکھا تھا۔ دیوار کے دوسری طرف گرد میں اٹے ہوئے نازک اندام سرو کی قطار سر بلند تھی جیسے بہت سی لمبی اور سیاہ سیاہ سی سلائیاں کھڑی ہوں۔ لیکن فولاد کے چوڑے چکلے نقشین پھاٹک سے، سرسبز و شاداب مخملیں لان کا ایک حصہ اور دائرہ نما کیاریاں نظر آرہی تھیں۔ دور پس منظر میں انگور کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی ایک روش کی ہلکی سی جھلک نظر آ رہی تھی۔ لان کے بیچوں بیچ مالی کھڑا ہوا لمبے نلکے سے گلاب میں پانی دے رہا تھا۔ اس نے نلکی کے منہ پر انگلی جمائی اور سورج نے پانی کی پھواروں کو دھنک کے تمام رنگوں سے مالا مال کر دیا۔

بڑے میاں نے چلتے چلتے ذرا کی ذرا پھاٹک سے جھانک کر دیکھا تو حیران کھڑے رہ گئے۔

''ذرا ٹھیر تو سہی، سرگئی،، انھوں نے لڑکے کو آواز دی۔ مجھے لگتا ھے اندر کچھ لوگ گھوم پھر رہے ھیں۔ عجیب بات ھے، بھائی! نجانے کتنی دفعہ یہاں سے گزر ہوا ھے میرا۔ مگر کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ سرگئی، میرے بیٹے، چل۔،،

'' 'بنگلہ' دوستی، ، اندر آنا منع ھے،، سرگئی نے پھاٹک کے ستون پر لٹکا ہوا خوبصورت کتبہ پڑھا۔

''دوستی؟،، انپڑھ بڑے میاں نے آواز میں آواز ملائی۔ ''وہ مارا! کیسا سندر نام ھے — دوستی! دن بھر تقدیر خراب رھی، بس اب ساری کمی پوری ہو جائیگی۔ میں تو شکاری کتے کی طرح دور ھی سے سونگھ لیتا ہوں، بیٹا۔ تت، تت، تت، آرتو، آرتو! چل بے، سرگئی، خدا کا نام لے کر چل۔ ارے تو مجھ سے پوچھا کر، مجھ سے۔ میں سب جانتا ہوں، بھائی!،،

۳

باغ کی روشوں پر بچھی ہوئی بجری کی موٹی تہہ قدموں کے نیچے چرچرا رھی تھی۔ روشوں کے دونوں طرف گلابی گھونگھوں کی گوٹ لگی ہوئی تھی۔ کیاریوں میں گھاس کے رنگا رنگ قالین پر صدرنگ پھول مسکرا مسکرا کر ھوا میں بھینی بھینی خوشبو بسا رھے تھے۔ فواروں میں اجلے پانی کی صاف شفاف پھواریں کلیلیں کر رھی تھیں۔ درختوں میں لٹکے ہوئے خوبصورت گملوں میں ھری بھری بیلوں کے ھار جھول رھے تھے۔ مکان کے

سامنے سنگ‌مرمر کے ستونوں میں گیند جیسے دو آئینے جگمگا رہے تھے۔ ان کے سامنے پہنچتے ہی بڑے میاں، سرگئی اور کتا اچانک سر نیچے، ٹانگیں اوپر کھڑے نظر آئے۔ ان کے چہرے کھنچ کر لمبے ہو گئے تھے اور صورتیں بگڑی ہوئی تھیں۔

سرگئی نے بالکونی کے سامنے کی صاف ستھری اور ہموار زمین پر نمدہ بچھایا، بڑے میاں نے شرمانکا جمایا اور ہینڈل گھمانا چاہتے تھے کہ اچانک ایسی گڑبڑ مچی کہ سب اپنا کام چھوڑ چھاڑ ادھر متوجہ ہو گئے۔

آٹھ دس سال کا ایک لڑکا گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختا ہوا اس تیزی سے برآمدے میں آیا کہ اچانک فضا میں بم سا پھٹ پڑا۔ اس کے جسم پر جہازی کا ہلکا پھلکا سوٹ تھا، بازو اور ٹانگیں ننگی تھیں۔ اس کے گھنگھریالے سنہرے بالوں کی کاکلیں شانوں پر بکھر گئیں۔ چھ آدمی بچے کے پیچھے پیچھے بھاگے: آگے آگے اپرن میں ملبوس دو عورتیں تھیں، ان کے پیچھے اردلی تھا، لمبے لمبے سنہرے گل‌مچھوں‌والے بوڑھے موٹے اردلی کا چہرہ داڑھی مونچھ کی قید سے آزاد تھا اور اس کے موٹے جسم پر کالا کوٹ منڈھا ہوا تھا۔ لال ناک اور لال بالوں‌والی سوکھی ماری لڑکی جو چارخانے‌دار نیلے فراک میں ملبوس تھی، اس کے بعد جالی کے ہلکے نیلے ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس کمزور اور نڈھال نوجوان حسینہ بدحال نظر آئی۔ حسینہ کے پیچھے پیچھے سنہری عینک‌والا گنجا اور موٹا شخص تھا۔ یہ حضرت تسر کے سوٹ میں ملبوس تھے۔ وہ سب گھبرا گھبرا کر ہاتھ چلا رہے تھے، زور زور سے چیخ کر ایک دوسرے سے ٹکرائے جا رہے تھے۔ ظاہر ہے ان کی اس بدحواسی اور گھبراہٹ کا سبب یہ لڑکا تھا جو یوں اچانک بم کے گولے کی طرح پھٹ پڑا تھا۔

اور اس پورے وقت میں اس ہنگامے کے بانی کی چیخیں پل بھر کو بھی کم نہ ہوئیں۔ وہ بھاگتے بھاگتے پختہ فرش پر اوندھے منہ گرا، فوراً پیٹھ کے بل لوٹ گیا اور زور زور سے ہوا میں ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ باقی لوگ اس کے اردگرد دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔ بوڑھا اردلی منت سماجت کر رہا تھا۔ اس کے گل‌مچھے پھڑک رہے تھے اور وہ بار بار کلف‌دار قمیص میں چھپے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ رکھ کر بڑی عاجزی اور خوشامد سے کہہ رہا تھا:

"مائی باپ، سرکار، نکولائی اپولونووچ! اسی کو ہلکان نہ کیجئے، مالک۔ اٹھ جائیے... میں ہاتھ جوڑتا ہوں، دوا پی لیجئے مالک، بہت میٹھی دوائی ہے، شربت ہے شربت۔ خدا کے لئے اٹھیئے، سرکار..."

اپرن‌والی عورتیں ہاتھ مل رہی تھیں اور گھبرائی گھبرائی سی خوشامدی آواز میں کچھ بک رہی تھیں۔ لال ناک‌والی لڑکی انتہائی المیہ چہرہ بنائے بہت دردناک آواز میں کچھ چیخ رہی تھی لیکن وہ نجانے کس دیس کی زبان میں چیخ رہی تھی کہ کچھ بھی پلے نہ پڑ سکا۔ سنہری عینک‌والا آدمی کبھی ادھر گردن ٹیڑھی کرتا کبھی ادھر اور بڑی سنجیدگی سے ہاتھ اٹھا اٹھا کر گرجدار اور گمبھیر آواز میں لڑکے کو نصیحت کر رہا تھا۔ نڈھال

حسینہ برابر جالی کے نفیس رومال سے آنسو پونچھ رہی تھی اور انتہائی دردناک آواز میں بین کر رہی تھی۔

''آہ ٹریلی، اف میرے خدا! ہاتھ جوڑتی ہوں، میرے ننھے فرشتے۔ سنو تو سہی دیکھو تو امی کتنے پیار سے کہہ رہی ہیں۔ لو پیو، دوا پی لو، تمھیں فوراً آرام آجائیگا۔ پیٹ کی تکلیف بھی جاتی رہےگی اور سر کا درد بھی۔ لو میری خاطر پی لو، میرے چاند! ٹریلی، تو کیا چاھتا ہے، امی تیرے پاؤں پکڑ لے، بیٹے؟ اچھا لو میں تمھارے پاؤں پکڑتی ہوں۔ اشرفی لےگا میرا لال؟ بول! بولو، ٹریلی، دو اشرفیاں لوگے یا پانچ؟ ڈھیچوں ڈھیچوں کرنےوالا چھوٹا سا گدھا لوگے؟ بچھیڑا منگواؤں تیرے لئے؟ ڈاکٹر، اسے سمجھائیے، ڈاکٹر!''

''ٹریلی، دیکھئے مرد بنئے، ٹریلی''، سنہری عینک‌والے موٹے شخص کی بھاری بھرکم آواز ابھری۔

''آوئی — ئی — آوئی — ئی!''، لڑکا برآمدے میں تڑپنے اور جنونیوں کی طرح لاتیں چلا چلا کر چلانے لگا۔

وہ انتہائی پریشان تھا، اسے سخت تکلیف ہو رہی تھی، مگر کچھ بھی ہو، وہ کھڑے بیٹھے سب کے پیٹ اور ٹانگوں پر لاتیں مار رہا تھا لیکن وہ سب بڑی پھرتی کے ساتھ اپنے آپ کو بچاجاتے۔

سرگئی بہت دیر سے بڑے تجسس اور حیرت سے اس ھنگامے کو دیکھ رہا تھا، آخر اس سے رہا نہ گیا، اس نے آھستہ سے بڑے میاں کی پسلیوں میں کہنی ماری۔

''دادا، کیا ہو گیا اسے، دادا؟''، اس نے آھستہ سے پوچھا۔ ''کوڑے ماریں گے کیا اس بچارے کو؟''

''لو اور سنو ضرور ماریں‌گے کوڑے! ابی وہ تو خود ھی ان سب کی مرمت کر کے رکھ دےگا۔ لاڈوں میں بگاڑ رکھا ہے لونڈے کو۔ کچھ جی برا ہو گیا ہے شاید۔''

''پاگل ہو گیا؟''

''اب مجھے کیا معلوم؟ ذرا چپ رہ!''

''اوھے — اوھے!''، لڑکا اور زیادہ زور سے چلانے لگا۔ ''کمبخت! بیوقوف!''

''چل، سرگئی، شروع کر، میں خوب جانتا ہوں!''، اچانک لودیژکن نے حکم دیا اور بڑے زور و شور سے شرمانکا کا ھینڈل گھمانے لگے۔

باغ میں پرانے ساز کی منمنی سی خرخر گونج اٹھی۔ برآمدے میں کھڑے ہوئے لوگ چونکے اور پل بھر کو تو لڑکا بھی چپ ہو گیا۔

''یا خدا، میرے بچے بچارے کو پریشان کرنے کہاں سے آ گئے یہ کمبخت!''، نیلے ڈریسنگ گاؤن‌والی خاتون دردناک آواز میں چلائیں۔ ''ارے انھیں نکالو، نکالو فوراً ان کمبختوں کو! اور ان کے اس گندے پلیت کتے کو بھی بھگاؤ۔ ان کتوں کمبختوں کو ھمیشہ بڑی خطرناک بیماریاں ہوتی ہیں۔ ارے بت کیا بنے کھڑے ہو، ایوان!''

انھوں نے انتہائی بیزاری اور نفرت سے رومال ہلایا کہ ان تینوں کو فوراً نکال دیا جائے ۔ لال ناک والی لڑکی نے آنکھیں نکال کر انھیں گھورا اور ھجوم میں سے کوئی جھن جھن کر کے چیخا ۔ کوٹ والا اردلی بڑی پھرتی سے زینے سے اترا اور دراتا ھوا بڑے میاں کے پاس پہنچا ۔ اس کی آنکھوں سے آگ برس رھی تھی اور بازو بڑی خفگی سے ھوا میں لہرا رھے تھے ۔

''ا — ابے یہ کیا بیہودگی ھے، بڈھے؟،، وہ انتہائی بھاری اور گھٹی گھٹی سی آواز میں غرایا ۔ اس کی آواز سے دھمکانے کا انداز بھی جھلک رہا تھا اور خوف کے جذبات بھی ۔ ''کس کی اجازت سے اندر قدم رکھا؟ بن بلائے چلے آ رھے ھیں؟ دور ھو جاؤ ! نکلو یہاں سے !،،

باجے سے بےسری سی کراہ نکلی اور وہ خاموش ھو گیا ۔

''اجی، بھلے آدمی، تم بات تو سنو میری،، بوڑھے لودیژکن نے بڑی شرافت سے کہا ۔

''بات کی ایسی کی تیسی! دور ھو جا!،، اردلی چلایا اور اس کے حلق سے عجیب سی سیٹی نکلتی چلی گئی ۔

لمحے بھر میں اس کا تھل تھل چہرہ لال انگارہ ھو گیا اور آنکھیں پھیل گئیں، جیسے اب نکلیں تب نکلیں ۔ اس کی بھیانک صورت دیکھ کر بڑے میاں بےاختیار دو قدم پیچھے ھٹ گئے ۔

''چل بھی، سرگئی، سمیٹ سامان،، اس نے تیزی سے باجا کندھے پر رکھتے ھوئے کہا ۔ ''چل !،،

لیکن وہ چند قدم بھی نہ گئے تھے کہ برآمدے میں پھر ایسی چیخیں ابھریں کہ کانوں کے پردے پھٹنے لگے ۔

''آوں — ھو — ں — ں، مجھے دو ! میں چاھتا ھوں، بلاؤ، مجھے دو ! میں سنوں گا !،،

''مگر، ٹریلی! اف میرے خدا، ٹریلی! ارے جلدی کرو، واپس بلاؤ اب کمبختوں کو !،، اختلاجی طبیعت کی عورت کراھی ۔ ''ایسی لعنت ھے، کیسے ناکارہ ھیں سب کے سب ! ایوان، سنا نہیں میں کیا کہہ رھی ھوں؟ واپس بلاؤ ان بھکاریوں کو !،،

''ھو — و — و — ! اجی او ! سننا ذرا ! اے سنو ! اجی کیا نام ھے تمھارا، باجے والو ! لوٹ آؤ، جلدی کرو !،، برآمدے سے بہت سی آوازیں ابھریں ۔

موٹا اردلی ربڑ کی بڑی گیند کی طرح پھدکتا ھوا مداریوں کے پیچھے دوڑ رہا تھا اور اس کے گلمچھے ھوا میں اڑ رھے تھے ۔

''ٹھیرو جی، سازندو ! ٹھیرو، سنو تو سہی!،، وہ ھانپ رہا تھا اور ھاتھ ھلا کر چلا رہا تھا ۔ ''اچھے اجی بھلے آدمی، اجی او بڑے میاں!،، آخر اس نے بڑے میاں کی آستین پکڑ لی ۔ ''چلو واپس چلو ! صاحب لوگ تمھارا تماشا دیکھنا چاھتے ھیں ۔ جلدی کرو !،،

''واہ جی واہ، خوب رہا!،، یوں تو بڑے میاں نے غصے سے سر ھلا کر ٹھنڈا سانس لیا

لیکن دیکھتے دیکھتے برآمدے میں واپس آ پہنچے۔ کندھے سے شرمانکا اتار کر اپنے سامنے رکھا، اور ناچ گیت کے وھی بول بجانے لگے جن پر پہنچ کر پچھلی دفعه رکنا پڑا تھا۔

برآمدے کا ھنگامه ختم ھوگیا۔ خاتون، لڑکا اور سنہری عینک‌والے صاحب کٹہرے کے قریب آگئے۔ باقی لوگ تعظیماً پیچھے کھڑے رھے۔ مالی بھی اپنے اپرن سمیت بڑے میاں سے تھوڑی دور پر کھڑا ھو گیا۔ دربان بھی اچانک نجانے کہاں سے آکر مالی کے پیچھے کھڑا ھوگیا — لمبا چوڑا جسم، گھنی ڈاڑھی اور چیچک کے نشان، تنگ پیشانی اور اداس چہرہ۔ اس کی نئی کوری گلابی قمیص پر گہری سیاہ بندکیوں کی آڑی آڑی دھاریاں پڑی ھوئی تھیں۔

ناچ کی دھن کی تھرتھراتی ھوئی خرخراھٹ کے ساتھ سرگئی نے زمین پر نمدہ پھیلایا اور کینوس کی پتلون اتار پھینکی (پرانی بوری سے بنائی ھوئی پتلون میں ٹھیک بیٹھنے کی جگه کارخانے کا نشان چمک رھا تھا)، اس کے بعد سرگئی نے پرانی صدری اتاری اور اب اس کے جسم پر بنے ھوئے پھٹے پرانے نیکر کے سوا کچھ نه تھا۔ نیکر مرمت کی نجانے کتنی منزلوں سے گزرنے کے باوجود اس کے دبلے پتلے، مضبوط اور لچکیلے جسم پر بڑا جچ رھا تھا۔ اس نے بڑے آدمیوں کی نقل کر کرکے ماھر نٹوں کے تمام گر، تمام انداز سیکھ لئے تھے۔ وہ نمدے کی طرف لپکا، لبوں پر ھاتھ رکھے اور پھر بازو پھیلا دئے جیسے دو چنچل بوسے تماشائیوں کی طرف پھینک رھا ھو۔

بڑے میاں ایک ھاتھ سے باجے کا ھینڈل گھما گھما کر کھانستا کھنکارتا اور خرخراتا ھوا اداس نغمه پیدا کر رھے تھے اور دوسرے ھاتھ سے لڑکے کی طرف مختلف چیزیں اچھال رھے تھے، لڑکا بڑی پھرتی سے فضا ھی میں ان چیزوں کو پکڑ لیتا۔ سرگئی کے تماشوں کا ذخیرہ تھوڑا تھا لیکن کھیل دکھانے کا ڈھنگ بہت اچھا تھا۔ بقول نٹوں کے وہ اپنا کام ''صفائی سے،، کرتا تھا اور پورے جوش سے کرتا تھا۔ پہلے اس نے بیئر کی خالی بوتل اچھالی۔ بوتل سیدھی الٹی ھوکر ھوا میں اچھلتی رھی اور پھر اچانک اس نے اس بوتل کو پلیٹ کے کنارے پر الٹا ٹکا لیا اور کئی سکنڈ تک اسی طرح ٹکائے رھا۔ پھر ھڈی کی چار گیندوں اور دو شمعوں سے کرتب دکھائے۔ وہ ایکدم شمعیں اچھالتا اور انھیں لپک کر شمع‌دان پر روک لیتا۔ اور پھر تین قسم کی چیزوں کا کرتب دکھایا — پنکھا، ایک لکڑی کا سگار اور چھتری۔ یه سب چیزیں ھوا میں اچھلتی اور گرتی رھیں لیکن ایک دفعه بھی زمین تک نه پہنچنے پائیں اور پھر اچانک چھتری اس کے سر پر تھی، سگار منه میں اور پنکھا انتہائی مغرور تھرتھراھٹ کے ساتھ اس کے چہرے کو ھوا دے رھا تھا۔ آخر میں سرگئی نے نمدے پر کئی قلابازیاں کھائیں، ''مینڈک،، دکھایا، ''امریکی گانٹھ،، کیا اور ھاتھوں پر چلا۔ اپنے کرتبوں کا خزانه لٹانے کے بعد اس نے تماشائیوں کی طرف دو بوسے اور اڑائے، ھانپتا بوڑھے کے پاس گیا اور باجا لے بیٹھا۔

اور اب آرتو کی باری تھی۔ کتا بھانپ گیا، اور پہلے ھی سے گھبرا گھبرا کر

بھونکنے اور اچھل اچھل کر بڑے میاں کی طرف لپکنے لگا۔ کون جانے یہ چلتا پرزہ یہ کہنا چاھتا ھو کہ جب سائے میں بھی تپش کا یہ حال ھو، تھرماسیٹر کا پارہ ۲۲ ڈگری سے اوپر پہنچ رھا ھو تو یہ سب کرتب دکھانا کہاں کی عقل‌مندی ھے۔ لیکن بوڑھے دادا نے بڑی چالاکی سے پیٹھ کے پیچھے سے پتلا سا چابک نکالا۔ ''میں پہلے ھی جانتا تھا!،، آرتو آخری دفعہ خفگی سے بھونکا اور بےدلی سے اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ھو گیا۔ اس کی جھپکتی ھوئی نگاھیں مالک کے چہرے پر جمی ھوئی تھیں۔

''چل بے، آرتو! شاباش!،، بڑے میاں نے پوڈل کے سر پر چابک کڑکاتے ھوئے کہا۔ ''مڑ جاؤ... ایسے، شاباش، مڑمڑ اور مڑ، اور اور، اور مڑ — ایک دفعہ پھر۔ اور اب ناچ، میرے یار، ناچ، اب بیٹھ جا! کیا؟ بیٹھےگا نہیں؟ بیٹھ، کہہ رھا ھوں بیٹھ۔ ھا۔ کیا کیا! خبردار! اور اب خواتین اور حضرات سے کہو 'مزاج شریف، اے بول، آرتو!،، بڑے میاں نے بلند آواز میں دھمکایا۔

''وھو — ھو — و — و!،، پوڈل نفرت سے بھونکا۔ پھر اس نے اپنے مالک کی طرف دیکھا اور اداس نگاھیں جھپکا کر دو دفعہ اور بھونکا۔

''ارے، بڑے میاں، تم ذرا بھی نہیں سمجھتے مجھے!،، اس کی اداس بھوں بھوں کہہ رھی تھی۔

''اب ٹھیک ھے۔ اول سلام پیچھے کلام اور تھوڑا لے، بھئی، اب ذرا اچھل کود ھو جائے!،، بڑے میاں نے زمین پر چابک گھما گھما کر کہا۔ ''آلے، زبان نہ نکال، اے، ھاؤپ! یہ بات، واہ رے، میرے کتے، گھر پر پھر میں گاجر دوں‌گا تجھے۔ ارے ھاں مگر تجھے تو گاجر پسند ھی نہیں؟ لو میں تو بھول ھی گیا، اچھا لے، اب میرا ھیٹ لے اور صاحب لوگوں سے بخشش مانگ۔ کون جانے انھیں تجھ پر رحم آ جائے، اور کوئی بڑھیا چیز مل جائے۔،،

بڑے میاں نے کتے کو پچھلی ٹانگوں پر کھڑا کیا اور پھٹی پرانی اور تیل چپڑی ھوئی ٹوپی اس کے منہ میں ٹھونس دی، اس ٹوپی کو انھوں نے مذاقاً ھیٹ کا نام دیا تھا۔ آرتو نے ٹوپی دانتوں میں دبا لی اور بڑی شائستگی سے برآمدے کی طرف گیا۔ زرد رو خاتون کے ھاتھ میں سیپی کا چھوٹا سا بٹوہ چمکا۔ کھڑے بیٹھے لوگ بڑے معنی خیز انداز میں مسکرائے۔

''دیکھا؟ میں نہ کہتا تھا؟،، بڑے میاں مگن ھوکر سرگئی کی طرف جھکتے ھوئے بدبدائے۔ ''اجی تم مجھ سے پوچھو۔ وہ کون سی چیز ھے جو ھم نہیں جانتے۔ روبل نہ ملا تو نام بدل دیجو میرا۔،،

عین اسی وقت برآمدے میں بڑی بھیانک چیخ بلند ھوئی۔ چیخ اتنی تیز، اتنی دلخراش تھی کہ آرتو ٹوپی چھوڑچھاڑ برآمدے سے کود کر اپنے مالک کے پاس بھاگا، وہ گھبرا کر پیچھے دیکھ رھا تھا اور اس کی دم ٹانگوں میں دبی ھوئی تھی۔

''میں یہ لوں گا — ا — ا — ا!'' گھنگھریالے بالوں والا لڑکا پاؤں پٹخ کر چلایا۔ ''میں کتا لوں گا — ا — ا — ا! ٹریلی کتا لے — لے — لے گا — ا — ا — ا — !''

''یا خدا خیر! ہائے، ارے نکولائی اپولونووچ! سائی باپ، سالک، دم لو، ٹریلی، خدا کے لئے دم لو!'' برآمدے میں پھر شور قیامت مچ گیا۔

''کتا! کتا لاؤ! مجھے کتا چاہئے، جنگلی، الو، گدھے!'' لڑکا دھاڑا۔

''مگر تو ہلکان تو نہ ہو، میری جان!'' نیلے ڈریسنگ گاؤن والی خاتون گڑگڑائیں۔ ''کتے کو پیار کرنا چاہتے ہو نا تم؟ اچھا، میرے لال، اچھا، ابھی لو منٹ بھر میں! ڈاکٹر، آپ کیا کہتے ہیں ٹریلی اس کتے کو تھپک لے تو کوئی حرج تو نہیں، ڈاکٹر؟''

''میں تو کبھی اس کی اجازت نہ دیتا'' ڈاکٹر نے انکار میں ہاتھ ہلائے۔ ''لیکن کیڑے مارنے والی دوا، مثلاً بورک ایسڈ یا کاربالک ایسڈ کے ہلکے سے پانی سے صاف کرنے کے بعد تو میں سمجھتا ہوں کہ ...''

''کتا — ا — ا!''

''ابھی لو، میرے ہیرا لالا، ابھی لو۔ تو پھر، ڈاکٹر، اسے بورک ایسڈ سے نہلانے کا حکم دوں، اور پھر ... مگر، ٹریلی بیٹے، تو اتنا ہلکان تو نہ ہو، چاند! بڑے میاں، کتے کو یہاں لاؤ۔ ڈرو نہیں، بڈھے، ہم تمھیں خوش کر دیں گے۔ سنو کوئی روگ تو نہیں ہے اسے؟ میرا مطلب ہے پاگل تو نہیں ہے نا؟ کھجلی وجلی تو نہیں ہے کمبخت کو؟''

''تھپکوں گا نہیں، میں نہیں تھپکتا!'' ٹریلی دھاڑا۔ اس کے منہ اور ناک سے بلبلے نکل رہے تھے۔ ''میں تو بالکل لوں گا! الو کے پٹھے، گدھے! میں تو بالکل لوں گا! اس کے ساتھ کھیلوں گا، روز روز کھیلوں گا!''

''سنو، بڑے میاں، ادھر آؤ، بات سنو'' خاتون نے لڑکے کی چیخوں کے باوجود اپنی آواز سنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''آؤ، ٹریلی، تمھاری چیخیں مار ڈالیں گی اسی کو۔ آخر کس کمبخت نے گھسا لیا ان مداریوں کو۔ قریب آؤ، اور قریب — ہاں ایسے۔ ٹریلی، میری جان، غصہ نہ کرو، امی تمھاری ہر بات پوری کریں گی۔ خدا کے لئے رو نہیں۔ مس، بچے کو چپ کراؤ! ڈاکٹر، خدا کے لئے... بول کیا لے گا، رے بڈھے؟''

بڑے میاں نے ٹوپی اتاری، ان کے چہرے سے انتہائی تباہ حالی ٹپک رہی تھی۔

''کرم کیجئے، عالی جاہ، جتنی آپ کی مرضی، بیگم صاحب، ہم غریب آدمی ہیں، ہمارے لئے چھوٹی سے چھوٹی بخشش بھی بہت ہے... بوڑھے پر دیا کرو، بی بی جی۔''

''اف، کیسا بے وقوف بڈھا ہے! ٹریلی، بیٹے، گلا دکھنے لگے گا تمھارا! بھئی، بات سمجھنے کی کوشش کرو، کتا میرا نہیں، تمھارا ہے، بولو کتنا لوگے؟ دس؟ پندرہ؟ بیس؟''

''اوں — ں — ں، اوں، دو نہ کتا، دو مجھے کت — تا!'' لڑکے نے اردلی کے مٹکے سے پیٹ پر لات جماتے ہوئے چیخ ماری۔

''یہ بات ہے...، معاف کیجئے سرکار'' لودیژکن ہکلایا۔ ''میں بڈھا آدمی ہوں،

جاھل گنوار، فوراً تو کوئی بات پلے ھی نہیں پڑتی۔ اور پھر ذرا اونچا سنتا ھوں۔ ھاں تو... آپ کیا دینا چاھتی ھیں سرکار؟ کتے کی قیمت؟..،،

”اف میرے خدا! بڈھا تو جان بوجھ کر انجان بن رھا ھے!،، خاتون برس پڑیں۔ ”ٹریلی کو ایک گلاس پانی دو، نرس۔ جلدی! سیدھی سی بات پوچھ رھی ھوں تم سے، کتنے میں بیچوگے کتا؟ سمجھے یا نہیں؟ کتا۔ کتا!،،

”کتا! کت — تا!،، لڑکا زیادہ زور سے اونچی آواز میں چنگھاڑا۔

لودیژکن بگڑ گیا، اس نے جلدی سے ٹوپی سر پر رکھ لی۔

”میں کتوں کا کاروبار نہیں کرتا، بیگم صاحب،، اس نے بڑے سکون اور وقار کے ساتھ کہا۔ ”اور یہ کتا تو، بیگم صاحب، ھم دونوں کا پیٹ پالتا ھے، سرکار،، اس نے ھاتھ سے پیچھے کھڑے ھوئے سرگئی کی طرف اشارہ کرتے ھوئے کہا۔ ”اس کو بیچنا ناممکن ھے۔،،

ٹریلی ریل کے انجن کی سیٹی کی طرح مسلسل دھاڑ رھا تھا۔ نرس نے اس کےلئے گلاس میں پانی دے دیا لیکن اس نے جھلاکر گلاس کا گلاس نرس کے منہ پر دے مارا۔

”ارے، احمق بڈھے، میری بات تو سن۔ دنیا کی کونسی شے ایسی ھے جسے روپیے سے خریدا نہ جا سکے،، خاتون نے کنپٹیاں دباتے ھوئے اصرار کیا۔ ”مس، جلدی کرو، چہرہ پونچھو، میری دوا لاؤ۔ تو کیا سو روبل کا ھے تمھارا کتا؟ دو سو کا ھے؟ تین سو کا ھے؟ جواب دو نا، گدھے! ڈاکٹر، خدا کےلئے اس سے کچھ کہو!،،

”چل، بھائی سرگئی، چل!،، لودیژکن بڑبڑایا۔ ”’گدھے،... چلو، میرے آرتو، چل ادھر!،،

”اے، ذرا ٹھیر تو سہی، بھلے آدمی،، سنہری عینکوالے موٹے آدمی نے افسرانہ لہجہ میں کہا۔ ”میری بات مانو، ضد نہ کرو، بھائی میرے، تیرے اور تیرے کتے کے بدلے دس روبل بھی مل جائیں تو غنیمت جانو، ارے سوچ تو سہی، بیوقوف، کتنا بہت مل رھا ھے تجھے۔،،

”ھاتھ جوڑتا ھوں، سرکار، شکریہ، مالک، لیکن...،، لودیژکن نے ایک کراہ کے ساتھ باجے کو اپنے کندھے پر لاد لیا۔ ”مگر یہ نہیں ھو سکتا، کتا بیچنا ناممکن ھے۔ کہیں اور ڈھونڈئے، مالک، رحم اےخدا! چل، سرگئی، چل آگے آگے۔،،

”پاسپورٹ بھی ھے تیرے پاس کہ نہیں؟،، اچانک ڈاکٹر گرجا۔ ”ارے تم جیسے آوارہ گردوں کی تو رگ‌رگ سے واقف ھوں میں!،،

”دربان! سیمیون، نکالو انھیں!،، غصے کے مارے خاتون کا چہرہ بگڑ گیا۔

گلابی قمیصوالا اداس صورت دربان انتہائی منحوس شکل بناکر آگے بڑھا۔

برآمدے میں قیامت مچ گئی۔ ٹریلی پوری قوت سے دھاڑ رھا تھا، اس کی ماں بین کر رھی تھی، نرس اور انا عجیب سی بولی میں بک‌بک کر رھی تھیں۔ اور ڈاکٹر شہد کی مکھی

کی طرح خفگی سے بھن بھن کر رہا تھا ۔ مگر بڑے میاں اور سرگئی کے پاس بھلا اتنا وقت کہاں تھا کہ اس قیامت کا انجام دیکھ سکیں ۔ وہ خوف اور دہشت سے کانپتے ہوئے پوڈل کے پیچھے پیچھے پھاٹک کی طرف لپکے ۔ دربان پیچھے سے انھیں ہنکا رہا تھا اور بڑے میاں کی کمر پر لدے ہوئے شرسانکا کو ٹھوکے دے رہا تھا ۔

''یہاں سٹرگشتی کریں گے، آوارہ گرد!،، اس نے دھمکایا ۔ ''خدا کا شکر ادا کر ، لعنتی گنوار ، کہ سر سلامت رہ گیا ۔ اگلی دفعہ ادھر کا رخ کیا تو یاد رکھنا میں ایک نہیں سننے کا ۔ جھونٹے کھینچتا ہوا سیدھا کوتوال کے پاس لے جاؤنگا، نکمے!،،

بڑی دیر تک بڑے میاں اور لڑکا بالکل خاموش رہے ۔ اور پھر اچانک انھوں نے کچھ اس طرح ایک دوسرے کو دیکھا جیسے پہلے سے طے کر رکھا ہو اور اچانک ہنس پڑے ۔ سرگئی کے قہقہے کی گونج پر اس کی دیکھا دیکھی بڑے میاں بھی ذرا کھسیائے کھسیائے سے مسکرا دئے ۔

''کیوں، دادا؟ تم تو سب جانتے ہو ، نا؟،، سرگئی نے مکاری سے اسے چھیڑا ۔

''ہا — ا — ں، بیٹا ۔ آج تو ہم تم مصیبت میں پھنس گئے تھے،، بڑے میاں نے سر ہلایا ۔ ''مگر کیسا بدتمیز چھوکرا ہے، کیسی بری تربیت ہے لونڈے کی، ذرا سوچو تو سہی پچیس آدمی اس کے اشاروں پر ناچتے ہیں ۔ میرا بس چلتا تو مزہ چکھا دیتا اس کو ۔ لو اور سنو ، کتا لیں گے اور کل کو کہے گا کہ آسمان سے چاند تارے توڑ لاؤ ۔ تب؟ آجا، رے آرتو ، آ میرے کتے ۔ واہ، صاحب، واہ کیا لاجواب دن ہے آج!،،

''ہاں جی، اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے،، سرگئی نے طنز کیا ۔ ''ایک بیگم صاحب نے کپڑے دئے، دوسری نے روبل بخشا ۔ سچ، دادا، تمھیں تو سب کچھ جوتے کے تلے میں نظر آجاتا ہے ۔،،

''بک بک بند کر ، رے کل کے چھوکرے،، بڑے میاں نے ہنس کر پیار سے ڈانٹا ۔ ''اور دربان سے بچ کر کیا بھاگا ہے تو؟ میں نے تو سوچا کہ بڑے میاں اس کی تو گرد کو بھی نہیں پا سکتے ۔ بڑا بھاری بھرکم آدمی ہے یہ دربان ۔،،

وہ تینوں باغیچے سے نکلے اور ٹوٹی پھوٹی ڈھلوان پگڈنڈی سے ساحل کی طرف اترنے لگے ۔ ساحل کے قریب چٹانیں ذرا پیچھے کو دبی ہوئی تھیں ۔ تنگ اور ہموار سا کنارہ بن گیا تھا ۔ یہاں سمندر کی لہریں چکنے کنکروں سے گھرے ہوئے ساحل سے اٹھکیلیاں کر رہی تھیں ۔ ساحل سے تقریباً پانچ سو گز کے فاصلے پر ڈولفن مچھلیاں پانی میں قلابازیاں کھا رہی تھیں، تھوڑی تھوڑی دیر بعد ان کی گول اور چمکدار پیٹھ کی جھلک نظر آتی اور وہ پھر غائب ہو جاتیں ۔ دور افق کے قریب، ریشمی اور نیلگوں سمندر میں گہری نیلی مخملیں گوٹ ٹنکی ہوئی تھی ۔ اس گوٹ کے کنارے کنارے مچھلی پکڑنے والی کشتیوں کے بادبان بڑے سڈول نظر آ رہے تھے ۔ سورج کی کرنوں نے بادبانوں کو ہلکا گلابی لباس پہنا دیا تھا ۔

''دادا، آؤ یہیں نہالیں،، سرگئی نے فیصلہ کن انداز سے کہا۔ اس نے چلتے چلتے کبھی ایک کبھی دوسری ٹانگ پر کود کود کر پہلے ہی پتلون اتار لیا تھا۔ ''میں تمہاری پیٹھ سے ساز اتار دوں۔،،

اس نے تیزی سے کپڑے اتارے، ننگے جسم پر ایک دھپ جمایا اور پانی میں کود پڑا۔ اس کی کھال دھوپ میں تپ تپ کر بھوری ہو گئی تھی۔ سرگئی کے کودتے ہی پانی میں لہریں اٹھیں اور ان پر جھاگ تڑپنے لگے۔

بڑے میاں نے اطمینان سے کپڑے اتارے، دھوپ سے بچنے کےلئے ننھی منی سی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر سرگئی کی طرف دیکھا اور بڑی محبت سے مسکرائے۔

''لونڈا زوردار نکل رہا ہے،، انھوں نے سوچا۔ ''ذرا دبلا تو ضرور ہے۔ ساری پسلیاں گن لو۔ مگر کچھ بھی ہو بڑا تگڑا جوان نکلےگا۔،،

''سرگئی، میں نے کہا بہت دور تک نہ تیرنا، سمندری سور لے ڈوبتے ہیں کمبخت!،،

''اجی میں دم پکڑ کر ایسا جھٹکا دوں‌گا کہ...،، سرگئی دور سے للکارا۔

بڑے میاں خاصی دیر تک دھوپ میں کھڑے بغلیں کھجاتے رہے، پھر پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے پانی میں اترے۔ غوطہ لگانے سے پہلے گنجا اور سرخ سر ڈبویا اور سوکھی ساری پسلیاں بھگوئیں۔ ان کا بےرنگ بدن بہت ہڈیالا اور کمزور تھا، ٹانگیں بےحد دبلی اور شانے کی ہڈیاں نمایاں۔ برسوں سے شرمانکا کے بوجھ تلے جھکے جھکے کمر دوہری ہو گئی تھی۔

''دادا، دیکھو، دیکھو!،، سرگئی نے پکارا اور تیزی سے پانی میں قلا بازی کھائی۔ بڑے میاں کمر کمر پانی میں کھڑے ہوئے مزے سے چھوٹی چھوٹی ڈبکیاں لگ رہے تھے۔ وہ گھبرا کر چیخے:

''اترانا بند کر، سور کے بچے، خبردار مزا چکھا دوں‌گا...،،

آرتو گھبرا گھبرا کر بھونکتا ہوا ساحل پر ادھر سے ادھر دوڑ رہا تھا۔ لو بھلا کتا گھبرائے کیسے نہیں، لڑکا تیرتے تیرتے اتنی دور جو نکل گیا۔ ''یہ جوان مردی کسی اور کو دکھانا،، پوڈل کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ ''زمین موجود ہے، بھیا، یہاں مزے میں گھومو پھرو! یہیں زیادہ مزہ آئےگا۔،،

بلکہ وہ دوڑتا دوڑتا اتنی دور نکل گیا کہ لہریں اس کے پیٹ کو چھونے لگیں۔ اس نے زبان نکال کر ذرا سا پانی پیا۔ مگر یہ نمکین پانی اسے ذرا نہ بھایا۔ ساحل کی ریت سے کلیلیں کرتی ہوئی چھوٹی چھوٹی لہروں کو دیکھ کر تو اس کے چھکے چھوٹ گئے۔ وہ جلدی سے ساحل پر چلا گیا اور سرگئی کو دیکھ دیکھ کر بھونکنے لگا۔ ''کیا ضرورت ہے آخر ان احمقانہ کرتبوں کی؟ آؤ بڑے میاں کے پاس مزے میں ساحل پر بیٹھیں۔ یہ لونڈا ساتھ ہو تو بس دھڑکا ہی دھڑکا لگا رہتا ہے!،،

''اے سرگئی، نکلتا ہے کہ نہیں، بس بہت ہو لیا!،، بڑے میاں نے آواز لگائی۔

''بس ابھی لو، دادا، ایک منٹ اور،، لڑکے نے جواب دیا۔ ''دیکھو کیسے مزے میں سرغابی کی طرح تیرتا ہوں۔ غڑا — ا — اپ!،،

آخرکار وہ تیرتا ہوا ساحل تک آیا۔ لیکن کپڑے پہننے سے پہلے اس نے جلدی سے آرتو کو گھسیٹا اور کتے کو اٹھائے اٹھائے غڑاپ سے پانی میں گیا اور اسے دور پانی میں اچھال دیا۔ کتا ہاتھ پاؤں مارتا ہوا تیزی سے ساحل کی طرف لپکا۔ چھوٹی سی ناک اور دو کان پانی پر تیر رہے تھے۔ وہ بڑی خفگی سے بھونک رہا تھا۔ باہر نکل کر پوڈل تھرتھرایا، اور بڑے میاں اور سرگئی پر ننھی ننھی بوندوں کی پھوار پڑنے لگی۔

''سرگئی، دیکھ تو سہی ہماری طرف تو نہیں آرہا یہ آدمی،، لودیژکن نے پہاڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کوئی ہاتھ ہلا ہلا کر کچھ چیختا ہوا تیزی سے نیچے اتر رہا تھا۔ یہ وہی اداس صورت دربان تھا جو کالی بندکیوں‌والی گلابی قمیص پہنے ہوئے تھا اور جس نے پندرہ منٹ پہلے دھکے دے دے کر انہیں بنگلے سے نکالا تھا۔

''اب اسے کیا چاہئے؟،، بڑے میاں نے الجھ کر پوچھا۔

٤

دربان کچھ چیختا ہوا بڑے بھدےپن سے بھاگ رہا تھا، اس کی آستینیں ہوا میں جھول رہی تھیں اور گریبان و دامن بادبان کی طرح اڑ رہا تھا۔

''اے، ہو — و — و — و! پل بھر رکنا، بھائی!،،

''ابے اب کونسا پہاڑ ٹوٹ پڑا تجھ پر!،، لودیژکن جھلا کر بڑبڑایا۔ ''ضرور وہی آرتو کا جھگڑا ہوگا۔،،

''آؤ، دادا، مار بھگائیں اسے،، سرگئی نے بہادری سے کہا۔

''اپنے جامے میں رہ، لڑکے۔ کیسے عجیب ہیں یہ لوگ، میرا مطلب ہے صاحب لوگ!،،

''تم سنو تو سہی،، دربان دور ہی سے چیخا، اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ ''بولو بیچوگے پلا؟ چھوٹے سرکار کسی طرح قابو میں نہیں آرہے، چھری تلے تڑپتے ہوئے بچھڑے کی طرح ایک ساتھ چلا رہے ہیں 'دو، جلدی دو، مجھے کتا دو!، مالکن نے مجھے دوڑایا ہے، کہنے لگیں کسی بھی قیمت پر کتا خرید کے لا!،،

''بس بہت ہوچکا، حماقت ہے تمہاری مالکن کی!،، لودیژکن کا پارہ چڑھ گیا۔ بنگلے کی نسبت یہاں ساحل پر اس کی ہمت بڑھ گئی تھی۔ ''اس جیسی کو یہاں گردانتا ہی کون ہے، تمہارے لئے ہوگی مالکن، میں تو تھوکتا بھی نہیں ایسے ایسوں پر اور بھائی، خدا کےلئے ہمارا پیچھا چھوڑو، چلتے پھرتے نظر آؤ۔،،

لیکن دربان پر ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ وہ بڑے میاں کے قریب پتھر پر بیٹھ گیا اور بڑے بےتکے ڈھنگ سے انگلی گھما کر کہنے لگا:

”ذرا سوچ تو سہی، بیوقوف آدمی!“

”بیوقوف ہوگا تو!“ بڑے میاں نے سکون سے جواب دیا۔

”پل بھر دم لو... ارے بھائی، یہ مطلب نہیں تھا میرا... کیسا نک چڑھا بڈھا ہے۔ اپنی توبہ، ذرا سوچو سہی، تمھارے کس کام کا بھلا یہ کتا۔ اجی کوئی دوسرا پلا پکڑ لو اور اسے یہ اٹھک بیٹھک سکھا دو، لو بن گیا تمھارا کام۔ کیوں؟ کچھ غلط کہہ رہا ہوں کیا؟“

بڑے میاں نے آہستہ آہستہ پتلون کے گرد پٹی کسی اور دربان کے مسلسل سوالوں کے جواب میں بڑی بےپروائی سے بولے:

”کہے جاؤ، کہے جاؤ، تمھیں جو کچھ کہنا ہے کہہ چکو تو میں اپنی کہوں۔“

”تو بھائی میرے، ذرا کی ذرا میں تیری جھولی بھر جائےگی“ دربان تیز تیز بول رہا تھا۔ ”دو تین سو روبل ادھار ودھار نہیں نقد! اس بھاگ دوڑ کے صلے میں میری بھی جیب ذرا گرم ہو ہی جائےگی، کیوں؟ ذرا سوچ تو سہی تین سو روبل نقد! مزے میں پنساری کی دوکان کھول لینا۔“

باتیں کرتے کرتے دربان نے جیب سے ساسیج کا ٹکڑا نکال کر پوڈل کی طرف اچھال دیا۔ آرتو نے فضا ہی میں گوشت جھپٹا اور ایک نوالے میں نگل گیا۔ اور پھر خوش ہوکر دم ہلانے لگا۔

”کہہ چکے؟“ لودیژکن نے دو لفظوں میں پوچھا۔

”بس جی بس، کوئی لمبی چوڑی بات تو طے کرنی نہیں۔ کتا لاؤ اور پیسے لو۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ اور بس!“

”تو یہ بات ہے!“ بڑے میاں نے چوٹ کی۔ ”تو کتا بیچ دوں؟“

”اجی فوراً بیچ دو، اور کیا چاہئے بھلا تمھیں؟ مشکل یہ ہے کہ ہمارے چھوٹے سرکار بڑے ہٹی ہیں، کسی چیز کا سودا سر میں سمایا نہیں کہ سارا گھر سر پہ اٹھا لیا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے مگر ان کی مرضی پوری ہونی چاہئے۔ اور یہ تو جب کی بات ہے جب باوا گھر پر نہ ہوں، اگر وہ بھی ہوئے تب تو ہم سب کو ناکوں چنے چبوا دیتے ہیں سرکار۔ بڑے سرکار انجنیر ہیں۔ اجی تم نے تو ضرور نام سنا ہوگا — مسٹر اوبلیانی‌نوف۔ دیس بھر میں ریلوں کا جال بچھاتے ہیں، کروڑپتی ہیں، کروڑپتی! اور یہ لڑکا ان کا اکلوتا بیٹا ہے۔ بس جی جب دیکھو تب کوئی نیا شگوفہ کھلاتا رہتا ہے۔ چلتا پھرتا ٹٹو لوں‌گا، لو جی ٹٹو حاضر ہے، مجھے کشتی دو، بس جی اچھی سے اچھی کشتی حاضر ہے۔ جو بات منہ سے نکل گئی — پوری ہوکے رہےگی۔“

”اور چاند؟“

''ہیں جی، کیا کہا جی تم نے؟''

''میں نے کہا آسمان سے چاند توڑنے کی بات کبھی نہیں کی اس نے؟''

''واہ جی واہ - کیا بات کرتے ہو تم بھی!'' دربان کچھ پریشان سا ہو گیا - ''تو کیا کہتے ہو بھائی؟ سودا طے ہو گیا؟''

اتنی دیر میں بڑے میاں بھوری صدری پہن چکے تھے جو سیونوں کے قریب سے ہری ہری سی ہو گئی تھی - وہ بڑے غرور سے تن کر کھڑے ہوئے اور ان کی جھکی ہوئی کمر نے جہاں تک اجازت دی، اکڑتے چلے گئے -

''ایک بات کہوں، میرے بھائی'' انھوں نے بڑی سنجیدگی سے کہنا شروع کیا - ''تمھارا کوئی بھائی بند ہو، یا کوئی ایسا دوست ہو، جس کا تمھارا بچپن سے ساتھ رہا ہو... روک کے، بھائی، روک کے، کتے پر بیکار ساسیج برباد نہ کرو — اجی تم خود ہی کھا لو، اس رشوت سے تمھارا کام نہیں بننے کا - ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اگر کوئی تمھارا بچپن کا مخلص دوست ہو، تو تم اسے کتنی قیمت پر بیچ دوگے؟''

''واہ کیا مقابلہ ہے!''

''ہاں، مقابلہ ہے - ہاں تو اپنے مالک سے کہہ دینا جو ریلیں بناتا ہے'' بڑے میاں کی آواز تیز ہو گئی - ''کہ ہر چیز کا سودا نہیں ہوتا، سمجھے! اور میرے کتے کو چمکارنا بند کرو، یہ ہتکنڈے بیکار ہیں، بھائی - ادھر آ بے پلے، ابے او آرتو، ابھی بتاتا ہوں! سرگئی چل، تیار ہو جا -''

''بڑے میاں، تم نرے بیوقوف ہو، بالکل بیوقوف'' آخرکار دربان پھٹ پڑا -

''خیر میں تو بیوقوف ہوں مگر تم... پاجی، تم تو کمینے ذلیل، غدار ہو'' لودیژکن نے ترکی بہ ترکی جواب دیا - ''اپنی بیگم صاحب سے ہم غریبوں کی بندگی کہنا - سرگئی، نمدہ لپیٹ! اف میری کمر، میری دکھیا کمر، چلو چلیں -''

''اچھی بات ہے!'' دربان نے معنی‌خیز انداز میں کہا -

''بالکل یہی جواب ہے!'' بڑے میاں نے جوش سے جواب دیا -

وہ تینوں اسی ساحلی سڑک پر چل پڑے، سرگئی نے اتفاقاً پلٹ کر دیکھا کہ دربان وہیں کھڑا انھیں تک رہا تھا - وہ سوچ میں ڈوبا ہوا اور فکرمند نظر آ رہا تھا - وہ آنکھوں پر جھکی ہوئی ٹوپی کے اندر پانچوں انگلیاں گھسیڑے لال بالوں بھری گدی کھجا رہا تھا -

۵

بوڑھا لودیژکن مدتوں سے جانتا تھا کہ میسخور اور الوپکا کے درمیان شاہراہ سے ذرا ہٹ کے ایک ایسا کنج عافیت ہے جہاں بیٹھ کر مزے سے کھانا کھایا جا سکتا ہے - سو وہ اپنے ساتھیوں کو وہیں لے گیا - شاہ بلوط کے خمیدہ درختوں اور گھنی جھاڑیوں کے

سائے میں زمین سے پانی کا سوتا ابل ابل کر لپک رہا تھا۔ قریب ھی گدلے پانی کے ایک بےچین اور مضطرب پہاڑی چشمے پر چھوٹا سا پل تھا۔ پانی کے اس سوتے نے زمین میں ایک اتھلا سا گڑھا بنا لیا تھا اور وھاں سے تنگ سے بل کھائے ھوئے راستے سے گزرتی ھوئی چشمے کی طرف بہہ رھی تھی جو گھاس میں بہتی ھوئی پارے کی طرح جھلملا رھی تھی۔ روزانہ صبح شام چشمے پر مذھبی ترکوں کا ھجوم نظر آتا، وہ پانی پیتے اور وضو نماز میں مصروف ھو جاتے۔

''ھمارے گناہ بہت بوجھل اور کھانا بہت ھلکا ھے،، بڑے میاں نے جھاڑیوں کے ٹھنڈے سائے میں بیٹھتے ھوئے کہا۔ ''لے، سرگئی، یا خدا تیرا شکر ھے!،،

انھوں نے کینوس کے تھیلے سے روٹی کا ٹکڑا، درجن بھر ٹماٹر، بیسارابیائی پنیر کا ایک ٹکڑا اور زیتون کے تیل کی بوتل نکالی۔ ایک چھوٹے سے چیتھڑے میں نمک بندھا ھوا تھا۔ اس چیتھڑے کی صفائی پر یقین کرنا مشکل ھی تھا۔ کھانا شروع کرنے سے پہلے بڑے میاں نے اپنے اوپر صلیب کا نشان بنایا اور بڑی دیر تک کچھ بڑبڑاتے رھے۔ پھر روٹی کے تین بڑے چھوٹے ٹکڑے کئے۔ ان میں سے سب سے بڑا سرگئی کی طرف بڑھایا۔ (لڑکے کے بڑھنے کا زمانہ ھے، اسے اچھی طرح کھلانا پلانا چاھئے)، دوسرا ذرا چھوٹا ٹکڑا پوڈل کے لئے رکھا اور سب سے چھوٹا اپنے آپ لےلیا۔

''خدا اور اس کے بیٹے کے نام پر۔ اے رحیم و کریم، ھم گناہگاروں کی نظریں تجھ پر لگی ھوئی ھیں!،، انھوں نے نہایت اھتمام کے ساتھ کھانا بانٹ کر اس پر تیل چھڑکتے ھوئے زیرلب کہا۔ ''لے، سرگئی، کھا لے!،،

تینوں نے دنیا بھر کے مزدوروں کی طرح خاموشی اور آھستگی سے یہ غریبانہ کھانا کھایا۔ فضا میں ان تینوں جبڑوں کی چپڑ چپڑ کے سوا اور کوئی آواز نہ تھی۔ آرتو تھوڑی دور پر پیٹ کے بل بیٹھا اگلے پنجوں میں روٹی دبائے اپنا حصہ کھا رھا تھا۔ بڑے میاں اور سرگئی باری باری پکے ھوئے ٹماٹروں پر نمک لگاتے جاتے اور کھاتے جاتے۔ وہ ٹماٹر کو منہ مارتے اور ان کے ھونٹوں اور ھاتھوں پر خون جیسا لال رس بہنے لگتا۔ ٹماٹر کے بعد ھر دفعہ وہ روٹی اور پنیر کا لقمہ لیتے۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے بعد انھوں نے ٹین کے ڈونگے سے پانی پیا جو انھوں نے بہتے چشمے سے بھرا تھا۔ پانی بالکل شیشے کی طرح صاف شفاف اور بےحد لذیذ تھا اور اس کی ٹھنڈک کا یہ عالم تھا کہ ڈونگے پر منے منے قطرے جم گئے۔ وہ صبح تڑکے ھی اٹھ گئے تھے اور دن بھر کی تپش اور اتنی لمبی دوڑ نے انھیں بالکل نڈھال کر دیا تھا۔ بڑے میاں کی تو آنکھیں بند ھوئی جا رھی تھیں۔ سرگئی بھی مسلسل جمائیاں اور انگڑائیاں لے رھا تھا۔

''کیوں بیٹے، ذرا سی دیر کمر سیدھی کر لیں نا؟،، بڑے میاں نے پوچھا۔ ''لا میرے بچے ایک گھونٹ پانی اور پی لوں! واہ کیا ذائقہ ھے!،، انھوں نے لمبا سا سانس لےکر ڈونگے سے لب ھٹائے اور ان کی داڑھی مونچھ پر پانی کے شفاف قطرے بہنے لگے۔

''اگر میں زار ہوتا تو دن رات بس یہ پانی پیا کرتا۔ صبح سے رات گئے تک! اے آرتو، ادھر آ! ہوں، لے، بھئی، خدا نے کھانا بھی دے دیا، کسی نے کبھی کاہے کو دیکھا ہوگا ایسا کھانا اور دیکھا بھی ہو تو چکھنے کی نوبت تو کیا آئی ہوگی! اوھو، اوھو — ھو...''

بڑے میاں اور لڑکا پھٹی پرانی صدریاں سر کے نیچے رکھ کر گھاس پر برابر برابر لیٹ گئے۔ ہوا میں خم در خم اور ہرے بھرے شاہ بلوط کی سیاہ پتیاں سرسرا رہی تھیں اور اس چلمن کے پیچھے سے شاندار اور نیلا نیلا آسمان جھانک رہا تھا۔ ایک چٹان سے دوسری چٹان کی طرف لپکتے ہوئے چشمے کی یک رنگ اور سکون خیز کل‌کل جاری تھی جیسے وہ اپنی اس سادگی وپرکاری سے کسی کو مسحور کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ تھوڑی دیر تک بڑے میاں کروٹیں بدلتے اور کوستے کراھتے رہے۔ وہ آپ ہی آپ کچھ بڑبڑا رہے تھے، لیکن سرگئی کے کانوں میں یہ آواز دور، بہت دور کسی خواب آور اور نرم و نازک مقام سے آتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ اور بڑے میاں کے الفاظ اس کے لئے اتنے پراسرار ہو گئے تھے جیسے طلسماتی کہانی کے بول ہوں۔

''پہلی بات تو یہ کہ — تیرے لئے کپڑے خریدوں‌گا، سنہرے کام کے ملنے کا گلابی لباس اور ساٹن کے گلابی جوتے... کیئف، خارکوف اور اودیسہ جیسے شہروں کی بات ہی کچھ اور ہے، اجی اس سرکس کی کیا بات ہے! ایک سے ایک لپکتی ہوئی روشنیاں، اجی ہر طرف بجلی کے قمقمے چمکتے ہیں... اور آدمی... اجی ایک ایک شو میں پانچ پانچ ہزار آدمی بیٹھتا ہے یا شاید اس سے بھی زیادہ — ٹھیک تو مجھے معلوم نہیں۔ تیرے لئے کوئی اچھا سا اطالوی نام سوچ لیں‌گے۔ ایستی‌فیئف اور لودیژکن بھی کوئی نام ہوا، بالکل بکواس ہے — باریکی اور لطافت کا نام نہیں۔ اور ہم تیرے نام کا اشتہار لگائیں‌گے — انتونیو یا اینریکو یا الفونسو۔ واہ کیا بڑھیا نام ہیں۔''

اور اس کے بعد لڑکے نے کچھ بھی نہ سنا۔ اس پر میٹھی میٹھی سی لطیف نیند چھاتی چلی گئی اور اس کا بدن کمزور اور نڈھال سا ہو گیا۔ ہر کھانے کے بعد، سرکس اور سرگئی کی قسمت کا چمکتا ہوا ستارہ بڑے میاں کے خیالات کا موضوع بن جاتا، اچانک ان تصورات کا بندھن ٹوٹ گیا اور بڑے میاں بےخبر سو گئے۔ سوتے میں ایک مرتبہ انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے آرتو کسی پر بھونک رہا ہو، نیند میں ڈوبے ہوئے ذہن میں گلابی قمیص‌والے دربان کی دھندلی سی یاد ابھری، لیکن نیند، تھکن اور گرمی نے انھیں اس قدر بےدم کر دیا تھا کہ ان سے اٹھا نہ گیا۔ البتہ آنکھیں بند کئے کئے انھوں نے کاھلی سے کتے کو آواز دی:

''اے، آرتو، کہاں چلا... ھت تیرے کی، بدمعاش!''

مگر پل بھر بعد ان کے تصورات نے الجھکر بہت ہی بے ڈھنگی اور بوجھل صورت اختیار کرلی۔

اچانک بڑے میاں سرگئی کی آواز سے چونک اٹھے۔ لڑکا چشمے کے اس پار ادھر سے ادھر بھاگ رہا تھا، گھبرا گھبرا کر سیٹی بجا رہا تھا اور انتہائی اضطراب اور خوف کے عالم میں چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا:

''اے آرتو، واپس آجا! ہو—و—و—و، ہو—و—و—و! واپس آ جا، آرتو!،،

''سرگئی، کیوں گلا پھاڑ رہا ہے بے؟،، لودیژکن نے بمشکل اپنا سویا ہوا بے جان بازو پھیلاتے ہوئے خفگی سے کہا۔

''ہوتا کیا، ہم سوئے رہ گئے اور کتا ہاتھ سے نکل گیا!،، لڑکے نے الجھ کر غصیلی آواز میں کہا۔ ''کتا غائب ہے۔،،

اس نے تیزی سے سیٹی بجائی اور پھر چیخ کر پکارا:

''آرتو—و—و—و!،،

''کیا الٹی سلٹی سوچا کرتا ہے! ابھی واپس آ جائیگا،، بڑے میاں نے کہنے کو تو کہہ دیا۔ مگر وہ تیزی سے اٹھے اور نیند میں ڈوبی ہوئی بھاری بھاری سی تھرتھراتی ہوئی آواز میں پکارنے لگے:

''آرتو، ادھر آ، او کتیا کے جنے ادھر آ!،،

وہ چھوٹے چھوٹے اور ڈگمگاتے قدموں سے پل سے ہوتے ہوئے شاہراہ کی طرف بھاگتے رہے اور کتے کو پکارتے رہے۔ نظر کے سامنے تقریباً پاؤ میل تک ہموار اور چمکتی ہوئی سفید سڑک بل کھا رہی تھی لیکن اس پر کسی متنفس کا کوئی سایہ نہ تھا۔

''آرتو! میرے ننھے آرتو!،، بوڑھا انتہائی دردناک آواز میں کراہ اٹھا۔ اور پھر اچانک وہ رکا، جھک کر سڑک کی طرف دیکھا اور دھپ سے زمین پر بیٹھ گیا۔

''ہوں، تو یہ بات ہے!،، وہ عجیب سری سری آواز میں بڑبڑایا۔ ''بیٹا سرگئی! ذرا ادھر تو آ۔،،

''اونہہ، آخر بات کیا ہے، دادا؟،، لڑکے نے گستاخی سے جواب دیا اور اس کی طرف بڑھا۔ ''گیا وقت ہاتھ لگ گیا کیا؟،،

''یہ کیا ہے، سرگئی؟ یہ—یہ کیا ہے؟ کچھ سمجھا تو؟،، بڑے میاں نے زیرلب پوچھا۔

وہ بڑی درد بھری اور مضطرب نظروں سے لڑکے کو دیکھ رہے تھے۔ اور ان کا تھرتھراتا ہوا ہاتھ زمین کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

ساسیج کا خاصہ بڑا سا بھنبھوڑا ہوا ایک ٹکڑا سفید ریت پر پڑا تھا اور اس کے چاروں طرف کتے کے پاؤں کے نشان تھے۔

''بدمعاش، دیکھا کمبخت کتے کو پھسلا کر لے گیا!،، بڈھے نے خوفزدہ ہو کر سرگوشی کی۔ وہ ابھی تک زمین پر اکڑوں بیٹھے تھے۔ ''ظاہر ہے سولہ آنے وہی تھا۔ بات صاف ہے، یاد ہے نا، سمندر کے کنارے بھی بدمعاش کتے کو ساسیج کھلا رہا تھا؟،،

''ظاہر ہے،، سرگئی نے خفگی اور اداسی سے دوہرایا۔

بڈھے کی پوری کھلی ہوئی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور وہ جلدی جلدی آنکھیں جھپکنے لگا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیا۔

''اب ہم کیا کریں، بیٹا سرگئی؟ ہیں؟ کیا کریں اب ہم؟،، بڈھے نے آگے پیچھے جھومتے ہوئے بڑی بےبسی سے کہا اور سسکنے لگا۔

''کیا کریں! کیا کریں!،، سرگئی نے غصے سے جواب دیا۔ ''اٹھو، لودیژکن دادا۔ آؤ، چلیں۔،،

''چلو چلیں،، دکھی بڑے میاں نے زمین سے اٹھتے ہوئے فوراً حامی بھری۔ ''اچھا، چلو سرگئی، چلیں!،،

سرگئی کا پارہ چڑھ گیا۔ اور وہ اس طرح بڑے میاں پر چیخنے لگا جیسے وہ ذرا سا بچہ ہوں۔

''بند کرو یہ ہائے واویلا! بس بہت ہو گئی حماقت۔ بھلا کسی کو کیا حق ہے دوسروں کے کتے اڑانے کا۔ کیا تک رہے ہو مجھے؟ کچھ غلط کہہ رہا ہوں کیا؟ ابھی سیدھے وہاں چلتے ہیں، ان سے صاف صاف کہیں گے کہ 'لاؤ ہمارا کتا!'، اور اگر نہ دیا تو ہم کچہری کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے، بس قصہ ختم!،،

''کچہری۔ ہاں، ضرور، کچہری کا دروازہ خوب!،، لودیژکن بڑبڑایا۔ اس کے ہونٹوں پر کھوکھلی اور تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ عجیب بےتکےپن اور شرمندگی سے نظریں بچانے لگا۔ ''کچہری کا دروازہ، ہاں ضرور، لیکن ایک بات یاد رکھ، بیٹا سرگئی... ہم جیسوں کی رسائی نہیں ہوگی وہاں تک...،،

''واہ، کیوں نہیں؟ قانون سب کے لئے ایک ہے۔ ہم کیوں دودھ کی مکھی کی طرح نکالے جائیں گے؟،، لڑکے نے بےتابی سے اس کی بات کاٹ دی۔

''سرگئی، خدا کے لئے مجھ پر تو نہ برس تو، اب وہ کتا کبھی بھی ہمارے پاس نہیں آ سکتا!،، اس نے بڑے پراسرار انداز سے آواز نیچی کر لی۔ ''مجھے تو پاسپورٹ کی وجہ سے دھڑکا لگ گیا۔ سنا نہیں تھا وہ صاحب کیا کہہ رہا تھا؟ بولا 'پاسپورٹ بھی ہے تمہارے پاس؟'، تو یہ بات، بھائی میرے۔ اور میرے پاس —،، بڈھے کے چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی اور وہ زیرلب کہہ رہا تھا۔ ''سرگئی، پاسپورٹ جعلی ہے۔،،

''کیوں، جعلی کیوں ہے؟،،

''بس... جعلی ہے۔ میرا پاسپورٹ تگنروگ میں کھو گیا تھا یا کون جانے کسی نے چرا لیا ہو۔ اس کے بعد دو سال تک میں ادھر سے ادھر بھٹکتا اور چھپتا چھپاتا پھرا، رشوتیں دیں، درخواستیں لکھیں، اور آخر میں نے سوچا کہ اب اس طرح چوہے کے بل میں گھس کے تو نہیں رہ سکتا۔ ہر شخص کی طرف سے دھڑکا لگا ہوا ہے۔ نہ دن کا چین رہا نہ رات کا سکون اور پھر ایک دن اودیسہ کی ایک سرائے میں ایک یونانی آپہنچا۔ 'اجی

یہ تو بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، اس نے کہا۔ 'لاؤ پچیس روبل نکالو، بڑے میاں، اس نے کہا۔ 'میں ابھی تمھارے لئے پاسپورٹ کا انتظام کر دوں‌گا جو زندگی بھر تمھارے کام آئیگا۔ ، میں نے خوب سوچا۔ خیر جی، جو ہو سو ہو، میں نے سوچا۔ 'لاؤ یہ بھی سہی، میں نے کہا۔ تو میرے بچے، اس دن سے میں کسی اور کا پاسپورٹ استعمال کر رہا ہوں۔،،

''اوہ، دادا!،، سرگئی نے گہرا سانس لیا اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ''کتے کے لئے دل تڑپ رہا ہے! اور کتنا بھلا کتا تھا!،،

''سرگئی، میرے پیارے بچے!،، بڑے میاں نے اپنے کانپتے ہوئے بازو پھیلا دئے۔ ''اگر میرے پاس اصلی پاسپورٹ ہوتا تو میری جوتی کو بھی پروا نہ ہوتی کہ جنرل ہیں کہ لاٹ، گردن دبا دیتا میں سالوں کی! 'یہ کیا حرکت ہے، میں کہتا۔ 'دوسروں کے کتے پر ہاتھ صاف کرنے کا کیا حق ہے تمھیں؟ یہ کہاں کا قانون ہے بھلا!، مگر، سرگئی، اب تو ہمارے ہاتھ کٹ گئے۔ پولیس چوکی جاؤں‌گا تو پہلی بات یہ ہوگی کہ پاسپورٹ دکھاؤ! 'تو تم سامارا کے مارتین لودیژکن ہو؟، 'جی ہاں، سرکار۔ ، لیکن، بھائی، میں تو نہ لودیژکن ہوں نہ متوسط طبقے کا شہری۔ میں تو کسان ہوں، کسان ایوان دودکن۔ خدا جانے وہ لودیژکن کون تھا کون نہیں تھا۔ ارے مجھے کیا معلوم ہو سکتا ہے کوئی چور اچکا ہو، کوئی بھاگا ہوا مجرم ہو، یا پھر قاتل ہو۔ نہیں، سرگئی، ہم کچھ نہیں کر سکتے، بیٹے... کچھ نہیں...،،

بڑے میاں کی آواز بھرا گئی، سورج میں جھلسے ہوئے جھریوں بھرے چہرے پر گرم گرم آنسو پھسلنے لگے۔ سرگئی بالکل خاموشی سے تباہ حال بڑے میاں کی باتیں سن رہا تھا، اس کی بھویں تنی ہوئی تھیں اور چہرہ جذبات کی وجہ سے زرد تھا۔ اچانک اس نے بڑے میاں کی بغلوں میں ہاتھ دے کر سہارے سے انھیں اٹھایا۔

''آؤ، دادا، آؤ چلیں،، اس نے دوستانہ انداز میں حکم دیا۔ ''بھاڑ میں جائے پاسپورٹ۔ آؤ چلیں! یہاں اس سڑک پر تو رات بسر کرنے سے رہے۔،،

''میرے بیٹے، میرے لال!،، بڑے میاں سر سے پاؤں تک کانپتے ہوئے بڑبڑائے۔ ''کتنا تیز تھا ہمارا کتا، ہمارا پیارا آرتو۔ اب کہاں ملےگا ویسا کتا!،،

''اچھا، چھوڑو، چھوڑو چلو اب اٹھو،، سرگئی نے حکم دیا۔ ''آؤ، تمھارے کپڑوں کی گرد جھاڑ دوں، دادا۔ تم تو بالکل ہی جی ہار بیٹھے، دادا!،،

اس دن فنکاروں نے کرتب نہیں دکھائے۔ سرگئی ابھی بچہ ہی تھا لیکن وہ اس خوفناک لفظ ''پاسپورٹ،، کا مطلب خوب سمجھتا تھا۔ اس لئے پھر اس نے نہ آرتو کو تلاش کرنے کی بات کی نہ منصف کے پاس جانے یا کوئی اس سے بھی زیادہ سخت قدم اٹھانے پر اصرار کیا، وہ خاموشی سے بڑے میاں کے ساتھ سرائے کی طرف چل دیا۔ مگر اس کے

چہرے پر سختی اور کرختگی کی یہ نئی جھلک ابھی تک قائم تھی، ایسا لگ رہا تھا، جیسے وہ کسی بہت بڑی بےحد اہم چیز کا منصوبہ بنا رہا ہو۔

اس سوال پر کوئی بات نہ ہوئی، لیکن شاید دونوں کے دلوں میں ایک ہی خواہش چھپی ہوئی تھی، وہ بےاختیار بل‌دار راستے پر ہو لئے تاکہ ''دوستی،، بنگلے کی ایک جھلک اور دیکھ لیں۔ وہ لمحے بھر پھاٹک پر ٹھٹکے، انھیں دھندلی سی امید تھی کہ شاید آرتو نظر آ جائے یا کم سے کم اس کی آواز ہی سن لیں۔

لیکن شاندار بنگلے کا آہنی پھاٹک اچھی طرح بند تھا۔ اور سرو کے نازک اور اداس درختوں کی چھاؤں میں پھیلے ہوئے سرسبز و سایہ‌دار باغ پر بلا کی خاموشی اور پروقار سکون چھایا ہوا تھا۔

''شریف بنتے ہیں!،، بڈھا بڑبڑایا۔ اس کے دل کی تمام تلخی، تمام زہر اس ایک جملے میں سمٹ آیا۔

''بس ختم کرو۔ آؤ چلیں،، لڑکے نے سنجیدگی سے حکم دیا اور اپنے ساتھی کی آستین پکڑ کر کھینچنے لگا۔

''سرگئی، ہو سکتا ہے ہمارا آرتو ان کے ہاں سے بھاگ نکلے؟،، بڈھے نے سسکی بھری۔ ''کیا خیال ہے تیرا، میرے بیٹے؟،،

لیکن لڑکے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بڑی ثابت‌قدمی سے آگے آگے چل رہا تھا، اس کی نگاہیں سڑک پر جمی ہوئی تھیں اور باریک باریک بھویں غصے میں تنی ہوئی۔

٦

وہ خاموشی سے الوپکا پہنچے۔ راستے بھر بڈھا کوستا کراہتا رہا اور سرگئی کے چہرے سے وہی غصہ، وہی استقلال جھلکتا رہا۔ رات بسر کرنے کے لئے وہ گندے سے ترکی قہوہ خانے میں ٹھیر گئے جس کو ''یلدیز،، یا ''ستارہ،، جیسے شاندار نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ رات کو یونانی سنگ‌تراش، زمین کھودنےوالے ترکی مزدور، طرح طرح کے اوٹ پٹانگ کام کرکے جسم و جان کا رشتہ قائم رکھنےوالے چند روسی محنت‌کش، اور بھانت بھانت کے آوارہ‌گرد ان کے ساتھ تھے، جنوبی روس میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ جیسے ہی وقت مقررہ پر قہوہ‌خانہ بند ہوا وہ سب دیواروں سے لگے ہوئے بنچوں اور زمین پر لیٹ گئے۔ ان میں سے جو زیادہ تجربہ‌کار تھے انھوں نے احتیاطاً اپنے کپڑے اور دوسری قیمتی چیزیں اپنے سروں کے نیچے رکھ لیں۔

آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی، سرگئی بڈھے کے قریب ہی زمین پر لیٹا تھا۔

وہ آہستہ سے اٹھا اور کپڑے پہننے لگا۔ کشادہ کھڑکیوں سے پھیکی پھیکی چاندنی چھن رہی تھی، زمین پر سچلتی ہوئی آڑی ترچھی کرنیں سوئے ہوئے لوگوں کے چہروں کو بڑا کربناک اور بےجان سا بنائے دے رہی تھیں۔

''لڑکے، اس رات میں کہاں جا رہے ہو؟،، قہوہخانے کے نوجوان ترک مالک ابراہیم نے نیند میں سرگئی کو پکارا۔

''مجھے جانے دو، میرا جانا ضروری ہے!،، سرگئی نے کرخت اور کاروباری انداز میں جواب دیا۔ ''اٹھ بے، ترکی بانس، اٹھتا ہے کہ نہیں!،،

ابراہیم نے دو چار جمائیاں انگڑائیاں لیں اور غصے سے زبان چٹخاتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ تاتاری بازار کی تنگ گلیاں گہرے نیلے سائے میں کھوئی ہوئی تھیں۔ کنگورےدار سایوں نے بڑھ کر دوسری طرفوالے مکانوں کے قدم چوم لئے۔ مکانوں کی چھوٹی چھوٹی دیواریں چاندنی میں چاندی کی طرح دمک رہی تھیں۔ شہر کے دوسرے سرے پر کتے بھونک رہے تھے اور سڑک سے کسی سبک رفتار گھوڑے کی ٹھپ ٹھپ کی گونج سنائی دے رہی تھی۔

لڑکا پیاز جیسے گول سبز گنبدوالی سفید مسجد کے قریب سے گزرا جو سیاہ سرو کے خاموش جھنڈ میں گھری کھڑی تھی، وہ ایک تنگ اور پرپیچ گلی سے ہوتا ہوا کھلی سڑک پر آگیا۔ سرگئی نے نٹوں کے تنگ لباس کے سوا اور کچھ نہیں پہنا تھا تاکہ دوڑنے بھاگنے میں آسانی رہے۔ اس کی پشت کے پیچھے چاند چمک رہا تھا اور اس کا کالا کالا ننھا سا سایہ آگے آگے دوڑ رہا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف اگی ہوئی سیاہ اور پرپیچ جھاڑیوں میں کوئی پرندہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد باریک سی سریلی آواز میں چیخ رہا تھا: ''سوتا ہوں! سوتا ہوں!،، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ رات کی اس خاموشی میں بڑی فرماںبرداری سے کسی اداس راز کی نگہبانی کر رہا ہو۔ وہ شاید نیند اور تھکن پر قابو پانے کی ناکام کوشش میں ناامیدی سے فریاد کر رہا تھا۔ ''سوتا ہوں! سوتا ہوں!،، سیاہ جھاڑیوں اور کہیں دور پھیلے ہوئے جنگلوں کی نیلی نیلی سی چوٹیوں کے اوپر آئیپیتری کی چوٹی کی جڑواں نوکیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں، رات کی اس تاریکی میں وہ اس قدر ہلکی، اس قدر نمایاں اور اس قدر خیالی لگ رہی تھیں جیسے کسی سیمیں دفتی کے بڑے سے ٹکڑے سے بنائی گئی ہوں۔

اس آسمانی خاموشی اور سکوت نے، جس میں اس کے قدموں کی آواز انتہائی تیزی اور دلیری سے سنائی دے رہی تھی، سرگئی کے بدن میں جھرجھری سی پیدا کر دی۔ لیکن اس کا دل عجیب سراسیمگی اور خوشگوار جرأت سے سرشار تھا۔ سڑک مڑی تو نگاہوں کے سامنے سمندر موجیں مارنے لگا۔ یہ خاموش اور وسیع سمندر بڑے سکون اور وقار کے ساتھ سانس لے رہا تھا۔ افق سے ساحل تک چمکدار اور لہراتا ہوا تنگ راستہ پھیلا ہوا تھا۔ یہ تنگ پگڈنڈی آگے چل کر سمندر میں غائب ہو گئی تھی۔ البتہ کہیں کہیں

پگڈنڈی ستارے کی طرح چمکتی اور پھر اچانک دھرتی کے قریب پگھلتی ہوئی چمکدار اور لرزاں دھات کی طرح پھیل کر جیسے پورے ساحل کو اپنی لپیٹ میں لیتی اور گوٹ سی لگادیتی۔

سرگئی چوبی چور دروازے سے دبے پاؤں باغیچے میں داخل ہوگیا۔ گھنے درختوں کے جھنڈ میں اندھیرا گھپ تھا۔ کہیں دور کوئی بےچین چشمہ کل کل کر رہا تھا اور اس کی بھیگی بھیگی سی سرد ہوا یہاں تک محسوس ہو رہی تھی۔ سرگئی کے قدموں کے نیچے پل کے تختے چرچرا اٹھے۔ پل کے نیچے بہتے ہوئے پانی کی تہہ بالکل کالی اور انتہائی خوفناک معلوم ہو رہی تھی۔ اور آخر وہ اونچا سا آہنی پھاٹک آ گیا جس پر بیل بوٹے بنے ہوئے تھے اور جس سے چنبیلی کی بیلیں بغلگیر تھیں۔ درختوں کی شاخوں سے چاندنی چھن‌چھن کر اس کے نقش ونگار پر پھسل رہی تھی اور ننھے ننھے سے ضوفگن شرارے برسا رہی تھی۔ اور اس سے آگے تاریکی کا راج تھا اور شرمائی شرمائی مگر چوکنی سی خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔

چند لمحے سرگئی جھجکا۔ وہ کچھ سہما ہوا اور خوفزدہ تھا۔ لیکن اس نے جلد ہی ان جذبات پر قابو پا لیا اور زیرلب بولا:

"کچھ بھی ہو، میں تو جاؤں‌گا! میری بلا سے آگے جو ہو سو ہو!"

پھاٹک پر چڑھنا اس کے لئے ذرا بھی مشکل نہ تھا۔ نقش و نگار کی نازک آہنی سلاخیں اس کے قوی ہاتھوں اور چھوٹے چھوٹے سڈول پاؤں کےلئے مضبوط سہارا بن گئیں۔ پھاٹک کے اوپر خاصی بلندی پر ایک چوڑی سی فولادی محراب تاج کی طرح پھاٹک کے ستونوں کو جوڑتی ہوئی سر اٹھائے کھڑی تھی۔ سرگئی کھسکتا ہوا اس تک پہنچا اور پیٹ کے بل لیٹ‌کر دوسری طرف پاؤں لٹکا دئے۔ اب وہ اپنے پورے جسم کو نیچے کی طرف کھینچ رہا تھا اور پاؤں سے سہارا ڈھونڈ رہا تھا۔ اور آخر وہ محراب کے ساتھ ہوا میں لٹک گیا، اس کی انگلیاں محراب کے سرے میں پیوست تھیں۔ لیکن اس کے پاؤں کو اب تک سہارا نہیں ملا تھا۔ اس نے تو سوچا ہی نہ تھا کہ پھاٹک کی اوپروالی محراب باہر کی نسبت اندر کی طرف بہت گہری ہے۔ آخر اس کے ہاتھ سن ہونے لگے اور نڈھال بدن بھاری پڑنے لگا۔ اس کا دل خوف سے لرز اٹھا۔

اور آخر وہ بےقابو ہو گیا، محراب کی کگر انگلیوں کی گرفت سے نکل گئی اور وہ نیچے آ رہا۔

اسے اپنے بوجھ تلے سخت اور کھردری بجری کے چرچرانے کی آواز آئی اور اس کے گھٹنوں میں درد کی تیز ٹیس اٹھی۔ وہ گرنے کی وجہ سے بوکھلایا ہوا چند سکنڈ یوں ہی چاروں ہاتھ پاؤں پر کھڑا رہا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ پل بھر میں بنگلے میں جاگ ہو جائیگی، گلابی قمیص والا اداس صورت دربان بھاگ ہوا آئیگا، شور هنگمہ ہوگا اور ہر طرف افراتفری پھیل جائیگی۔ لیکن چمن میں اب بھی وہی پہلے کی سی خاموشی اور سناٹا

تھا - باغ کی فضا پر چھائی ہوئی دھیمی اور موہوم سی سرسراہٹ کے سوا دور دور تک اور کوئی آواز نہ تھی -

''ژوں... ژوں... ژوں...،،

''اونہہ، یوں ہی کان بج رہے ہیں میرے،، اس نے سوچا اور جھٹ سے اٹھ کھڑا ہوا - تاریکی میں لپٹا ہوا چمن بڑا بھیانک و پراسرار اور بلا کا حسین لگ رہا تھا، ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی فضا میں معطر معطر سے خواب بکھرے ہوئے ہوں - اندھیرے میں کھوئے ہوئے پھولوں کے دھندلے دھندلے پیکر بڑی نزاکت سے کیاریوں میں جھوم رہے تھے - پھولوں کی ڈالیاں ایک عجیب مبہم سے اضطراب کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف جھکتیں جیسے سرگوشی کر رہی ہوں، جیسے نظروں ہی نظروں میں سرگئی کا تعاقب کر رہی ہوں - سرو کے سہکتے ہوئے نازک اندام درختوں کی تیز اور نوکیلی چوٹیاں جھوم اٹھیں، جیسے بےزبان خاموشی سرگئی کو تنبیہہ کر رہی ہوں - چشمے کے اس پار گھنی جھاڑیوں میں چھپا ہوا نڈھال سا ننھا پرندہ ابھی تک تھکے تھکے انداز میں سیٹی بجا رہا تھا اور اداسی سے فریاد کر رہا تھا:

''سوتا ہوں! سوتا ہوں! سوتا!،،

رات کی سیاہی اور روش پر پھیلے ہوئے پرپیچ سایوں کے درمیان سرگئی اس جگہ کو نہ پہچان سکا - وہ مکان تک پہنچنے کی کوششوں میں بڑی دیر تک چرچراتی ہوئی بجری پر بھٹکتا رہا -

سرگئی نے آج تک کبھی ایسے دکھ نہیں سہے تھے، اسے آج سے پہلے کبھی بےبسی، لاچارگی اور تنہائی کا ایسا احساس نہیں ہوا تھا - اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے گھر میں بہت سے ظالم بےدرد دشمن دبکے ہوئے ہوں اور تاریک کھڑکیوں سے چوری چوری اس چھوٹے سے ناتواں لڑکے کی ایک ایک حرکت کو دیکھ رہے ہوں - یہ خیالی دشمن ایک ہلکے سے اشارے، غصے میں بھرے ہوئے ایک ظالمانہ حکم کے منتظر تھے اور بڑی شیطنت اور خباثت سے مسکرا رہے تھے -

''گھر میں تو ہرگز نہیں ہوگا — نہیں، وہ گھر میں نہیں ہو سکتا،، لڑکا خواب کے سے عالم میں بڑبڑایا - ''گھر میں تو وہ رو رو کر سب کی زندگی اجیرن کر دیتا -،،

اس نے بنگلے کا چکر کاٹا - بنگلے کے عقب کے کشادہ احاطے میں کئی مکان نظر آئے جو بڑے مکان کے مقابلے میں کہیں گھٹیا تھے - یہ مکان شاید نوکروں کے لئے ہوں گے - بڑے مکان کی طرح یہ کھڑکیاں بھی تاریک تھیں - البتہ ان کے تاریک شیشوں پر پھیکی پھیکی سی چاندنی دھوپ چھاؤں کھیل رہی تھی - ''میں کبھی یہاں سے نہیں نکل پاؤں گا - کبھی نہیں!،، سرگئی نے مایوسی سے سوچا - پل بھر کو اسے لودیژکن کا خیال آیا، ننھا سا پرانا شرمانکا یاد آیا، قہوہخانے میں گزاری ہوئی راتیں یاد آئیں اور سرد چشموں کے کنارے

بیٹھ کر کھانا کھانے کا خیال آیا۔ ''یہ سب اب کبھی نہ ہوگا، کبھی نہیں!،، اس نے دکھی ہوکر سوچا۔ جیسے جیسے ناامیدی بڑھی ویسے ویسے اس کے دل میں خوف کی جگہ ایک عجیب گہری پرسکون اور بےدرد اداسی گھر کرتی چلی گئی۔

اچانک ایک باریک سی کراہ کی آواز سن کر اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ سرگئی دم سادھ کر پنجوں کے بل کھڑا ہو گیا، اس کے جسم میں ایک عجیب تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔ کراہ کی آواز دوبارہ ابھری، شاید یہ آواز اس پختہ تہہ‌خانے سے آ رہی ہے جس کے قریب سرگئی کھڑا تھا۔ دیوار میں بنے ہوئے چند چھوٹے چھوٹے چوکور سوکھے شیشے کی قید سے آزاد تھے۔ سرگئی پھولوں کا تختہ پھلانگتا ہوا تیزی سے دیوار کے پاس پہنچا اور سوکھوں میں سے ایک کے پاس منہ لیجاکر سیٹی بجائی۔ کہیں نیچے سے ہلکی سی دبی دبی آواز آئی مگر فوراً ہی غائب ہو گئی۔

''آرتو، آرتو!،، سرگئی نے تھرتھرائی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔

اچانک کتے کی جنونی اور فریادکن چیخیں ابھریں اور باغ کے کونے کونے میں گونج گئیں، ان چیخوں میں شکایت بھی تھی، غصہ بھی تھا، دکھ بھی تھا اور ساتھ ہی سواگت کی خوشی بھی۔ کتا تاریک تہہ‌خانے میں کھینچاتانی کرنے لگا۔ وہ اپنے بندھنوں کو توڑنے کی جان‌توڑ کوشش کر رہا تھا۔

''آرتو، میرے ننھے کتے! آرتو!،، لڑکے نے دردبھری آواز میں پکارا۔

''خاموش رہ، لعنتی!،، اندر سے وحشیانہ بھاری چیخ ابھری۔ ''لعنتی، وبال جان!،، تہہ خانے میں کچھ شور سا ہوا اور کتے کی دبی دبی سی طویل چیخ سنائی دی۔

''خبردار، اس پر ہاتھ اٹھایا تو اچھا نہیں ہوگا! ارے کمبخت، کتے کو ہاتھ نہ لگا!،، سرگئی جنون کے عالم میں چلایا اور ناخنوں سے پتھریلی دیوار کو کھرچنے لگا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ سرگئی کو بہت دھندلا دھندلا سا یاد ہے، جیسے وہ نیم بےہوشی کے عالم میں ہو۔ تہہ‌خانے کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور دربان دراتا ہوا باہر نکلا، اس کے پاؤں ننگے تھے اور بدن پر صرف ایک نیکر تھا۔ اس کی داڑھی مونچھ اور چہرہ چاند کی سیدھی کرنوں کی روشنی میں پیلے پیلے سے نظر آرہے تھے۔ سرگئی کو ایسا لگا جیسے کوئی دیو، کوئی خونخوار جن نکل آیا ہو۔

''کون ہے بے؟ گولی سے اڑا دوں‌گا تجھے!،، باغ میں اس کی آواز گرجی۔ ''چور، چور، دوڑو، پکڑو!،،

مگر عین اسی وقت آرتو بھونکتا اور سفید گیند کی طرح اچھلتا ہوا تاریک دروازے سے نکلا۔ اس کی گردن میں رسی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا لٹک رہا تھا۔

مگر اب سرگئی کو کتے کا ہوش نہ تھا۔ دربان کی خوفناک اور بھیانک صورت دیکھتے ہی اس پر ایک عجیب غیرسرئی سا خوف چھا گیا۔ اس کے پاؤں جیسے زمین میں

گڑ گئے اور چھوٹا سا تنا ہوا جسم سن ہو گیا۔ خیر شکر ہے کہ بدحواسی اور مدھوشی کی یہ کیفیت زیادہ دیر قائم نہ رہی۔ سرگئی نے تقریباً نیم بےہوشی کے عالم میں ایک دلدوز اور دلخراش چیخ ماری اور خوف کی وجہ سے بدحواس اور پاگل سا اندھا دھند تہہخانے سے دور بھاگنے لگا۔

اس کے قوی اور سبک پاؤں زمین کو روند رہے تھے اور وہ خرگوش کی طرح ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کی آہنی ٹانگوں کی طاقت اچانک لوٹ آئی تھی۔ آرتو خوشی سے بھونکتا ہوا اس کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ دربان جھنجھلا جھنجھلا کر گالیاں بک رہا تھا اور بھاری بھاری قدموں سے ان کا پیچھا کر رہا تھا۔

سرگئی بھاگتا بھاگتا پھاٹک تک پہنچ گیا، سوچنے سمجھنے کا موقع نہ تھا لیکن سرگئی نے پلک جھپکتے میں تاڑ لیا کہ وہاں سے نکلنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ پتھر کی سفید دیوار اور اس کے قریب اگے ہوئے سرو کے درختوں کی قطار کے درمیان ایک تاریک اور تنگ سی پگڈنڈی دوڑ رہی تھی۔ وہ بلا سوچے سمجھے خوف و دہشت کا ستایا ہوا سیدھا اس طرف گھسا اور دیوار کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔ سرو کی سوئی جیسی نوکیلی پتیاں جن کی رال کی سخت خوشبو ہوا میں بسی ہوئی تھی اس کے چہرے پر تھپڑ مار رہی تھیں، کئی دفعہ وہ درختوں کی جڑوں سے ٹکرا کر گرا اور اس کے ہاتھوں پر خراشیں پڑ گئیں لیکن ہر دفعہ وہ اٹھتا اور پھر بھاگ کھڑا ہوتا۔ اسے تو جیسے درد کا احساس ہی نہ تھا، وہ خود اپنی چیخوں سے بےخبر جھکا جھکا سا بھاگتا رہا۔ آرتو تیر کی طرح اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

وہ ایک وسیع و عریض جال میں پھنسے ہوئے ننھے سے پرندے کی طرح خوفزدہ سا اس تنگ راستے پر بےتحاشہ بھاگ رہا تھا جس کے ایک طرف دیوار اور دوسری طرف قطار در قطار سرو سربلند تھے۔ اس کا منہ سوکھ گیا اور ہر سانس کے ساتھ سینے میں ہزاروں سوئیاں چبھنے لگیں۔ دربان کے قدموں کی آوازیں کبھی دائیں اور کبھی بائیں طرف سے آ رہی تھیں۔ لڑکا پاگل سا ہو کر کبھی آگے دوڑتا اور کبھی پھر پیچھے پلٹ جاتا۔ کئی بار پھاٹک کے پاس سے گزرا اور پھر اسی تاریک اور تنگ پگڈنڈی پر دوڑنے لگا۔

آخر اس کی ٹانگوں نے جواب دے دیا۔ وہ انتہائی خوفزدہ تھا، مگر پھر بھی دل پر یاس و ناامیدی کے بادل چھانے لگے اور وہ خطروں کی طرف سے کچھ بےنیاز سا ہو گیا۔ اب وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھا تھا، اپنے تھکے ہوئے نڈھال جسم کو تنے سے ٹکا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ دشمن کے بھاری قدموں تلے چرچراتی ہوئی ریت کی آواز قریب اور قریب آ رہی تھی، آرتو کی ناک سرگئی کے گھٹنے پر ٹکی ہوئی تھی اور وہ آہستہ آہستہ بھونک رہا تھا۔

لڑکے سے گز دو گز کے فاصلے پر پھیلی ہوئی شاخیں یکبارگی سرسرا کر ہٹ گئیں،

اس نے بےخیالی میں نظر اٹھائی اور اچانک خوشی سے دیوانہ سا ہوکر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اب تک دیکھا ہی نہ تھا کہ وہ جس جگہ بیٹھا ہے وہاں دیوار تین ساڑھے تین فٹ سے زیادہ اونچی نہیں ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ منڈیر پر بوتل کی کرچیں چونے میں جڑی ہوئی تھیں۔ مگر سرگئی نے اس کی ذرا بھی پروا نہ کی۔ پلک جھپکتے میں اس نے آرتو کو اٹھایا اور اسے اگلی ٹانگوں کے سہارے دیوار کی منڈیر پر بٹھا دیا۔ ہوشیار کتا اس کے ہر ہر اشارے کو سمجھ گیا۔ وہ اچھلا اور دم ہلا ہلاکر نہایت فاتحانہ انداز میں بھونکنے لگا۔

ایک ہانپتا کانپتا سیاہ ہیولا سرو کی شاخیں ہٹاکر اس جگہ نمودار ہوا۔ ٹھیک اسی وقت سرگئی بھی کتے کے پیچھے پیچھے دیوار پر چڑھا، دو چست و چالاک پیکر بڑی سبک‌رفتاری سے سڑک پر کود گئے۔ ان کے پیچھے وحشیانہ اور گندی گالیوں کا طوفان سا پھٹ پڑا۔

شاید دربان ان دو دوستوں کے مقابلے میں سست رفتار تھا یا باغ میں ان کا تعاقب کرتے کرتے تھک‌کر چور ہو چکا تھا یا شاید ان فرارشدہ مجرموں تک پہنچنے کی امید ختم ہو چکی تھی، بہرحال جو بھی ہو اس نے ان کا پیچھا کرنا چھوڑ دیا۔ پھر بھی وہ دونوں بڑی دیر تک دم لئے بنا بھاگتے چلے گئے۔ دونوں طاقت‌ور اور پھرتیلے تھے اور آزادی کی خوشی میں ہوا سے باتیں کر رہے تھے۔ جلد ہی پوڈل کی شوخی اور کھلنڈراپن عود کر آیا۔ سرگئی اب بھی کبھی کبھی خوفزدہ نظروں سے پیچھے دیکھ لیتا۔ لیکن آرتو شرارت سے اس پر جھپٹ رہا تھا، خوش ہوکر کان اور رسی کا ٹکڑا ہلا رہا تھا اور لڑکے کا منہ چاٹنے کےلئے سو سو جتن کر رہا تھا۔

البتہ اس چشمے پر پہنچ کر سرگئی کے دم میں دم آیا جہاں انھوں نے کل کھانا کھایا تھا۔ لڑکے اور کتے نے ٹھنڈے ٹھنڈے چشمے سے منہ لگا دیا، اور بڑی دیر تک بےتابی سے اس کا تازہ اور خوش‌ذائقہ پانی پیتے رہے۔ وہ ایک دوسرے کو پرے دھکیلتے، لمحے بھر کو سانس لینے کے لئے منہ اوپر اٹھاتے، ان کے ہونٹوں سے پانی ٹپکنے لگتا اور پھر ان کی پیاس چمک اٹھتی اور وہ پھر پانی کی دھار پر جھک جاتے، لاکھ کوشش پر بھی پانی سے منہ ہٹانا مشکل تھا۔ آخر وہ بمشکل وہاں سے چلے تو ان کے مشک جیسے بھرے ہوئے پیٹوں میں پانی چھلک چھلک کر بج اٹھا۔

خطرہ گزر چکا تھا۔ رات کے بھیانک واقعات قصہ پارینہ ہو چکے تھے اور اب وہ دونوں بڑے مزے میں تاریک جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی اور چاندنی میں نہائی ہوئی سفید سڑک پر لپک رہے تھے۔ صبح کی شبنم نے جھاڑیوں کے منہ دھلا دئے تھے اور ان کی تازہ دم پتیوں سے صبح کی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔

قہوہ‌خانے ''یلدیز،، میں ابراہیم نے ملامت بھری سرگوشی سے سرگئی کا سواگت کیا:

''یوں آوارہ پھرنے کا کیا مطلب ہے، لڑکے؟ کیا مطلب ہے؟ تم نے بہت برا کام کیا۔ بہت ہی برا۔،،

سرگئی بڈھے کو بےچین کرنے کو تیار نہ تھا لیکن آرتو نے نہایت مستعدی سے یہ کام کر ڈالا، اس نے پل بھر میں زمین پر سکڑے ہوئے لوگوں کے درمیان بڑے میاں کو ڈھونڈ نکالا۔ ابھی لودیژکن کو ہوش بھی نہ آیا تھا کہ کتا خوشی سے چپڑ چپڑ کرکے اس کے پورے منہ کو چاٹ گیا۔ بڈھا جاگ اٹھا، اس نے پوڈل کی گردن میں بندھی ہوئی رسی دیکھی، گرد میں اٹے ہوئے لڑکے کو قریب لیٹے ہوئے دیکھا اور پل بھر میں سب کچھ سمجھ گیا۔ وہ سرگئی سے پوچھ گچھ کرنے کےلئے اس کی طرف متوجہ ہوا مگر لڑکا بےخبر سو رہا تھا۔ اس کے بازو پھیلے ہوئے تھے اور منہ کھلا ہوا۔

فیودر دستوئیفسکی

امیرزادوں کے بورڈنگ اسکول میں

فیودر میخائیلوچ دستوئیفسکی کے ناولوں ''جرم و سزا''، ''کراما زوف برادران'' اور ''ایڈیٹ'' سے ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہے۔ ان کے مصنف لاجواب فنکار تھے۔ شاید دنیا میں اور کوئی مصنف ایسا نہیں ہے جس نے دستوئیفسکی سے زیادہ شدت کے ساتھ اور موثر طور پر دکھ درد کے مارے ہوئے لوگوں کی، ان کے خیالات کے ادھیڑبن کی، ان کے ضمیر کے کرب کی تصویرکشی کی ہو۔ دستوئیفسکی کی تمام تصنیفات ''بڑی عمر والوں'' کے لئے ہیں اور انھیں سمجھنا بہت آسان نہیں ہے۔

لیکن ان میں تقریباً ہر ایک میں ایسے صفحات ہیں جنھیں خود مصنف نے اپنی پانچ سالہ بیٹی اور اس کے دوستوں کو سنایا اور انھوں نے ان نگارشات کے بارے میں بہت ہی قوی اور ذمہ‌دارانہ جذبات و احساسات کا اظہار کیا۔ دستوئیفسکی کا ارادہ تھا کہ انھیں جب کبھی فرصت ملےگی تو وہ ان بچوں کے لئے قابل فہم حصوں کو یکجا کرکے انھیں الگ کتاب کی حیثیت سے شائع کریں‌گے۔ انھیں خود یہ کرنے کا موقع نہ ملا۔ ۱۸۸۱ء میں ۶۰ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ لیکن ان کی وفات کے دو ہی سال بعد ایک کتاب شائع ہوئی جس کا عنوان تھا ''روسی بچوں کے لئے۔ فیودر دستوئیفسکی کی تصنیفات سے اقتباسات''۔ اس میں ''کرسمس کے جشن میں مسیح کے پاس بچہ''، ''ماریئی'' اور ناولوں ''شیطان''، ''نیتوچکا نیزنانووا''، ''جرم و سزا''، ''کراما زوف برادران'' میں سے اقتباسات شامل تھے۔ آج تک اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

دستوئیفسکی بچوں کی روح کو بہت اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اس کے لئے وہ صرف اپنے بچپن کی یادوں کو کافی نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنے ایک دوست سے درخواست کی تھی کہ ''تمھیں جو کچھ بھی بچوں کے بارے میں (واقعات، بےساختہ حرکتیں، جوابات، بات چیت اور الفاظ، کردار، خاندان سے رشتے، مذھب، برائیاں اور معصومیت، فطرت اور استاد، لاطینی زبان) معلوم ہو، وہ لکھو...'' بچوں سے اپنے رشتے کے بارے میں انھوں نے کہا کہ ''میں ان کا مطالعہ کرتا ہوں، اور ساری زندگی میں نے مطالعہ کیا اور ان سے محبت کی ہے...''

اس رشتے کو دستوئیفسکی کے ایک کردار نے سب سے زیادہ اچھی طرح بیان کیا ہے: ''معصوم اور ستائے ہوئے بچے کے ایک آنسو کے لئے میں جنت کا پروانہ بڑی خوشی سے واپس کر دوں‌گا۔''

ہمارے ہم‌عصر مشہور و معروف شاعر سیرگئی میخالکوف نے فیودر دستوئیفسکی کی کتاب ''بچوں کے لئے'' کے پیش لفظ میں، جو ۱۹۷۱ء میں اس ادیب کی ۱۵۰ ویں سالگرہ کے سلسلے میں شائع ہوئی تھی، لکھا ہے کہ ''یہ الفاظ صرف وھی ادیب کہہ سکتا تھا جو بچوں سے بہت گہری محبت کرتا ہو، جسے ان کے ہر آنسو سے، ان کو پہنچنےوالی ہر ٹھیس سے تکلیف پہنچتی ہو۔'' اسی مجموعے سے کہانی ''امیرزادوں کے بورڈنگ اسکول میں'' لی گئی جو قارئین کو امیر لوگوں کے بچوں کی ایک شہری بند درسگاہ سے روشناس کراتی ہے جہاں ایک زمیندار اور ایک کسان عورت کا ''ناجائز'' بچہ بھی پل بڑھ رہا ہے جس کو مراعات رکھنے والوں کے ''معاشرے'' میں مفروضہ عنایات کی ساری ذلتوں کا تجربہ ہوتا ہے۔

گھنٹی بج رہی تھی، خوب زور سے، نہایت قطعیت کے ساتھ، مسلسل دو بلکہ تین سکنڈ میں ایک بار - مگر یہ خطرے کی گھنٹی نہیں تھی - یہ تو بڑی دلکش، بڑی نرم اور ہموار آوازوالی گھنٹی تھی - اور اچانک مجھے احساس ہوا کہ یہ آواز تو جانی پہچانی سی ہے - ویسی ہی آواز تو تھی یہ جیسی سینٹ نکولائی کے کلیسا میں بجاتے تھے، ہمارے بورڈنگ اسکول کے عین سامنےوالے لال رنگ کے گرجا گھر میں - کتنی اچھی طرح یاد تھا مجھے بہت سے گنبدوں میناروں اور ستونوں‌والا ماسکو کا صدیوں پرانا قدیم گرجا گھر جو شاید الیکسی میخائیلووچ* ہی کے دور میں تعمیر ہوا تھا - مقدس ہفتہ ابھی ابھی ختم ہوا تھا - اور توشار کے پائیں باغ میں سربلند پتلے نازک اندام برچ کے پیڑوں پر نئی نئی کومل پتیاں لرزنے لگی تھیں - سہ پہر کے چمکیلے سورج کی آڑی شعاعیں سی ہماری کلاس میں بکھر رہی تھیں، بائیں ہاتھ پر میرے چھوٹے سے حجرے میں ایک مہمان بیٹھا تھا - یہ وہ کمرہ تھا جہاں سال بھر پہلے توشار نے مجھے ''امیر امراء کے بچوں،، سے الگ ٹھہرایا تھا - ہاں تو مجھ بےگھر بےدر کے ہاں اچانک کوئی مہمان آیا تھا، توشار کے پاس رہنے کے پورے عرصے میں یہ واقعہ آج پہلی بار ہوا تھا - جیسے ہی مہمان نے کمرے میں قدم رکھا میں انھیں پہچان گیا — یہ تو میری ماں تھیں — حالانکہ جب سے وہ مجھے دیہات کے اس گرجا گھر میں لےآئی تھیں اور ہمارے آنے سے گنبد میں بیٹھا ہوا کبوتر پھڑپھڑا کر اڑا تھا، تب سے آج تک میں نے انھیں ایک دفعہ بھی نہیں دیکھا تھا - ہم دونوں تنہا بیٹھے تھے، اور میں ٹکٹکی باندھے، حیرت سے ماں کو دیکھ رہا تھا - برسوں بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس دن ماں اپنی انتہائی تنگ دستی کے باوجود ماسکو پہنچی تھیں، ان لوگوں کی اجازت کے بغیر، ان سے تقریباً چوری چھپے جن کی سرپرستی میں اس وقت وہ زندہ تھیں، محض مجھ سے ملنے کی خاطر - مگر تعجب ہے کہ وہ توشار کے پاس پہنچ کر ان سے بات‌چیت کرتی رہیں لیکن مجھ سے اپنے منہ سے ایک دفعہ بھی

---

* الیکسی میخائیلووچ — روسی زار (۱۶۴۵ء — ۱۶۷۶ء)، پیٹر اول کے والد - (ایڈیٹر)

نہ کہا کہ میری ماں ہیں ـ وہ میرے پاس بیٹھی تھیں، اور مجھے خوب یاد ہے مجھے بڑی حیرت ہو رہی تھی کہ وہ کتنی کم گو ہیں ـ ان کے پاس ایک چھوٹی سی گٹھری تھی ـ انھوں نے گٹھری کھولی تو اس میں سے چھہ سنترے، چند ٹکڑے کیک کے اور دو معمولی قسم کی فرانسیسی روٹیاں جھانکتی نظر آئیں ـ فرانسیسی روٹی دیکھ کر میرا منہ کڑوا کسیلا ہو گیا اور میں نے بڑی تلخی سے کہا کہ یہاں ہمیں ''خوراک'' بہت اچھی ملتی ہے، اور روزانہ چائے کے ساتھ ایک ایک سالم فرانسیسی بن کھاتے ہیں ہم ـ

''خیر کوئی بات نہیں میرے ننھے کبوتر! میں تو اپنی سادگی میں یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ شاید یہاں اسکول میں بچوں کو کھانا اچھا نہ ملتا ہو، خفا نہ ہو میرے بیٹے!''

''انتونینا واسیلیونا (توشار کی بیوی) کو کتنا برا لگے گا ـ میرے ساتھی سنگی بھی مذاق اڑائیں گے ـ''

''تو تم نہیں لوگے؟ لےلو، شاید کھا ہی لو!''

''خیر ٹھیک ہے رہنے دیجئے!''

مگر وہ جو چیزیں میرے لئے لائی تھیں میں نے ان کو ہاتھ بھی نہیں لگایا ـ سنترے اور کیک اسی طرح میرے سامنے چھوٹی میز پر پڑے رہے، اور میں بظاہر بڑے رکھ رکھاؤ اور تمیز سے بیٹھا رہا ـ اگرچہ نظریں جھکی ہوئی تھیں ـ کون جانے میرا جی چاہ رہا ہو کہ ماں پر صاف ظاہر کر دوں کہ ان کے آنے کی وجہ سے میری نظریں ساتھیوں کے سامنے جھک جائیں گی ـ کچھ نہ کچھ اشارہ تو کر ہی دوں کہ ماں سمجھ جائیں کہ ''غلطی تمھاری اپنی ہے کہ مجھے ایسی شرمناک صورت‌حال سے دوچار ہونا پڑا، اور خود بات کو سمجھ بھی نہیں رہی ہو'' ـ جی چاھا اسی دم برش اٹھا کر توشار کی طرف جاؤں، اور خوب رگڑ رگڑ کر گرد اڑا ڈالوں ـ میں نے یہ بھی سوچا کہ جیسے ہی ماں جائیں گی لڑکے میرا کیسا کیسا مذاق اڑائیں گے ـ عین ممکن ہے خود توشار بھی مجھ پر ہنسیں ـ سچی بات یہ ہے کہ دل میں ماں کےلئے ذرا سا بھی محبت کا جذبہ نہیں تھا! میں کنکھیوں سے ماں کے بدرنگ، بدوضع کپڑوں کو، کھردرے، مزدوروں جیسے ہاتھوں کو، انتہائی بےھنگم جوتوں کو، اور حد سے زیادہ سوکھے مارے، ستے ہوئے چہرے کو دیکھ رہا تھا ـ ماں کی پیشانی پر سلوٹیں سی ابھرآئی تھیں ـ حالانکہ اس شام ان کے جانے کے بعد انتونینا واسیلیونا نے مجھ سے کہا تھا کہ ''معلوم ہوتا ہے تمھاری 'ممی' کسی زمانے میں خاصی قبول صورت رہی ہوں‌گی!''

ہاں تو ہم دونوں اس انداز میں بیٹھے تھے کہ اچانک اگافیا کشتی میں کافی کی پیالی رکھے اندر داخل ہوئی ـ کھانے کے بعد کا وقت تھا ـ توشار اس وقت ہمیشہ اپنے کمرے میں کافی پیتے تھے ـ لیکن ماں نے تو شکریہ ادا کرتے ہوئے کافی پینے سے انکار کردیا ـ عرصے بعد مجھے معلوم ہوا تھا کہ ماں ان دنوں کافی نہیں پیتی تھیں، دل کی تکلیف تھی نہ انھیں ـ بات دراصل یہ تھی کہ ماں کو مجھ سے ملنے کی اجازت دے کر

بھی توشاروں نے شاید دل ھی دل میں سوچا کہ انھوں نے بڑی مروت دکھائی تھی۔ مختصر یہ کہ ماں کے لئے کافی بھیج کر انھوں نے ایک طرح نہایت درجے انسانیت کا ثبوت دیا تھا۔ بلکہ کہا جائے تو یہ قدم اٹھاکر انھوں نے اپنے مہذب جذبات اور قاعدے قانون کے پیش نظر انھیں انتہائی اعزاز بخشا تھا۔ اور ماں نے جیسے یہ سب کچھ سمجھے بغیر ھی انکار کردیا!

پھر مجھے توشار نے بلوا بھیجا، انھوں نے مجھ سے کہا کہ اپنی سب کاپیاں کتابیں لے جاکر اپنی ماں کو دکھاؤ ''تاکہ وہ دیکھیں کہ میری سر پرستی میں آنے کے بعد تم نے کتنی ترقی کی ھے،،۔ اور تب اچانک انتونینا واسیلیونا نے خفگی سے ھونٹ سکوڑکر مجھ پر گویا طنزیہ وار کیا:

''معلوم ھوتا ھے تمھاری 'ممی' کو ھماری کافی پسند نہیں آئی۔،،

میں کاپیاں کتابیں اکٹھا کرکے انھیں ماں کے پاس لے گیا جو میری منتظر تھیں۔ ان کے قریب ھی کلاس کے سامنے ''امیر امرأ کے بچوں،، کا ھجوم اکٹھا ھو گیا تھا۔ سب بچے وھاں کھڑے مجھے اور ماں کو دیکھ رھے تھے۔ اور تب مجھے توشار کے حکم پر حرف بحرف عمل کرنے میں بڑا لطف آیا۔ میں بڑی باقاعدگی سے کاپیاں کھول کھول کر ماں کو سمجھاتا رھا: ''یہ ھے فرانسیسی گرامر کا سبق، اور یہ املا لکھا ھے ھم نے، یہ ھے فرانسیسی افعال avoir اور être کی گردان۔ اور یہ جغرافیے کی کاپی ھے، اس میں یورپ کے اور دنیا کے سب بڑے بڑے شہروں کے نام لکھے ھیں،، وغیرہ وغیرہ۔ مختصر یہ کہ میں کوئی آدھے پونے گھنٹے، مہذب بچوں کی طرح تمیز سے نظریں جھکائے، بچکانی اور سپاٹ آواز میں انھیں ایک ایک تفصیل بتاتا رھا۔ میں جانتا تھا کہ ماں علوم سے بالکل بےبہرہ ھیں، وہ تو شاید لکھنا بھی نہیں جانتیں۔ مگر مجھے اسی لئے اپنا یہ رول بہت بھلا لگ رھا تھا۔ پھر بھی میں ماں کو تھکانے میں کامیاب نہ ھوا۔ وہ سنتی رھیں، نہ بیچ میں ٹوکا نہ روکا، بےانتہا توجہ سے، بلکہ نہایت مرعوب ھوکر سنتی رھیں، یہاں تک کہ میں خود بتاتے بتاتے اوب گیا اور میں نے کاپیاں بند کر دیں۔ البتہ ماں کی نگاھوں میں بلا کی اداسی، بڑی گہری تاریکی تھی، اور چہرے سے عجیب دکھی دکھی کیفیت عیاں تھی۔

آخرکار وہ جانے کےلئے اٹھی ھی تھیں کہ اچانک توشار خود وھاں آگئے اور بڑی احمقانہ سی خوداعتمادی کے ساتھ ان سے پوچھا: ''بیٹے کی ترقی سے مطمئن ھیں نہ آپ؟،، ماں نے ٹوٹے پھوٹے، بےربط سے جملوں میں کچھ کہا اور ان کا شکریہ ادا کرنے لگیں۔ اتنے میں انتونینا واسیلیونا بھی وھاں پہنچ گئیں، ماں ان دونوں کی منت کرنے لگیں: ''یتیم کو بےسہارا نہ چھوڑیئےگا جناب۔ ارے اب اسے یتیم ھی سمجھئے، اس پر اپنے رحم و کرم کی بارش کرنا صاحب...،، اور انھوں نے ڈبڈبائی ھوئی آنکھوں سے دونوں کو سلام کیا، دونوں کو الگ الگ خوب جھک جھک کر، بالکل اس طرح بچھی جارھی تھیں جیسے بہت

بڑے صاحب لوگوں سے کچھ درخواست کرتے ہوئے کیا جاتا ہے۔ اسقدر عجز و انکسار کی امید تو شاید توشاروں کو بھی نہیں تھی۔ اور انتونینا واسیلیونا تو اتنی متاثر ہوئیں کہ انھوں نے کافی کے سلسلے میں اپنی رائے بھی بدل ڈالی۔ توشار نے اور بھی زیادہ بلندی اور خوداعتمادی کے اور انسان دوستی کے انداز میں اعلان کیا کہ وہ ''بچوں میں تفریق نہیں کرتے ہیں اور یہاں سب ان کے اپنے بچے ہیں۔ وہ ان سب کےلئے باپ کی جگہ ہیں، اور یہ کہ ان کی نظر میں میری تقریباً وہی حیثیت، وہی درجہ ہے جو 'امیر امرأ کے بچوں' کا ہے اور اس چیز کی قدر کرنی چاہئے،، وغیرہ وغیرہ۔ ماں کچھ بولیں نہیں، جھک کر ان کی بات کو تسلیم کیا مگر کچھ گھبرا سی گئیں، اور آخر میری طرف مڑیں، تو ان کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ گلوگیر آواز میں بولیں: ''خداحافظ میرے بچے!،،

اور انھوں نے مجھے پیار کیا — میرا مطلب ہے، میں نے انھیں پیار کرنے کی اجازت دی۔ میرے خیال میں تو وہ باربار مجھے لپٹانا چاہتی تھیں، باربار گلے لگاکر پیار کرنا چاہتی تھیں، لیکن یا تو انھیں خود ہی دوسروں کے سامنے کچھ شرم سی آ گئی یا کسی اور تلخ خیال کے تحت خاموش ہو گئیں، یا شاید کچھ اندازہ ہو گیا ہو کہ مجھے ان کی وجہ سے کتنی خجالت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، بہرحال جو بھی ہو، جلدی سے ایک دفعہ پھر توشاروں کے سامنے کورنش بجا لائیں اور تیزی سے باہر کا رخ کیا۔ میں کھڑا رہا۔

''جاؤ، اپنی ماں کو باہر تک پہنچانے جاؤ!،، انتونینا واسیلیونا نے فرانسیسی میں کہا۔ ''افوہ، کیسا کٹھور لڑکا ہے!،،

توشار نے جواباً آہستہ سے اپنے شانے اچکائے، جس کا مطلب ظاہر ہے یہ تھا کہ: ''میں اسے خدمت گار بناکر یوں ہی تو نہیں رکھتا!،،

میں نے اچھے بچوں کی طرح ماں کی طرف قدم بڑھائے اور ہم دونوں دہلیز میں پہنچ گئے۔ میں جانتا تھا کہ سب ساتھی اپنی کھڑکیوں سے ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ ماں کلیسا کی طرف مڑیں اور خلوص دل سے تین دفعہ سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ ان کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے اور گرجاگھر کی گھنٹیاں زور زور سے بج رہی تھیں۔ وہ ایک دفعہ پھر میری طرف مڑیں اور — بےبس ہوکر دونوں ہاتھوں میں میرا چہرہ تھام کر رونے لگیں۔ آنسو مسلسل میرے سر پر گر رہے تھے۔

''اماں یہ آپ کیا کر رہی ہیں... ذرا تصور تو کیجئے...برا معلوم ہوتا ہے... دیکھئے نا وہ سب کے سب کھڑکیوں سے تماشا دیکھ رہے ہیں!،،

انھیں جھٹکا سا لگا۔ اور تیزی سے بولیں:

''اف خدایا! خدا کے حفظ و امان میں دیا، آسمانی فرشتوں کے حوالے کیا! کنواری مریم تیری حفاظت کریں میرے بچے! سینٹ نکولائی! خدا، اے میرے خدا!،، وہ مسلسل مجھے دعائیں دے رہی تھیں، باربار بےقراری سے میرے سینے پر صلیب کا نشان بنا رہی

تھیں، بس نہیں چلتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ صلیب، زیادہ سے زیادہ گہرائی سے میرے سینے پر بناتی چلی جائیں۔ ''میرے بچے، میری جان، ٹھیر تو سہی میرے لال!..''

انھوں نے جلدی سے جیب میں ھاتھ ڈال کر رومال نکالا، نیلے رنگ کے چارخانوں والا معمولی سا رومال، جس کے کونے پر کس کر گرہ بندھی ھوتی تھی، بڑی دیر گرہ کھولنے کی کوشش کرتی رھیں مگر گرہ نے کھل کر ھی نہ دیا۔

''چلو کوئی بات نہیں۔ تم رومال سمیت ھی رکھ لو۔ صاف، دھلا ھوا ھے، کام آئے گا۔ معاف کرنا بیٹے اس سے زیادہ تو میرے پاس کچھ ھے نہیں۔ معاف کرنا میرے لال...''

میں نے رومال لے لیا، جی چاھا کہہ دوں کہ ''جناب توشار اور انتونینا واسیلیونا نے ھمارے لئے سب کچھ مہیا کر رکھا ھے۔ بہت اچھی طرح رکھتے ھیں ھمیں، ھمیں کسی چیز کی کمی نہیں ھے''۔ لیکن میں نے کہا نہیں، خاموشی سے رومال لے لیا۔

اور آخر ماں چلی گئیں۔ سنترے اور کیک تو میرے واپس پہنچنے سے پہلے ھی امیر امرأ کے بچوں نے ٹھکانے لگا دئے تھے، بیس بیس کوپک کے چاروں سکے بھی، میرے پہنچتے ھی، لامبرت نے جھپٹ لئے۔ یاروں نے مل کر ان پیسوں سے پیسٹری کی دوکان سے چاکلیٹ اور پیسٹریاں خریدیں اور مجھے پوچھا تک نہیں!

سال آدھے سے زیادہ گزر چکا تھا۔ اکتوبر کا گدلا گدلا مہینہ تھا۔ ھوائیں، بارش، کیچڑ۔ میں ماں کے بارے میں بھول بھال چکا تھا۔ اف تب میرے دل میں ھر چیز، ھر هستی کے لئے ایک طوفان سا اٹھ رھا تھا نفرت کا، ایسی شدید نفرت کا جس نے میرے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ میں ھمیشہ کی طرح آج بھی توشار کو برش سے صاف کرتا تھا، لیکن دل کی تمام‌تر گہرائیوں سے، اپنے وجود کی تمام‌تر طاقت سے اس سے نفرت کرتا تھا۔ اور نفرت کا یہ دریا روزبروز چڑھ رھا تھا۔ اور تب ایک اداس شام کے دھندلکے میں میں اپنے بکس میں ضرورت کی کوئی چیز ڈھونڈ رھا تھا کہ اچانک بکس کے ایک کونے میں مجھے کیمبرک کا نیلا رومال نظر پڑا — ماں کا رومال۔ یہ رومال اسی دن سے، اسی طرح، یونہی کونے میں پڑا تھا — ٹھیک جس طرح میں نے اس دن اسے ڈالا تھا۔ میں نے رومال نکالا اور خاصی دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا۔ رومال کے کونے سے ابھی تک صاف پتہ چل رھا تھا کہ کبھی اس میں گرہ بندھی ھوئی تھی۔ اس پر تو ابھی تک بیس بیس کوپک کے سکوں کی چھاپ تک محفوظ تھی۔ میں نے رومال واپس رکھ کر بکس بند کردیا۔ تہوار کی رات تھی اور گرجاگھر سے ابھرتے ھوئے سنگیت کے ساتھ ساتھ گھنٹیوں کی آواز بھی فضا میں بکھر رھی تھی۔ دن کے کھانے کے بعد زیادہ‌تر طلبأ اپنے اپنے گھر جا چکے تھے۔ لیکن اس شام نجانے کیوں لامبرت اتوار گزارنے گھر نہیں گیا تھا۔ نجانے کیوں اسے لینے کوئی آیا ھی نہیں تھا۔ لامبرت پہلے کی طرح اب بھی گاھے گاھے مجھے مارتا تھا۔ لیکن اب مجھ سے بہت کچھ باتیں کرتا تھا، دوستی کرتا تھا۔ مجھ پر خاصا تکیہ کرنے

لگا تھا اب تو۔ ہم دونوں ساری شام ایک دوسرے کو لپاژیو پستولوں کی ایک ایک تفصیل بتاتے رہے حالانکہ یہ پستول زندگی بھر نہ میں نے کبھی دیکھا تھا نہ اس نے۔ دونوں نے خوب خوب باتیں کیں — چرکیسیائی تلواریں کیسی لاجواب ہوتی ہیں، کس صفائی سے گردن اڑاتی ہیں، اور یہ کہ ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہو سکیں تو کیسا مزہ آئے وغیرہ وغیرہ۔ دس بجے کے قریب ہم سونے لیٹ گئے۔ میں نے لحاف سر کے اوپر کھینچتے ہوئے تکیے کے نیچے سے نیلا رومال نکالا۔ میں کوئی گھنٹے بھر پہلے نجانے کیوں بکس کھول کر یہ رومال نکال لایا تھا، اور ابھی جب ہمارے بستر بنائے گئے تو میں نے خود ہی اسے تکیے کے نیچے ٹھونس دیا تھا۔ میں نے تڑپ کر رومال کو آنکھوں سے لگایا اور اچانک اس پر اپنے ہونٹ رکھ دئے۔ ماں... ماں... نجانے کیا یاد آیا کہ میں رومال سے سرگوشی کرنے لگا۔ سینے میں درد کی ٹیس سی اٹھی، جیسے کسی نے دل کو مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔ میں نے آنکھیں بند کیں تو نگاھوں کے سامنے ماں کا چہرہ ابھرا، کانپتے ہوئے ہونٹ ابھرے، اور یادوں کے افق پر وہ لمحہ ابھر آیا جب انہوں نے گرجا گھر کے سامنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا تھا اور پھر مجھے یسوع کی حفاظت میں دیتے ہوئے میرے سینے پر صلیب کا نشان بنانے لگی تھیں اور میں نے ان سے کہا تھا: ''اماں، یہ آپ کیا کر رھی ھیں۔ برا معلوم ھوتا ھے... یار لوگ دیکھ رہے ھیں!،، — ''اماں، میری اپنی اماں۔ اف، زندگی میں صرف ایک بار تو تم آئی تھیں میرے پاس... اب کہاں ہو تم اماں۔ میری پیاری اماں۔ دور دیس سے آنےوالی میری مہمان، کہاں ہو تم؟ اب بھی یاد ھے نا تمھیں اپنا دکھیا بیٹا جس کے پاس تب تم آئی تھیں؟ ایک دفعہ تو اور صورت دکھا دو میری اماں۔ اور کچھ نہیں تو خواب ھی میں آ جاؤ۔ میں ایک دفعہ تمھیں بتا تو سکوں کہ کتنی محبت ھے مجھے تم سے۔ ایک دفعہ تمھارے گلے سے لگ سکوں، تمھاری نیلی نیلی آنکھوں کو چوم سکوں، تمھیں بتا سکوں کہ ماں اب مجھے تم پر، تمھارے وجود پر قطعی شرم نہیں آتی، میں تمھیں یقین تو دلا سکوں کہ محبت تو میں نے تم سے جب بھی ٹوٹ کر کی تھی، مگر بس دل میں درد کی اٹیس سی ٹھتی رھی اور میں بیٹھا رھا، کسی بےجان دربان کی طرح بےحس و حرکت۔ تم کبھی اندازہ ھی نہیں لگا سکتیں ماں، کہ اس لمحے بھی میرے دل میں محبت کا کیسا سمندر مچل رہا تھا! اب کہاں ہو تم میری ماں؟ سن رھی ہو نا میری آواز؟ ماں، اماں، تمھیں یاد ھے نا ننھا کبوتر جو گاؤں میں آسمان پر اڑ رہا تھا؟

دمیتری گریگوروویچ

رُکا پُتلا

''ربڑ کا پتلا،، بچوں کے لئے سارے روسی ادب میں شاید سب سے زیادہ غمناک کہانی ہے۔ اسے دمیتری واسیلئیوچ گریگوروویچ نے ۱۸۸۳ء میں لکھا تھا جو کسان غلامی کے دور کی روسی زندگی کی عکاسی کرنےوالے بااستعداد ادیب تھے۔ ان کی تصنیفات میں ان کے اپنے بچپن کی تلخ مصیبتوں کی عکاسی ملتی ہے۔

گریگوروویچ ۱۸۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد زمیندار تھے لیکن ابھی وہ بالکل بچے ہی تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ دمیتری کی ماں فرانسیسی تھیں۔ انھیں روسی زبان نہیں آتی تھی اور گرد و پیش کی زندگی کو بھی نہ سمجھتی تھیں۔ ماں اور بیٹے میں باھمی مفاھمت نہ تھی۔ وہ اپنے باپ کے کسان غلام خدمتگار چچا نکولائی کی نگرانی میں بڑے ہوئے۔ بعد کو گریگوروویچ یاد کرتے تھے کہ ''اپنے بچپن کی زندگی کی ساری تنہائی اور سرد مہری میں مجھے محبت اور یگانگت کا احساس اسی وقت ہوتا تھا جب میں نکولائی کے پاس ہوتا تھا۔،،

محبت اور اپنےپن سے عاری زندگی کی تنہائی، یتیمی، ناخوشگواری اور کس‌مپرسی کا تکلیف‌دہ احساس کم عمر کرتب‌باز کی اس کہانی میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے جسے قسمت نے سنگدل بیکر کے من مانےپن اور سرکس کے ناظرین کی خوشحال اور ناکارہ بھیڑ کی ہوس سیر و تماشہ کا شکار بنا دیا ہے۔

۱

سرکس کے قلاباز بیکر کے اس شاگرد کو صرف اشتہاروں میں ''ربڑ کا پتلا،، کہا جاتا تھا۔ ویسے اس کا اصل نام پیتیا تھا، لیکن بچے کی حالت دیکھتے ہوئے اسے بدنصیب لڑکے کے نام سے یاد کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا تھا۔

اس کی جیون کتھا بہت مختصر تھی۔ یوں بھی یہ کتھا لمبی چوڑی، دشوار گزار گھاٹیوں اور وادیوں سے پر ہوتی بھی کیسے۔ ابھی بچے کی بساط ھی کیا تھی۔ زندگی کی صرف آٹھ ھی بہاریں تو دیکھی تھیں ابھی اس نے۔

پانچ سال کا بھی نہیں تھا کہ سر سے ماں کا سایہ اٹھ گیا۔ مگر آج بھی ماں کی تصویر آنکھوں میں بسی ہوئی تھی۔ نگاھوں کے سامنے آج بھی اس کا سراپا ابھر آتا — دبلا چھریرا بدن، بکھرے ہوئے سے، پریشان حال، چھدرے اور باریک سنہرے بال... ماں کبھی اس کو لاڈ پیار کرتی، اور جو بھی ھاتھ لگ جاتا اسے کھلاتی — پیاز کی گٹھی، کیک کا ٹکڑا، نمکین مچھلی، اور روٹی — اور کبھی اچانک ھی، بےوجہ، بےسبب بگڑجاتی، خوب چلاتی، اور جو بھی ھاتھ میں آجاتا اس سے بچے کی مرمت کر ڈالتی۔ اس کے باوجود پیتیا اکثر ماں کو یاد کیا کرتا تھا۔

پیتیا کو ماں کی موت ایسی یاد تھی جیسے کل کی بات ھو...

جنوری کی بہت سرد صبح تھی وہ۔ بادل آسمان پر خاصے نیچے جھک آئے تھے۔ اور خشک اور باریک برف گر رھی تھی۔ ھواؤں کے جھکڑوں کی وجہ سے برف چہرے پر برچھیوں کی طرح چبھ رھی تھی اور پھر ھواؤں کے دوش پر اڑتی ہوئی منجمد پگڈنڈیوں پر بکھرجاتی۔

جنازے کے پیچھے، نانی ماں اور پڑوس والی دھوبن واروارا کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پیتیا کو ایسا لگ تھا جیسے اس کے ھاتھ پاؤں کی انگلیاں شل ھوگئی ھوں، اسے دونوں عورتوں کا ساتھ دینا مشکل ھو رھا تھا۔ اس کے مانگے تانگے کے کپڑے اس کے لئے بہت بڑے اور جھابڑ جھول تھے۔ اونچے جوتے بھی بےحساب بڑے تھے۔ بڑے بڑے جوتوں میں پاؤں سپڑ سپڑ آگے پیچھے ھو رہے تھے۔ فراک کوٹ کا سائز بھی بےتکا تھا۔ اسے پہننا

بھی آسان کام نہ تھا - کسی نہ کسی طرح پیٹی سے کس کر کام چلا رکھا تھا - ٹوپی بھی مانگے کی تھی — چوکیدار کی اترن، بار بار آنکھوں تک سرک آتی اور راستہ نظر آنا مشکل ہوجاتا - بعد میں تو ٹانگیں اور کمر تھکن سے چور رہنے کی عادی ہوگئی تھیں - لیکن اسے آج بھی یاد تھا کہ اس دن مرحوم ماں کو آخری منزل پر پہنچاتے پہنچاتے اس کی کیا حالت ہوگئی تھی -

قبرستان سے واپسی پر نانی ماں اور واروارا راستے بھر بات کرتی رہیں کہ بچے کا اب کیا ہوگا - کس سے مدد مانگی جائے؟ اور آخر یہ ساری بھاگ دوڑ کرے گا کون؟

بچہ زندگی کے دن گزارتا رہا - کبھی اس کونے میں، کبھی کسی بڑی بی کی پناہ میں - نجانے بچارے کا انجام کیا ہوتا، وہ تو خدا بھلا کرے واروارا کا جو ایک دفعہ پھر آڑے وقت میں کام آگئی...

وہ سخوایا سڑک کے ایک بڑے سے گھر کے پچھواڑےوالے تہہ‌خانے میں رہتی تھی - اسی عمارت کی کسی اوپروالی منزل میں، پڑوس والے سرکس کی ایک کمپنی کے کچھ کھلاڑی بھی رہتے تھے - ان لوگوں کا بسیرا کئی کمروں میں تھا جو پہلو کی ایک تاریک سی راہ‌داری میں کھلتے تھے - واروارا ایک عرصے سے ان کے ہاں کپڑے دھونے کا کام کرتی تھی، اور ان میں سے ہر ایک کو اچھی طرح جانتی تھی - جب بھی ان کے ہاں جاتی پیتیا کو بھی ساتھ لےجاتی - وہ سب بچے کی رام‌کہانی جانتے تھے - سب جانتے تھے کہ ماں باپ دونوں کا سایہ بچے کے سر سے اٹھ چکا ہے - واروارا اکثر کہا کرتی کہ اگر سرکس کمپنی کے کسی ممبر کو یتیم کے حال پر ترس آجائے، اور وہ اسے اپنی سرپرستی میں لےکر ٹریننگ دے دے تو کتنا اچھا ہو - مگر کسی بندۂخدا نے بھی تو اپنی خدمات پیش نہ کیں - یوں ھی کون سی کم ذمہ‌داریوں کا بوجھ تھا ان پر کہ ایک ذمہ‌داری اور اٹھالیتے - مگر ایک آدمی ایسا تھا جس نے ھامی نہیں بھری تو انکار بھی نہیں کیا - بلکہ کبھی کبھی تو وہ بڑے غور سے لڑکے کو دیکھا کرتا تھا - یہ تھا سرکس کا قلاباز، بیکر -

غالباً اس کے اور واروارا کے درمیان اس سلسلے میں اندر ھی اندر کچھ بات‌چیت بھی ہوئی تھی، بلکہ شاید سمجھوتا ہوچکا تھا - ایک مرتبہ جب سارے کھلاڑی رہرسل کے لئے چلے گئے اور گھر میں بیکر اکیلا رہ گیا تو واروارا نے جلدی سے بچے کا ہاتھ پکڑا اور اسے لےکر تیزی سے سیدھی قلاباز کے کمرے میں پہنچ گئی -

بیکر کو واقعی جیسے کسی کا انتظار تھا - اس کے ہونٹوں میں، خوبصورت نقش و نگار والا، کمان جیسا ترچھا پائپ دبا ہوا تھا اور سر پر پوت کے کام کی گول چپٹی ٹوپی رکھی تھی - ذرا ترچھی سی - سامنے میز پر بیئر کی تین بوتلیں رکھی تھیں - دو خالی تھیں، ایک شاید ابھی کھولی گئی تھی -

بیکر کا سوجا ہوا سا چہرہ اور بیل جیسی موٹی گردن بالکل لال تھے - اس کی خوداعتمادی اور تن‌تنا دیکھ‌کر تو یہی لگتا تھا کہ یہاں کمرے کی تنہائی میں بھی اسے اپنے حسن کا شدید احساس تھا -

''لو جی، کارل بگدانووچ، لو سنبھالو بچے کو!،، وارووارا نے بچے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔
''ٹھیک ہے،، قلاباز نے کہا۔ ''مگر میں ایسے تو نہیں لے سکتا۔ لڑکے کو ننگا کرو...،،
پیتیا اب تک دم سادھے کھڑا، بھولپن اور معصومیت سے بیکر کو تک رہا تھا۔ مگر اس کی آخری بات سنی تو گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹا اور ڈر کر دھوبن کے دامن سے چمٹ گیا۔ لیکن جب بیکر نے اپنا حکم دوھرایا، اور وارووارا نے بچے کا رخ اپنی طرف کرکے اس کے کپڑے اتارنے شروع کئے تو بچے نے گھبرا کر اس کے دونوں ھاتھ تھام لئے، اور بےقرار ہوکر کچھ اس طرح رونے اور پاؤں پٹخنے لگا جیسے قصائی کی چھری تلے چوزہ تڑپ اٹھے۔
''کیا ھوا! لو بھلا ڈر کس بات کا بگڑے! کپڑے اتارلے بیٹا، چل جھٹ سے کپڑے اتار لے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں بیٹا۔ کیسا باؤلا لڑکا ہے، رے تو!،، دھوبن منہ ہی منہ میں بولتی جا رہی تھی اور بچے کی گرفت سے اپنا دامن چھڑاتی جارھی تھی۔ ساتھ ہی جلدی جلدی اس کی پتلون کے بٹن بھی کھول رہی تھی۔
مگر بچے پر ذرا اثر نہ ھوا۔ نجانے کیوں اس قدر خوفزدہ ھو رہا تھا۔ کبھی ڈر کے مارے بائیں جھکتا، کبھی دائیں۔ کبھی ادھر مڑتا، کبھی ادھر۔ اور کبھی لپک کر کسی چیز کے نیچے گھسنے لگتا۔ اس کی چیخیں ساری عمارت میں گونج رہی تھیں۔
اور آخر کارل بگدانووچ کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا۔ اس نے پائپ میز پر رکھا، اور بچے کی اور زیادہ زور سے ابھرتی ہوئی چیخوں کی پروا کئے بغیر تیزی سے ھاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ اور اس سے پہلے کہ پیتیا کچھ سمجھ پائے، بچارا، کھلاڑی کے گھٹنوں کے درمیان جکڑا کھڑا تھا۔ قلاباز نے پلک جھپکتے میں بچے کے جسم سے قمیص پتلون دونوں اتار پھینکے۔ بچے کو ننگا کرکے کچھ یوں اپنے زانو پر بٹھایا جیسے وہ آدمی کا بچہ نہ ھو، کوئی ھلکا پھلکا سا تنکا ھو۔ اور اب کھلاڑی سخت ھاتھ کی جنبش سے بچے کی چھاتی اور پسلیاں ٹٹول رہا تھا۔ ننھے سے بدن کا کوئی حصہ اسے قابل اطمینان محسوس نہ ھوتا تو انگلیاں اور سخت ھوجاتیں اور وہ دبا دبا کر اچھی طرح ایک ایک پٹھے کا معائنہ کرنے لگتا۔ بچے نے اس کے ھاتھوں سے نکلنے کی کوشش کی نہیں کہ سر پر بیکر کا تھپڑ پڑا نہیں۔
دھوبن کو پیتیا کے حال پر ترس آرھا تھا۔ بھلا دیکھو تو کارل بگدانووچ کو، کیسی سختی سے بچے کو توڑ مروڑ رہا ہے! مگر منہ کھولتی تو کیسے۔ خود ہی تو بچے کو قلاباز کے پاس لائی تھی۔ اور بیکر نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اگر وہ بچے سے پوری طرح مطمئن ھوا تو ضرور اسے ٹریننگ دے گا۔ وہ بچے کے پاس کھڑی، جلدی جلدی اس کے آنسو پونچھ رہی تھی، دبی دبی آواز میں اسے دلاسا دے رہی تھی کہ کارل بگدانووچ اسے کوئی تکلیف نہیں پہنچائیں گے۔ بس ذرا اس کا معائنہ کریں گے اور ختم۔
لیکن جب قلاباز نے بچے کو اکڑوں بٹھا کر اس کی پشت اپنی طرف کی اور اس کے شانوں کی ھڈیوں میں اپنی انگلیاں گڑو کر سخت ھاتھوں سے اس کے شانوں کو پیچھے کھینچنا شروع کیا اور بچے کی سوکھی ساری ننگی چھاتی کمان کی طرح اکڑ گئی، سر

پیچھے کو ڈھلک گیا اور اس کا سارا سراپا درد اور خوف سے بےجان سا ہوگیا تو واروارا تڑپ اٹھی۔ اب چپ رہنا مشکل تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ لپک کر بچے کو اس کی گرفت سے چھینے، قلاباز نے خود ہی بچے کو اس کے حوالے کر دیا۔ پیتیا سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ خوف سے گھگی بندھی ہوئی تھی اور آنسوؤں اور سسکیوں سے ننھا سا جسم لرز رہا تھا۔

''بس میرے بچے، بس۔ دیکھ تو سہی بیٹا، کچھ بھی تو نہیں کیا صاحب نے! کارل بگدانووچ تو بس ذرا ٹھونک بجاکر دیکھ رہے تھے تجھے!،، دھوبن بچے کو کسی نہ کسی طرح چپ کرانے کی کوشش میں مسلسل تسلی بھرے الفاظ بدبدا رہی تھی۔

اس نے کنکھیوں سے بیکر کی طرف دیکھا تو بیکر نے سر سے اشارہ کیا اور گلاس میں بیئر انڈیلنے لگا۔

دو دن بعد بچے کو ہمیشہ کےلئے بیکر کے حوالے کرنا تھا۔ یہ کام آسان نہ تھا۔ دھوبن کو چال چلنی پڑی۔ مگر بچے پر دھوبن کی گاڑھی کمائی سے خریدی ہوئی نئی سوتی قمیص کا کوئی اثر نہ ہوا نہ مزیدار میٹھے سموسوں کا۔ نہ دھوبن کی منت سماجت کام آئی نہ پیار محبت۔ پیتیا تو ایسا خوفزدہ تھا کہ رو بھی نہ سکا۔ اور خوفزدہ کیسے نہ ہوتا، کیونکہ اس وقت وہ اسی کمرے میں تھا، جس سے ہم اور آپ اب تک بخوبی واقف ہوچکے ہیں۔ مگر اس نے اپنا آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ پوری شدت سے دھوبن کے اسکرٹ میں چھپا رکھا تھا۔ جیسے ہی وہ باہر جانے کےلئے قدم بڑھاتی بچہ کچھ اس طرح تڑپ کر اس کے ہاتھ پکڑ لیتا، جیسے اندھیرے میں بس یہی ایک سہارا ہو۔ وہ کسی صورت میں کارل بگدانووچ کے پاس تنہا رہنے کو تیار نہ تھا۔

اور آخر قلاباز اس تماشے سے عاجز آکر جھنجھلا پڑا۔ اس نے بچے کا کالر پکڑ کر کھینچا اور ایک جھٹکے سے اسے واروارا کے دامن سے چھڑا لیا۔ جیسے ہی دھوبن نے باہر جاکر دروازہ بند کیا، ویسے ہی اس نے بچے کو بڑی بےرحمی سے اپنے سامنے پٹخا اور حکم دیا: ''چل دیکھ میری طرف، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ!،،

پیتیا مسلسل کانپ رہا تھا، جیسے اسے بخار چڑھ رہا ہو۔ اس کے سوکھے اور بیمار چہرے کے سارے نقوش ست سے گئے تھے۔ ننھے سے چہرے پر ایسی بےبسی، ایسی کمزوری برس رہی تھی جیسے کسی بڈھے کا چہرہ ہو۔

بیکر نے بچے کی ٹھوڑی پکڑکر اس کا منہ اپنی طرف کھینچا اور پھر غرایا:

''دیکھ بے لونڈے، سن!،، اس نے پیتیا کی ناک کے نیچے تنبیہاً انگلی گھمائی۔ ''اگر تو چاہتا ادھر...،، (اس نے انگلی سے دروازے کی طرف اشارہ کیا) ''تو سمجھ لے کہ پڑےگی ادھر،، (اس نے بچے کی ران اور کولھوں کی طرف اشارہ کیا)۔ ''اور زور میں، اس سے بھی زور میں!!،، یہ کہہ کر اس نے بچے کو اپنی گرفت سے آزاد کیا اور بیئر کا گلاس اٹھاکر غٹاغٹ پیتا چلا گیا۔

اسی صبح وہ بچے کو سرکس میں لےگیا۔ جہاں ہر شخص ادھر سے ادھر دوڑ

بھاگ رہا تھا، کوچ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

اگلے دن سرکس کمپنی اپنے سارے ساز و سامان، سب گھوڑوں اور انسانوں سمیت گرمی کے سیزن کےلئے ریگا روانہ ہوگئی۔

شروع شروع میں تو اس زندگی کے نئےپن نے، نئے نئے تجربوں اور تاثرات نے پیتیا کے تجسس اور دلچسپی کو ابھارنے کی بجائے اسے اور خوفزدہ کردیا۔ ایک کونے میں دبکا، کسی جنگلی جانور کی طرح گھبرائی، گھبرائی نظروں سے چاروں طرف دوڑتے بھاگتے لوگوں کو دیکھتا رہا۔ جو نجانے کیسی کیسی ان دیکھی، انوکھی چیزیں اٹھائے، ادھر سے ادھر آجا رہے تھے۔ ان میں سے کئی کی نظر اس اجنبی بچے کے سنہرے بالوں بھرے سر پر پڑی ضرور، مگر اس کے بارے میں سوچنے کے لئے وقت کہاں تھا بھلا! مختصر یہ کہ سب ادھر سے ادھر آتے جاتے رہے، آگے بڑھتے رہے۔

سرکس کمپنی کو ریگا پہنچنے میں تقریباً دس دن لگ گئے۔ سفر کے ان دس دنوں میں پیتیا پر کسی قسم کی کوئی بندش نہ تھی۔ جہاں چاھے بیٹھے، جب چاھے سوئے، جاگے۔ گاڑی میں بھی اب اس کے ساتھ بیٹھے والے دوسرے مسافر اس کے لئے قطعی اجنبی نہیں تھے۔ اس نے دبی دبی نگاھوں سے ان میں سے کئی ایک کو دیکھا اور پرکھا تھا۔ ان میں سے اکثر لوگ بڑے مست اور مگن قسم کے تھے۔ ہنسی مذاق کرتے، گاتے بجاتے وقت گزارتے تھے۔ بھلا ان سے کیا ڈرنا! ایک آدھ تو سرکس کے مسخرے ایڈورڈس جیسے نیک بندے بھی تھے۔ جو آتے جاتے اس کے گال بھی تھپتھپا دیتے تھے۔ بلکہ ایک دفعہ تو عورتوں میں سے ایک نے اسے سنترے کی ایک پھانک بھی دی تھی۔ مختصر یہ کہ وہ رفتہ رفتہ اس ماحول کا عادی ہوچلا تھا۔ اگر اس کا مالک قلاباز کارل بگدانووچ کے بجائے کوئی دوسرا ہوتا تو بچہ یہاں خاصا خوش رہتا۔ مگر قلاباز سے تو دل کسی طرح ملتا ھی نہ تھا۔ اسے دیکھتے ھی پیتیا کو جیسے سانپ سونگھ جاتا۔ فوراً اپنے اندر دبک کر کسی نہ کسی طرح تیزی سے امڈتے ہوئے آنسو پینے کی کوشش کرنے لگتا۔

اور جب ٹریننگ شروع ہوئی تو زندگی بالکل ھی ناقابل برداشت ھوگئی۔ دو چار بار کی کوشش کے بعد ھی بیکر کو اندازہ ھوگیا کہ بچے کی صلاحیتوں کو پرکھنے میں اس نے قطعی غلطی نہیں کی ھے۔ پیتیا بالکل پھول کی طرح ھلکا تھا۔ اور کیا قیامت کی لچک تھی اس کے ھاتھ پاؤں میں۔ اس کے پٹھوں میں ابھی اتنی طاقت نہیں تھی کہ ان خداداد صلاحیتوں کا پورا فائدہ اٹھایا جاسکے، پھر بھی یہ کوئی ایسی مشکل نہیں تھی۔ بیکر کو یقین تھا کہ صحیح ٹریننگ ملےگی تو طاقت بھی آجائےگی۔ اجی وہ تو آج بھی، بڑی حد تک، اپنے شاگرد کی صلاحیتوں کی قسم کھا سکتا تھا۔ پچھلے مہینے بھر سے بچہ اس کے حکم کے مطابق روؤانہ صبح و شام ٹانگیں پھیلا کر زمین پر بیٹھ کر سر سے پاؤں کو چھونے کی ورزش کر رہا تھا۔ ارے اب تو وہ مالک کی مدد کے بغیر ھی اس قسم کی ھلکی پھلکی ورزش اور کرتب کرنے لگا تھا، البتہ پیچھے جھکتے جھکتے، سر سے ایڑی کو چھونےوالی

ورزش بہت مشکل تھی۔ مگر رفتہ رفتہ بچہ اس پر بھی قابو پا رہا تھا۔ اب تو وہ دوڑتے ہوئے کرسی کے اوپر سے پھلانگنے میں بھی ماہر ہوگیا تھا۔ لیکن جب بیکر نے حکم دیا کہ وہ کرسی کے اوپر سے پھلانگنے کے بعد ٹانگیں ہوا میں معلق کرکے ہاتھوں کے بل کھڑا ہوجائے تو وہ بہت کم ایسا کر پاتا تھا۔ پیتیا ہوا میں اڑتا، لیکن کبھی منہ کے بل گرجاتا، کبھی سر کے بل۔ اس کشمکش میں اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹتے ٹوٹتے بچی۔

مگر اس کی یہ ناکامی، یہ چوٹیں تو اصل مصیبت کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھیں۔ اصل بپتا تو مکے تھے جو بیکر بات بات پر لگاتا رہتا تھا۔ بچے کے پٹھے ویسے ہی دبلے اور سوکھے رہے۔ ظاہر تھا کہ ان میں طاقت آنا بہت ضروری تھا۔

جلد ہی بیکر کے کمرے میں اونچی نیچی ہونےوالی ایک دوہری سیڑھی کا اضافہ ہوگیا۔ زمین سے کچھ اونچائی پر، اس سیڑھی میں ایک متوازی ڈنڈا جڑا ہوا تھا۔ بیکر کا حکم تھا کہ بچہ دوڑتا ہوا سیڑھی تک جائے، تیزی سے چھلانگ لگاکر ہوا میں اچھلے اور اس متوازی ڈنڈے کو پکڑکر اس میں لٹک جائے۔ شروع میں پانچ اور پھر دس منٹ تک اسی طرح لٹکا رہے، روزانہ کئی دفعہ اس قسم کی ورزش دوہرائی جاتی۔ کبھی اسے ڈنڈا پکڑکر سیدھا لٹکنا ہوتا، اور کبھی حکم ملتا کہ ڈنڈا پکڑکر لٹکو اور بدن کو پیچھے کی طرف موڑتے جاؤ، موڑتے جاؤ، یہاں تک کہ ڈنڈے اور سر کے بیچ سے ٹانگیں نکال کر لٹک جاؤ۔ اس ورزش کا مقصد دراصل یہ تھا کہ اسے پاؤں کے بل لٹکنے کا کرتب سکھایا جائے۔ یعنی پاؤں کی انگلیوں سے ڈنڈا پکڑکر لٹکنے کا عادی بنایا جائے، تاکہ وہ اچانک ہاتھ چھوڑ دے اور محض پاؤں کی انگلیوں سے ڈنڈا پکڑکر لٹکا رہے۔ یہاں تک بھی غنیمت تھا۔ اصل مشکل تو جب پیش آئی جب بیکر نے اس سے کہا کہ اس طرح ٹانگیں اوپر سر نیچے لٹکنے کے ساتھ ساتھ چہرے پر انتہائی نرمی اور خوشی کا رنگ ہو، اور آنکھوں سے ہنسی پھوٹے۔ کیوں کہ اس طرح تماشائیوں کے دل صحیح معنی میں خوش ہو سکیں گے۔ بڑی واہ، واہ ہوگی۔ تماشائی کو دور دور یہ احساس نہیں ہونا چاہئے کہ قلاباز کے شانوں کے جوڑوں میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی ہیں، پٹھوں کے اس طرح مڑنے سے شدید درد اور دکھن ہو رہی ہے۔ اور سینہ جیسے تشنج سے بھنچا جا رہا ہے۔

ان مقاصد کے حصول کی کوشش میں بیکر کے کمرے سے اکثر ایسی لرزتی ہوئی بچکانہ آواز، ایسی دردناک چیخیں ابھرتیں کہ بیکر کے دوسرے ساتھی، اپنا کام چھوڑ چھاڑ، اس کے کمرے کی طرف لپکتے اور بچے کو ظالم کے چنگل سے نکال لاتے۔

اور تب بیکر کے گلے سے لعنت ملامت اور چیخوں کا طوفان سا اٹھتا اور کبھی کبھی تو پیتیا پر اور قیامت ٹوٹتی۔ لیکن کبھی کبھی دوسرے ساتھیوں کی یہ دخل اندازی اتنے طوفان نہ اٹھاتی، بلکہ بات خاصے سلیقے اور سکون سے دب جاتی۔

ایسا خاص طور پر جب ہوتا جب دخل اندازی کرنےوالا سرکس کا مسخرہ ایڈورڈس

ہوتا۔ وہ عام طور سے شراب کباب اور گزک کی مدد سے بیکر کی خوشنودی خرید لیتا تھا۔ اور تب دوستانہ بات‌چیت کے دوران میں وہ بیکر کو سمجھاتا کہ اس کا سکھانے کا طریقہ غلط ہے۔ اس طرح، دل میں خوف بٹھا کر، مار پیٹ کرکے وہ بچے تو بچے، کتوں اور بندروں تک کو گر سکھانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ وہ بیکر کو سمجھاتا کہ خوف سے انسان کی طاقت اور قوت سلب ہو جاتی ہے۔ وہ کمزور پڑجاتا ہے۔ اور کمزوری تو کرتب دکھانےوالوں کی جانی دشمن ہے۔ اس طرح انسان کی طاقت، اس کی خوداعتمادی اس سے چھن جاتی ہے، اور ان خصوصیات کے بغیر، وہ ہاتھ پاؤں کو لاکھ توڑے مروڑے، مگر بےسود۔ اس کے پٹھے اکڑجائیں‌گے، گردن ٹوٹ جائےگی، کمر میں چنک آ جائےگی مگر حاصل کچھ نہ ہوگا۔

مگر صاحب تعجب تو یہ ہے کہ جب بھی ایڈورڈس اپنی باتوں اور بیئر کی وجہ سے جوش میں آتا اور بچے کو سمجھانے لگتا کہ کونسی ورزش کیسے کرے تو پیتیا ہمیشہ خوشی خوشی بڑی مہارت سے سارے کرتب، ہر ایک ورزش کرکے دکھا دیتا۔

اب تک کمپنی کے سب ہی ممبر بیکر کے اس ننھے سے شاگرد کو دیکھ چکے تھے۔ اسے جان گئے تھے۔ پچھلے دنوں بیکر نے سرکس کے سامان میں سے مسخرے کا لباس نکال کر اسے دے دیا تھا۔ اس کے منہ پر سفیدی تھوپ کر گالوں پر سرخ سرخ گول دھبے سے لگا دیتا تھا۔ وہ اسے سرکس رنگ میں اسی حلیے میں لےجاتا تھا۔ کبھی کبھی اس کا امتحان لینے کی خاطر بیکر اچانک ہی اس کی ٹانگیں اوپر اٹھا دیتا اور حکم دیتا کہ ہاتھوں کے بل ریت پر دوڑ لگاؤ۔ ایسے موقعوں پر پیتیا یہ مہم سر کرنے کی کوشش میں جان لڑا دیتا۔ لیکن اکثر اس کی طاقت جواب دےجاتی۔ تھوڑی دیر تک ہاتھوں کے بل دوڑتے دوڑتے اچانک اس کے شانوں کی جان سی نکل جاتی۔ اور وہ منہ کے بل ریت پر گر جاتا۔ اور تب تماشائی خوش ہو ہوکر خوب ہنستے، آوازے کستے۔

ایڈورڈس کی شاگردی میں پیتیا یقیناً بہت جلدی ترقی کرجاتا، لیکن بیکر کے ہاتھوں اس کی ترقی کی راہیں جیسے بند ہوگئی تھیں۔ پہلے دن کی طرح آج تک، اسے دیکھ‌کر بچے کی روح فنا ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور عجیب سا جذبہ دل میں پروان چڑھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ جذبہ ہے کیا۔ مگر اس سے چھٹکارا بھی ممکن نہ تھا۔ دن رات، سوتے جاگتے یہ احساس دوسرے تمام احساسات اور جذبات پر حاوی رہتا۔ یہاں تک کہ رات کو بچہ اپنے بستر پر پڑا پڑا سرکس کے قلاباز کے خراٹے سنتا رہتا اور ہچکیوں سے روتا رہتا۔

مگر بیکر نے بچے کا دل جیتنے، اس سے ذرا سا لگاؤ پیدا کرنے کی کبھی بھول کر بھی کوشش نہیں کی۔ کبھی نہیں! بلکہ جب پیتیا کوئی کرتب مہارت اور خوبصورتی سے کرتا تب بھی بیکر کے منہ سے تعریف یا محبت کا کوئی لفظ نہ نکلتا۔ بڑا کمال کرتا

ورزش بہت مشکل تھی۔ مگر رفتہ رفتہ بچہ اس پر بھی قابو پا رہا تھا۔ اب تو وہ دوڑتے ہوئے کرسی کے اوپر سے پھلانگنے میں بھی ماہر ہوگیا تھا۔ لیکن جب بیکر نے حکم دیا کہ وہ کرسی کے اوپر سے پھلانگنے کے بعد ٹانگیں ہوا میں معلق کرکے ہاتھوں کے بل کھڑا ہوجائے تو وہ بہت کم ایسا کر پاتا تھا۔ پیتیا ہوا میں اڑتا، لیکن کبھی منہ کے بل گرجاتا، کبھی سر کے بل۔ اس کشمکش میں اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹتے ٹوٹتے بچی۔

مگر اس کی یہ ناکامی، یہ چوٹیں تو اصل مصیبت کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھیں۔ اصل پیتا تو مکے تھے جو بیکر بات بات پر لگاتا رہتا تھا۔ بچے کے پٹھے ویسے ہی دبلے اور سوکھے رہے۔ ظاہر تھا کہ ان میں طاقت آنا بہت ضروری تھا۔

جلد ہی بیکر کے کمرے میں اونچی نیچی ہونےوالی ایک دوہری سیڑھی کا اضافہ ہوگیا۔ زمین سے کچھ اونچائی پر، اس سیڑھی میں ایک متوازی ڈنڈا جڑا ہوا تھا۔ بیکر کا حکم تھا کہ بچہ دوڑتا ہوا سیڑھی تک جائے، تیزی سے چھلانگ لگاکر ہوا میں اچھلے اور اس متوازی ڈنڈے کو پکڑکر اس میں لٹک جائے۔ شروع میں پانچ اور پھر دس منٹ تک اسی طرح لٹکا رہے، روزانہ کئی دفعہ اس قسم کی ورزش دوہرائی جاتی۔ کبھی اسے ڈنڈا پکڑکر سیدھا لٹکنا ہوتا، اور کبھی حکم ملتا کہ ڈنڈا پکڑکر لٹکو اور بدن کو پیچھے کی طرف موڑتے جاؤ، موڑتے جاؤ، یہاں تک کہ ڈنڈے اور سر کے بیچ سے ٹانگیں نکال کر لٹک جاؤ۔ اس ورزش کا مقصد دراصل یہ تھا کہ اسے پاؤں کے بل لٹکنے کا کرتب سکھایا جائے۔ یعنی پاؤں کی انگلیوں سے ڈنڈا پکڑکر لٹکنے کا عادی بنایا جائے، تاکہ وہ اچانک ہاتھ چھوڑ دے اور محض پاؤں کی انگلیوں سے ڈنڈا پکڑکر لٹکا رہے۔ یہاں تک بھی غنیمت تھا۔ اصل مشکل تو جب پیش آئی جب بیکر نے اس سے کہا کہ اس طرح ٹانگیں اوپر سر نیچے لٹکنے کے ساتھ ساتھ چہرے پر انتہائی نرمی اور خوشی کا رنگ ہو، اور آنکھوں سے ہنسی پھوٹے۔ کیونکہ اس طرح تماشائیوں کے دل صحیح معنی میں خوش ہو سکیں گے۔ بڑی واہ، واہ ہوگی۔ تماشائی کو دور دور یہ احساس نہیں ہونا چاہئے کہ قلاباز کے شانوں کے جوڑوں میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی ہیں، پٹھوں کے اس طرح مڑنے سے شدید درد اور دکھن ہو رہی ہے۔ اور سینہ جیسے تشنج سے بھنچا جا رہا ہے۔

ان مقاصد کے حصول کی کوشش میں بیکر کے کمرے سے اکثر ایسی لرزتی ہوئی بچکانہ آواز، ایسی دردناک چیخیں ابھرتیں کہ بیکر کے دوسرے ساتھی، اپنا کام چھوڑ چھاڑ، اس کے کمرے کی طرف لپکتے اور بچے کو ظالم کے چنگل سے نکال لاتے۔

اور تب بیکر کے گلے سے لعنت ملامت اور چیخوں کا طوفان سا اٹھتا اور کبھی کبھی تو پیتیا پر اور قیامت ٹوٹتی۔ لیکن کبھی کبھی دوسرے ساتھیوں کی یہ دخل اندازی اتنے طوفان نہ اٹھاتی، بلکہ بات خاصے سلیقے اور سکون سے دب جاتی۔

ایسا خاص طور پر جب ہوتا جب دخل اندازی کرنےوالا سرکس کا مسخرہ ایڈورڈس

ھوتا۔ وہ عام طور سے شراب کباب اور گزک کی مدد سے بیکر کی خوشنودی خرید لیتا تھا۔ اور تب دوستانہ بات‌چیت کے دوران میں وہ بیکر کو سمجھاتا کہ اس کا سکھانے کا طریقہ غلط ہے۔ اس طرح، دل میں خوف بٹھا کر، مار پیٹ کرکے وہ بچے تو بچے، کتوں اور بندروں تک کو گر سکھانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ وہ بیکر کو سمجھاتا کہ خوف سے انسان کی طاقت اور قوت سلب ہو جاتی ہے۔ وہ کمزور پڑجاتا ہے۔ اور کمزوری تو کرتب دکھانےوالوں کی جانی دشمن ہے۔ اس طرح انسان کی طاقت، اس کی خوداعتمادی اس سے چھن جاتی ہے، اور ان خصوصیات کے بغیر، وہ ھاتھ پاؤں کو لاکھ توڑے مروڑے، مگر بےسود۔ اس کے پٹھے اکڑجائیں‌گے، گردن ٹوٹ جائےگی، کمر میں چنک آ جائےگی مگر حاصل کچھ نہ ہوگا۔

مگر صاحب تعجب تو یہ ہے کہ جب بھی ایڈورڈس اپنی باتوں اور بیئر کی وجہ سے جوش میں آتا اور بچے کوسمجھانے لگتا کہ کونسی ورزش کیسے کرے تو پیتیا ہمیشہ خوشی خوشی بڑی مہارت سے سارے کرتب، ھر ایک ورزش کرکے دکھا دیتا۔

اب تک کمپنی کے سب ھی ممبر بیکر کے اس ننھے سے شاگرد کو دیکھ چکے تھے۔ اسے جان گئے تھے۔ پچھلے دنوں بیکر نے سرکس کے سامان میں سے مسخرے کا لباس نکال کر اسے دے دیا تھا۔ اس کے منہ پر سفیدی تھوپ کر گالوں پر سرخ سرخ گول دھبے سے لگا دیتا تھا۔ وہ اسے سرکس رنگ میں اسی حلیے میں لےجاتا تھا۔ کبھی کبھی اس کا امتحان لینے کی خاطر بیکر اچانک ھی اس کی ٹانگیں اوپر اٹھا دیتا اور حکم دیتا کہ ھاتھوں کے بل ریت پر دوڑ لگاؤ۔ ایسے موقعوں پر پیتیا یہ مہم سر کرنے کی کوشش میں جان لڑا دیتا۔ لیکن اکثر اس کی طاقت جواب دےجاتی۔ تھوڑی دیر تک ھاتھوں کے بل دوڑتے دوڑتے اچانک اس کے شانوں کی جان سی نکل جاتی۔ اور وہ منہ کے بل ریت پر گر جاتا۔ اور تب تماشائی خوش ہو ہوکر خوب ہنستے، آوازے کستے۔

ایڈورڈس کی شاگردی میں پیتیا یقیناً بہت جلدی ترقی کرجاتا، لیکن بیکر کے ھاتھوں اس کی ترقی کی راھیں جیسے بند ھوگئی تھیں۔ پہلے دن کی طرح آج تک، اسے دیکھ کر بچے کی روح فنا ھوتی تھی۔ اس کے ساتھ ھی ایک اور عجیب سا جذبہ دل میں پروان چڑھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ جذبہ ہے کیا۔ مگر اس سے چھٹکارا بھی ممکن نہ تھا۔ دن رات، سوتے جاگتے یہ احساس دوسرے تمام احساسات اور جذبات پر حاوی رہتا۔ یہاں تک کہ رات کو بچہ اپنے بستر پر پڑا پڑا سرکس کے قلاباز کے خراٹے سنتا رھتا اور ھچکیوں سے روتا رھتا۔

مگر بیکر نے بچے کا دل جیتنے، اس سے ذرا سا لگاؤ پیدا کرنے کی کبھی بھول کر بھی کوشش نہیں کی۔ کبھی نہیں! بلکہ جب پیتیا کوئی کرتب مہارت اور خوبصورتی سے کرتا تب بھی بیکر کے منہ سے تعریف یا محبت کا کوئی لفظ نہ نکلتا۔ بڑا کمال کرتا

کہ اپنے دیو جیسے سراپا کی تمام تر بلندی سے، نہایت شان استغنا کے ساتھ نظر جھکا کر اسے ایک نظر دیکھ لیتا اور بس۔

اسے پیتیا کے ساتھ رہتے کئی مہینے ہوچکے تھے، لیکن آج بھی غیریت اور دوری کا وہی حال تھا۔ مانو بس ایک شام پہلے ملاقات ہوئی ہو۔ خود تو روزانہ سرکس کے حجام کی دکان پر جاکر بڑے انداز سے اپنے بالوں میں گھونگر ڈلواتا تھا، لیکن اس کی قطعی پرواہ نہیں تھی کہ دھوبن واروارا نے پیتیا کو جو دو قمیصیں دی تھیں، وہ دونوں پھٹ کر تار تار ہوچکی ہیں، اور بچہ دو دو ہفتے تک مسلسل ایک ھی نیکر پہنے پھرتا ہے۔ اور اس کی گردن اور کانوں پر میل کی تہیں جمی ہوئی ہیں، جوتے بھی ٹوٹ کر بھرکس ہوچکے ہیں اور ان میں گلی کا کیچڑا پانی بھرا رہتا ہے۔ بیکر کے دوسرے ساتھی، خاص کر ایڈورڈس اکثر اسے اس بات پر ڈانٹتے، سمجھاتے، مگر جواب میں بیکر بےزاری سے سیٹی بجاتا اور اپنی پتلون پر ھنٹر جماتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔

بچے کی ٹریننگ اب بھی جاری تھی۔ اور ہر چھوٹی بڑی غلطی پر بیکر اب بھی اسے مارتا، سزائیں دیتا، بلکہ اس سے بھی بدتر سلوک کرتا۔

سرکس کمپنی سینٹ پیٹرسبرگ پہنچ چکی تھی۔ ایک دن ایڈورڈس نے پیتیا کو ایک چھوٹا سا پلا تحفے میں دیا۔ بچے کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ اپنا پیارا تحفہ کلیجے سے لگائے، راہداری میں دوڑتا ہوا اصطبل تک پہنچ گیا۔ خوش ہو ہوکر ہر ایک کو دکھا رہا تھا، اس کی گیلی گیلی گلابی ناک اور منہ کو بار بار پیار کر رہا تھا...

سرکس کا شو ختم ہوا تو بیکر اس بات پر انتہائی جھنجھلایا ہوا اندروالی راہداری میں داخل ہوا کہ تماشائیوں نے اسے مزید کرتب دکھانے کو بار بار بلایا کیوں نہیں۔ آیا ھی تھا کہ اچانک پیتیا پر نظر پڑگئی جو پلے کو کلیجے سے لگائے راہداری میں کھڑا تھا۔ بیکر نے پلے کو بچے کے ہاتھ سے چھین کر بڑے وحشیانہ انداز میں ایک طرف پھینک دیا۔ پلے کا سر راہداری کی دیوار سے ٹکرایا اور غریب وھیں ڈھیر ہوگیا۔

پیتیا تڑپ اٹھا۔ وہ روتا ہوا ایڈورڈس سے جالپٹا جو اسی وقت اپنے ڈریسنگ روم سے نکلا تھا۔

چاروں طرف کی لعنت ملامت سے بیکر کے تن بدن میں آگ ھی تو لگ گئی۔ غصے سے پاگل ہوکر اس نے ایک جھٹکے سے پیتیا کو ایڈورڈس سے الگ کرکے زور سے دھکا دیا اور کس کے طمانچہ اس کے منہ پر جڑ دیا...

پیتیا اپنے ہاتھ پاؤں کی تمام تر پھرتی، تمام تر لچک کے باوجود ''ربڑ کا پتلا'' ہونے سے زیادہ ایک بدنصیب، بدحال بچہ تھا!

۲

کؤنٹ لستوسیروف کے مکان میں بچوں کے کمرے جنوبی رخ پر باغ کے ٹھیک سامنے بنائے گئے تھے۔ بہترین کمرے تھے۔ جب بھی آسمان صاف ہوتا اور سورج چمکتا تو صبح

سے شام تک کھڑکیوں پر سورج کی کرنیں کھیلتی رہتیں۔ کھڑکیوں کے نچلے حصوں پر ٹیفٹا کے نیلے ریشمی پردے لٹکے ہوئے تھے۔ تاکہ بچوں کی آنکھیں تیز روشنی سے محفوظ رہیں۔ اسی مقصد سے ان سب کمروں میں نیلے رنگ کے قالین بچھے ہوئے تھے اور دیواروں پر جو کاغذ چسپاں تھے وہ بہت ہلکے رنگ کے نہیں تھے۔

ان کمروں میں سے ایک کی چاروں دیواروں کے ساتھ ساتھ، یہاں سے وہاں تک کھلونے سجے ہوئے تھے۔ یہ کھلونے الگ الگ حصوں میں مختلف انداز سے سجائے گئے تھے۔ کیونکہ ہر بچے کے کھلونوں کی دنیا الگ تھی۔

رنگ‌برنگی تصویروں‌والی انگریزی کتابیں اور کاپیاں، گڑیوں کی سجی سجائی مسہریاں، تصویریں، کیبنٹ، ننھے منے کچن، چینی کے برتنوں کے گڑیوں کے سیٹ، چھوٹی چھوٹی گیندوں پر سوار بھیڑیں اور کتے اس بات کا ثبوت تھے کہ یہ کونا بچیوں کا ہے۔ میزوں پر کھڑے ہوئے ٹین کے سپاہی، دفتی کی بنی ہوئی تین گھوڑوں‌والی روسی گاڑی، جس میں ابلتی ہوئی آنکھوں والے کمیت گھوڑے جتے ہوئے تھے، اور گھنٹیاں لٹک رہی تھیں، بڑا سا سفید بکرا، اور گھوڑے پر سوار کزاک، بڑا سا دف اور تانبے کا بگل، جس کی آواز سے انگریز گورنس مس بلیکس ہمیشہ پریشان رہتی تھیں — یہ سب چیزیں زبان حال سے کہہ رہی تھیں کہ اس کونے پر لڑکوں کا قبضہ ہے۔ قصہ مختصر، یہ کمرہ کھیل کود کا کمرہ کہلاتا تھا۔

ماسلے‌نیتسا* تہوار تھا۔ بدھ کے دن کھیل کود کے کمرے میں خاص طور پر رونق تھی۔ کمرہ بچوں کے خوشی کے نعروں اور شور سے گونج رہا تھا۔ اور ظاہر ہے یہ جوش کیسے نہ ہوتا، جبکہ ابھی ابھی انہیں بتایا گیا تھا: ''بچو، ماسلے‌نیتسا کے اس پورے ہفتے میں تم لوگوں نے ہمیشہ کہنا مانا، اور بڑی اچھی طرح رہے، آج ہے بدھ کا دن، اگر تم لوگ آئندہ بھی اسی طرح نیکی کے دموں رہوگے، تو تم سب کو جمعہ کی شام کو سرکس دکھائیں‌گے۔''

بچوں کو یہ بات خالہ سونیا نے بتائی۔

ابھی وہ اپنی بات ختم بھی نہ کر پائی تھیں کہ کمرے میں چیخ پکار مچی، خوشی کے نعرے بلند ہوئے، اور بچے زمین پر پاؤں مار مارکر، ہوا میں ٹانگیں چلا چلاکر اپنے جذبات کا احمقانہ اظہار کرنے لگے۔ بچوں کے اس خوشی کے ہنگامے میں سب سے آگے تھا پف۔ پانچ سالہ پف لستومیروف خاندان میں بس اکیلا بیٹا تھا۔ بچہ عام طور پر بجھا بجھا اور بے‌زار سا رہتا تھا۔ لیکن سرکس کے بارے میں اس نے ایسی ایسی کہانیاں قصے سن رکھے تھے، وہاں اسے ایسی ایسی چیزیں دیکھنے کی امید تھی کہ بچہ خوشی سے جھوم اٹھا۔ مگن ہوکر اچانک چاروں ہاتھ پاؤں سے فرش پر چلتے ہوئے اس نے بائیں

---

* ماسلے‌نیتسا — موسم سرما کو رخصت کرنے کا پرانا سلافی تہوار۔ (ایڈیٹر)

ٹانگ اٹھائی، اور منہ سے باہر زبان نکال کر عجیب سا منہ بنایا، اور قرغیزیوں جیسی آنکھوں سے کمرے میں موجود لوگوں کو کچھ یوں دیکھا جیسے وہ سرکس کا مسخرہ ہو۔

''مس بلیکس! اس کو اٹھائیے! جلدی اٹھائیے بےبی کو، نہیں تو خون اس کے سر کی طرف چڑھ جائے گا!،، خالہ سونیا نے گھبرا کر کہا۔

پف کے اردگرد ایک دفعہ پھر چیخ پکار اور اچھل کود شروع ہوگئی۔ اور پف کا یہ عالم تھا کہ کسی صورت زمین سے اٹھنے کو تیار نہ تھا۔ ضد میں کبھی ایک ٹانگ اچھالتا کبھی دوسری۔

''بچو، بچو!.. بس بہت ہوگئی شیطانی! بس اب سمجھدار بچے بن جاؤ۔ ٹھیک ہے نا؟ کہنا نہیں مانوگے تم لوگ؟،، خالہ سونیا نے کہا اور خود ہی اس بات پر الجھ کر رہ گئیں کہ آخر انھیں غصہ کیوں نہیں آتا۔ مگر لاکھ چاہنے پر بھی خفا ہونا ان کے بس میں نہ تھا۔ قطعی نہیں۔

وہ ''اپنے بچوں،، پر جان چھڑکتی تھیں جیسے وہ خود کہتی تھیں۔ اور واقعی، دیکھو نا بچے تھے بھی تو کتنے پیارے پیارے!

بڑی بچی ویرا آٹھ سال کی تھی، اس سے چھوٹی زینا چھ کی ہوگی اور بچے کی عمر یہی کوئی پانچ برس تھی۔ یوں تو اس کا اصلی نام پاول تھا، مگر بچے کو پیار کے دسیوں نام دئے گئے۔ بےبی، بیلز، گولو، کاچا اور پھر پف، اور یہ نام جیسے بچے پر چپک کر رہ گیا۔ تھا بھی تو وہ پھولا پھولا، گول مٹول سا تھا۔ چھوٹا سا قد، غبارے جیسا سر، کچوری سا گول چہرہ، موٹا تھل تھل دودھ جیسا سفید بدن۔ اس کے چہرے میں صرف اس کی آنکھیں قابل ذکر تھیں۔ قرغیزیوں جیسی چھوٹی چھوٹی آنکھیں صرف اس وقت پوری پوری کھلتی تھیں جب آپ اسے کھانے کو کچھ دیں، یا کھانے پینے کا ذکر ہو رہا ہو۔

سرکس جانے کی خوشی میں بڑی بیٹی ویرا بڑی مستعد اور چھوٹی بہن اور بھائی کے برتاؤ کی نگراں بن گئی۔ جیسے ہی ان میں تناؤ بڑھتا اور جھگڑے کے آثار نظر آتے، بڑی بہن ویرا کنکھیوں سے، شاہانہ رکھ رکھاؤ والی مس بلیکس کو دیکھتی ہوئی بچوں کی طرف لپکتی، جلدی سے زیزی اور پف سے کچھ کھسر پھسر کرتی اور باری باری دونوں کو پیار کرکے ان کے درمیان امن امان قائم کرانے میں کامیاب ہوجاتی۔

آخرکار وہ جمعہ آ ہی گیا جس کا بچوں کو بےچینی سے انتظار تھا۔ کھانے کے کمرے کے بڑے سے گھڑیال نے بارہ کا گھنٹا بجایا۔ ٹھیک اسی وقت ایک ملازم نے بڑھ کر احترام سے دروازے کا پٹ کھولا اور بچے اپنی گورنس اور سوئس ٹیچر کے ساتھ اندر داخل ہوتے نظر آئے۔ ناشتہ ہمیشہ کی طرح نہایت خاموشی، سلیقے اور قرینے سے کیا گیا۔

زیزی اور پف کو تو ویرا نے پہلے ہی خبردار کردیا تھا۔ چنانچہ ان دونوں نے

تو منه سے آواز ھی نہیں نکالی۔ ویرا نے پل بھر کو بھی بھائی بہن پر سے نظریں نہیں ہٹائیں، ان کی ایک ایک جنبش پر انھیں خبردار کرتی رہی۔

ناشتہ ختم ھونے پر مس بلیکس سے نہ رہا گیا۔ اور انھوں نے کاؤنٹس سے اتنا تو کہہ ھی دیا کہ پچھلے دنوں بچوں نے اتنی سعادت‌مندی، نیکی اور سمجھداری کا ثبوت دیا ھے کہ اس کی مثال ملنا مشکل ھے۔ کاؤنٹس نے ذرا سختی سے کہا کہ وہ پہلے ھی بہن سے اس بارے میں سن‌چکی ھیں اور شام کو انھیں سرکس لےجانے کی اجازت بھی دے دی ھے۔

یہ سنتے ھی ویرا بےقابو ھوگئی، ھفتوں کی محنت اور ریاض کو بھول‌کر کرسی سے اچھلی اور کچھ یوں تڑپ‌کر کاؤنٹس کے گلے لگی کہ پل بھر کو تو ماں کا چہرہ بیٹی کے گھنے بالوں میں چھپ سا گیا۔

ویرا بڑے پیانو کی طرف بڑھی جہاں پوسٹر رکھے تھے۔ ویرا نے ان میں سے ایک پر ھاتھ رکھا، اور اپنی نیلی نیلی آنکھوں سے ماں کو دیکھتے ھوئے بڑی بےقراری اور بےتابی سے نازک سی آواز میں پوچھا:

”ممی... اجازت ھے؟ یہ پوسٹر لےجا سکتے ھیں ھم؟“

”لے جائیے۔“

”زیزی، پف!“ ویرا نے پوسٹر اٹھاتے ھوئے بڑے جوش سے بہن بھائی کو پکارا۔ ”چلو چلیں، جلدی چلو نا۔ میں بتاؤں‌گی تم لوگوں کو کہ سرکس میں کیا کیا دیکھیں‌گے۔ سب بتاؤں‌گی۔ اپنے کمروں میں چلیں؟“

”ویروچکا، ویروچکا!“ کاؤنٹس نے کمزور سی آواز میں تنبیہ کی۔

مگر ویرا بھلا کہاں سنتی۔ وہ تیزی سے باھر لپکی۔ آگے آگے ویرا، اس کے پیچھے بہن بھائی، اور ان کے پیچھے ھانپتی کانپتی مس بلیکس۔ مگر وہ بچوں کی گرد کو بھی نہ پا سکیں۔

کھیل کود کے کمرے میں دھوپ پھیلی ھوئی تھی۔ وھاں پہنچتے ھی بچوں کا ھنگامہ اور زور پکڑگیا۔

نیچی سی میز سے کھلونے ھٹا کر اس پر پوسٹر پھیلا دیا گیا۔ ویرا کی دلی خواھش تھی کہ کمرے میں کھڑے بیٹھے سب لوگ — خالہ سونیا، مس بلیکس، موسیقی کی ٹیچر اور ننھے بچے کی انا جو ننھے کو گود میں لئے ابھی داخل ھوئی تھی — غرض سب لوگ باقاعدگی سے میز کے گرد بیٹھ جائیں۔ ظاھر ھے سب سے زیادہ مشکل کام تھا زیزی اور پف کو نچلا بٹھانا۔ وہ ایک دوسرے کو دھکیل رھے تھے، ویرا کو کبھی ادھر دبا رھے تھے، کبھی ادھر، اسٹول پر چڑھ چڑھ‌کر میز پر اوندھے ھو رھے تھے، کہنیوں کے بل لیٹ‌کر پوسٹر تک پہنچنے، اسے چھونے کی کوشش کر رھے تھے۔ آخر خالہ سونیا کی مدد سے وہ کچھ قابو میں آئے۔

ویرا نے اپنے سرمئی بالوں کو پیچھے جھٹکا، اور پوسٹر پر جھک‌کر نہایت جوش سے پڑھنا شروع کیا:

''ربڑ کا پتلا اور چودہ فٹے بانس پر ہوائی کرتب۔'' نہیں میری خالہ جان۔ یہ تو آپ کو بتانا ہی پڑے گا۔ ابھی بتائیے ہمیں، کیسا ہے یہ لڑکا، سچ سچ کا ہے کیا؟ زندہ ہے نا؟ اور یہ 'ربڑ کا پتلا، کیا ہوتا ہے بھلا؟''

''شاید، بہت لچکیلا ہوگا۔ اسی لئے یہ نام پڑگیا ہوگا... خیر، تم دیکھ ہی لوگے...''

''نہیں خالہ بتائیں، ابھی بتائیں۔ ہوا میں کرتب کیسے کرے گا وہ، وہ بھی چودہ فٹ کی بلندی پر۔ کیسے کرے گا وہ یہ کرتب؟''

''کیسے کرے گا؟'' زیزی تو جیسے گنبد کی آواز بن گئی تھی۔

''کیسے؟'' پف نے منہ کھولا اور ایک ہی لفظ میں کام چلا لیا۔

''بچو، تم لوگ بہت زیادہ سوال کر رہے ہو ہم سے... بخدا ہم کچھ بھی نہیں بتاسکتے تم کو۔ آج شام کو تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی لوگے۔ ویرا تم پروگرام پڑھو نا، بتاؤ آگے کیا لکھا ہے!''

لیکن اس سے آگے کا پروگرام اس جوش سے پڑھا اور سنا نہیں گیا، صاف ظاہر تھا بچوں کو دلچسپی نہیں تھی۔ ان کی دلچسپی کا مرکز تو اب ''ربڑ کا پتلا'' تھا اور بس! اب تو ان کی تمام‌تر باتوں، ان کے خوابوں اور ان کے تمام‌تر تصور کا محور تھا ''ربڑ کا پتلا''۔ یہاں تک کہ اس کے متعلق بات کرتے کرتے بچے ایک دوسرے سے دست و گریبان تک ہو ہوگئے۔

زیزی اور پف تو اب آگے اور کچھ سننے کو تیار ہی نہیں تھے۔ دونوں کرسیوں سے اٹھے اور نہایت زور شور سے کھیل ہنگامہ شروع کردیا۔ ''ربڑ کا پتلا'' بن بن کر کرتب دکھانے لگے۔ پف تو جھٹ چاروں ہاتھ پاؤں پر کھڑا ہوگیا۔ مسخرے کی طرح بائیں ٹانگ اٹھائی، زبان ترچھی کرکے ایک گال میں دبائی، اور بڑی شان سے اپنی قرغیز آنکھوں سے ایک ایک کی طرف دیکھنا شروع کیا، یہاں تک کہ خالہ سونیا پریشان ہو گئیں کہ کہیں بچے کے سر کی طرف خون کا بہاؤ نہ بڑھ جائے۔

ویرا نے جلدی سے پوسٹر کی باقی عبارت پڑھی اور خود بھی بہن بھائی کے کھیل میں شامل ہوگئی۔

اور پھر تو کھیل کود کے اس کمرے میں ایسا شور مچا، خوشی کی ایسی لہر اٹھی کہ کبھی کاہے کو اٹھی ہوگی۔

دو پہر کا سورج باغ کے دوسری طرف، ضمنی مکان کی چھت پر جھک چلا تھا۔ اور اس کی کرنیں نزدیک ہی کھیلتے ہوئے بچوں کے سراپا کو چمکا رہی تھیں۔ ان کے ہنستے مسکراتے، خوشی سے دمکتے ہوئے سرخا سرخ مکھڑوں پر کھیل رہی تھیں، چاروں طرف رکھے ہوئے رنگ‌برنگے کھلونوں پر بکھر رہی تھیں، نرم نرم قالین پر مچل رہی تھیں، اور پورا کمرہ نرم و گرم روشنی سے منور ہوگیا تھا۔ کمرے کی ہر چیز خوشی میں نہائی ہوئی سی لگ رہی تھی۔

بچوں کے کھانے کے وقت زیادہ دیر یہی تذکرہ رہا کہ وقت کیا ہوگیا ہے اور موسم کیسا ہے۔ خالہ سونیا نے بہت کوشش کی کہ بچوں کا دھیان کسی اور طرف بٹ جائے، اور ان کے دلوں کو کچھ سکون نصیب ہوسکے۔ پندرہ بیس منٹ کی غیرحاضری کے بعد وہ دوبارہ بچوں کے کمرے میں لوٹیں اور انھوں نے خوشی سے دمکتے ہوئے چہرے کے ساتھ اعلان کیا کہ کاؤنٹ اور کاؤنٹس نے کہا ہے کہ بچوں کے کپڑے وغیرہ تبدیل کرواکے انھیں سرکس کےلئے تیار کردیا جائے۔

اور پھر تو جیسے ہمارے جانے پہچانے ان کمروں میں طوفان سا آگیا، جن میں اب بجلیاں جلا دی گئی تھیں۔ یہاں تک کہ بچوں سے کہا گیا کہ جس کسی نے اچھے بچوں کی طرح سلیقے سے کپڑے نہیں پہنے، یا کپڑے بدلوانے میں شیطانی کی، اسے یہیں چھوڑ دیا جائےگا۔

جلد ہی بچے صدر دروازے والے زینے تک پہنچے اور ان کے اتالیقوں نے ایک دفعہ پھر سر سے پاؤں تک ان کا جائزہ لیا، انھیں اچھی طرح گرم کپڑوں میں لپیٹا، اور آخر یہ کارواں زینے سے اترکر صدر دروازے تک پہنچ گیا جس کے سامنے چار سیٹوں والی گھوڑا گاڑی برف سے نیم ڈھکی کھڑی تھی۔

گاڑی کے دروازے بند کردئے گئے، کوچوان اچھل کر اپنی سیٹ پر بیٹھا، گاڑی روانہ ہوئی اور پلک جھپکتے میں برفانی طوفان میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

۳

سرکس کا شو شروع ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ لیکن سرکس کا ہال ابھی سے بھر چلا تھا۔ خاص طور پر اوپروالی گیلری میں ھماشما بڑی تعداد میں جمع ہو رہے تھے۔ البتہ اعلی طبقے کے خوش‌پوش لوگ تو عام طور پر دیر ھی میں پہنچتے ہیں۔ ارکسٹرا پورے زوروشور سے بج رہا تھا۔ سرکس کا چمکتا ہوا چکنا دائرہ‌نما رنگ ابھی تک خالی تھا، اگرچہ اب اس پر چاروں طرف سے روشنیوں کی بارش سی ہو رہی تھی۔

اچانک موسیقی تیز ہوگئی۔ سرکس کے اصطبل کی طرف‌والا پردہ اٹھا اور تقریباً بیس ملازم اسٹیج پر آگئے، سب کے سب لیس‌والی لال رنگ کی وردیوں میں ملبوس تھے۔ ان کے پاؤں میں جیک بوٹ تھے، گھنگھریالے پٹے تھے اور چہروں پر سرخی پوڈر کی تہیں تھیں۔

سرکس میں ادھر سے ادھر تک دبی دبی آوازیں ابھرنے لگیں۔

تماشا شروع ہو رہا تھا۔

سرکس کے یہ ملازم حسب معمول ابھی دو صفوں میں کھڑے بھی نہ ہوئے تھے کہ اچانک اصطبل کی طرف سے شور اور قہقہے ابھرے اور سرکس کے مسخروں کا پورا گروہ کا گروہ قلابازیاں کھاتا، ھاتھوں کے بل چلتا اور ہوا میں اڑتا ہوا اسٹیج پر داخل ہوگیا۔

ان میں سب سے آگے تھا سرکس کا وہ مسخرہ جس کے چست لباس کے سینے اور پشت پر بڑی بڑی دو تتلیاں چسپاں تھیں۔ تماشائی دیکھتے ہی اپنے محبوب مسخرے ایڈورڈس کو پہچان گئے۔

''زندہباد ایڈورڈس! شاباش، ہو جائے، شاباش!،، چاروں طرف سے لوگوں نے نعرے لگائے۔

لیکن ایڈورڈس نے اس دن لوگوں کی امیدوں پر پانی سا پھیر دیا۔ ایک بھی تو انوکھی حرکت نہیں کی، سر کے بل دو چار بار قلابازیاں کھائیں، رنک کے دو چار چکر لگائے، مور کے پر کو بنا سہارے ناک پر ٹکائے ہوئے اسٹیج سے غائب ہوگیا۔ تماشائیوں نے اسے لاکھ پکارا، واہ واہ کی، مگر وہ بندہ پلٹ کر نہ آیا۔

اس کی جگہ جلدی سے ایک موٹا سفید گھوڑا اندر بھیجا گیا، اور پندرہ سالہ آسالیا، بڑی سبک روی سے بھاگتی ہوئی اندر آئی اور اس نے جھک کر مجمع کو سلام کیا۔

آسالیا کے بعد شعبدہ‌گر نے کرتب دکھائے، اس کے بعد سدھائے کتوں کے مسخرے نے کتوں سے کرتب کروائے، پھر تنے ہوئے تار پر ناچ ہوا اور اس کے بعد اعلی درجے کے گھوڑوں کے کرتب دکھائے گئے۔ تماشائیوں نے پہلے ایک گھوڑے کی ننگی پشت پر سواری کا رنگ دیکھا، پھر بیک‌وقت دو گھوڑوں پر زین کس کر سواری کی گئی۔ مختصر یہ کہ انٹرول تک تماشا ٹھیک ٹھاک چلا۔

''خالہ پیاری، ربڑ کا پتلا آئےگا اب، ہیں نا؟،، ویرا نے پوچھا۔

''ہاں پروگرام میں لکھا ہے کہ وہ انٹرول کے بعد آئےگا... ہاں تو بچو، بولو، لطف آرہا ہے نا تم لوگوں کو؟،،

''ہائے، بہت! بہت مزہ آرہا ہے... بو — و — وھت!،، ویرا خوشی سے دیوانہ‌وار چلائی۔

''اور تم کو لطف آیا زیزی؟ اور پف تم کو؟،،

''گولی بھی چلائیں‌گے کیا؟،، زیزی نے پوچھا۔

''نہیں بیٹی تم گھبراؤ نہیں، کہہ تو دیا نہیں چلائیں‌گے!،،

اور پف کا تو کچھ حساب ہی نہیں تھا۔ انٹرول ہوتے ہی اس کی تمام‌تر توجہ کا مرکز بن گئی کھانے پینے کی مختلف مزیدار چیزوں اور سیبوں سے بھری ہوئی کشتی جو خوانچے‌والا تیزی سے ادھر سے ادھر لا لےجا رہا تھا۔

موسیقی پھر شروع ہوگئی، چست وردیوں والے سرکس کے ملازم پھر اپنی اپنی جگہ قطار باندھ کر کھڑے ہوگئے۔ تماشے کا دوسرا حصہ شروع ہو رہا تھا۔

''کب آئےگا ربڑ کا پتلا؟،، بچے ہر کھیل کے بعد بےقرار ہو ہوکر پوچھ رہے تھے۔ ''کب آئےگا آخر وہ؟،،

''بس دیکھو، ابھی آئےگا...،،

اور لو واقعی ارکسٹرا نے والز کی خوش‌کن دھن بجائی، پردہ سرکا اور سرکس کا لحیم شحیم قلاباز گورے رنگ کے دبلے سوکھے بچے کا ھاتھ تھام اندر داخل ہوا۔

دونوں کے بدن پر کھال کے رنگ کے، سنہرے روپہلے تاروں بھرے چست لباس تھے۔ ان کے پیچھے دو ملازم سنہرے رنگ کا لمبا ڈنڈا اٹھائے اندر داخل ہوئے، جس کے ایک سرے پر لوھے کا موٹھ تھا۔

اسٹیج کے بیچوں بیچ پہنچ کر بیکر اور بچے نے جھک جھک کر چاروں طرف سلام کئے، اور پھر بیکر نے دایاں ھاتھ بچے کی پشت پر جمایا اور اسے ھوا میں تین قلابازیاں کھلا دیں، مگر یہ تو، سمجھئے کہ بس ابتدا تھی۔

بیکر نے ایک دفعہ پھر مجمع کو سلام کیا، اور جھک کر ڈنڈا اٹھایا، اسے ترچھا کرکے موٹاوالا سرا اپنی کمر سے بندھی ھوئی بیلٹ میں اٹکایا، اور دوسرے، لوھے کے موٹھ والے سرے کا توازن ٹھیک کرنے لگا۔ بانس کا یہ سرا سرکس کے گنبد تلے آھستہ آھستہ جھول سا رھا تھا۔

ڈنڈے کا توازن ٹھیک کرنے کے بعد بیکر نے بچے سے کچھ سرگوشی کی اور بچہ پہلے تو قلاباز کے کندھے پر چڑھا، پھر دبلے سوکھے ھاتھوں اور پاؤں میں ڈنڈا تھام کر آھستہ آھستہ اس پر چڑھنے لگا۔

بچے کی ھر جنبش پر ڈنڈا تھرتھرا اٹھتا، اور بیکر کبھی ایک ٹانگ پر زور دے کر کبھی دوسرے پر، اس کا توازن ٹھیک کرنے لگتا۔

اور آخر جب بچے نے ڈنڈے کے اوپر سرے پر پہنچ کر وھاں سے تماشائیوں کو ھوائی پیار کیا تو ھال ''شاباش،، کے شور سے گونج اٹھا۔

ایک دفعہ پھر ھر طرف سناٹا چھا گیا۔ صرف والز کی دھن بجتی رھی۔

اس اثنا میں بچہ ڈنڈے کے لوھے کے موٹھوالے سرے سے چمٹ کر ھاتھوں پر کھڑا ھو گیا۔ اب وہ آھستہ آھستہ پیچھے کی طرف جھک رھا تھا۔ کوشش یہ تھی کہ ٹانگیں سر اور ڈنڈے کے بیچ میں آجائیں۔ پل بھر کو تو جیسے سب کچھ دھندلا سا گیا، پیچھے گردن پر جھولتے ھوئے روپہلی بالوں اور انتھائی کوشش سے پھلائے ھوئے سینے کے علاوہ کچھ بھی تو نظر نہیں آرھا تھا، اس کے سینے پر سنہری روپہلی ریت سی چمک رھی تھی۔

ڈنڈا ادھر سے ادھر بری طرح جھول رھا تھا۔ دیکھنےوالے دیکھ رھے تھے کہ بیکر کس مشکل سے ڈنڈے کا توازن برقرار رکھ رھا ھے۔

''شاباش! شاباش!،، ھال میں ایک دفعہ پھر شور اٹھا۔

''بس بھئی، بس، بہت ھوا!،، دو تین طرف سے آواز آئی، لیکن جب بچے نے ایک دفعہ پھر لوھے کے موٹھ پر بیٹھ کر ھوائی پیار مجمع کی طرف پھینکے تو ھال میں پھر شور اور تالیوں کا طوفان سا آگیا۔

بیکر کی نگاھیں بچے پر جمی ھوئی تھیں، اس نے پھر زیرلب بچے سے کچھ کہا۔ اور بچہ فوراً دوسرا کرتب دکھانے لگا۔ اب کی دفعہ ھاتھوں سے ڈنڈے کو مضبوط پکڑ کر اس نے آھستہ آھستہ ٹانگیں ڈنڈے سے ھٹائیں اور ھوا میں کمر کے بل لیٹنا شروع کردیا۔ اور اب کرتب کا سب سے مشکل حصہ کرنا تھا۔ اول تو اسے کمر کو بالکل سیدھا

کرتے کرتے ڈنڈے کے اوپری سرے پر لگے ہوئے موٹھ پر اس طرح لیٹتا تھا کہ ٹانگیں اور سر بالکل ایک سطح پر آجائیں، پھر اچانک ہی کمر کے بل پھسل کر، صرف گھٹنوں میں ڈنڈا تھام کر ہوا میں لٹکتا تھا۔

خیر صاحب یہ کرتب بھی بخیر و خوبی آگے بڑھنے لگا۔ اس میں شک نہیں ڈنڈا بےتحاشہ لرز رہا تھا، بار بار جھکا جا رہا تھا، مگر اس کے باوجود ''ربڑ کے پتلے'' نے آدھا کرتب تو کرھی ڈالا۔ سمجھو آدھا راستہ تو طے ہو گیا تھا۔ اس کا جسم پل پل، زیادہ سے زیادہ تیزی سے کمان کی طرح مڑ رہا تھا اور وہ کمر کے بل زیادہ سے زیادہ پھسل رہا تھا۔

''اب بس کرو، بس بہت ہوگیا! ارے اور مت جھکو!''، ہال کے مختلف کونوں سے گھبرائی ہوئی آوازیں ابھریں۔

بچہ کمر کے بل پھسلتا رہا، سر کے بل لٹکنے کی کوشش میں، سر آہستہ آہستہ نیچے کی طرف جھکتا رہا...

اچانک جیسے بجلی سی چمکی، اور سب کچھ گھوم گیا۔ ہوا میں شعلہ سا کچھ لپکا اور پلک جھپکتے میں اسٹیج پر دھم سے کچھ گرنے کی آواز آئی۔

پل بھر کو تو ہال میں جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا، اوپر کا سانس اوپر نیچے کا نیچے۔ بہت سے تماشائی تو گھبرا کر کھڑے ہوگئے۔ ہر طرف شور مچ گیا، کہیں کوئی چلا رہا ہے، کہیں عورتوں کی تیز چیخیں ابھر رہی ہیں، کہیں لوگ زور زور سے کچھ کہہ رہے ہیں، لرزتی ہوئی آوازیں ''ڈاکٹر، ڈاکٹر''، چلا رہی ہیں۔ اسٹیج پر بھی ہنگامہ تھا۔ سرکس کے وردی‌پوش ملازم اور مسخرے تیزی سے روک پھلانگتے ہوئے اسٹیج کی طرف دوڑے اور چاروں طرف سے بیکر کو گھیر لیا۔ دیکھتے دیکھتے بیکر ان کے درمیان کچھ کھو سا گیا۔ چند لوگوں نے لپک کر کوئی چیز اٹھائی، تیزی سے پچھلے پردے کی طرف بڑھے اور اصطبل والے دروازے سے اندر داخل ہوگئے۔

اب اسٹیج پر لوہے کے موٹھ والا لمبا سا سنہرا ڈنڈا پڑا تھا، اور بس!!

ارکسٹرا پل بھر بالکل خاموش رہنے کے بعد، اشارہ پاتے ہی اب پھر شروع ہوگیا۔ سرکس کے متعدد مسخرے قلابازیاں کھاتے، چھلانگیں لگاتے اسٹیج پر داخل ہوئے، لیکن اب انہیں کون دیکھتا بھلا! تماشائیوں کے پرے کے پرے باھری دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

اس تمام ہنگامے کے باوجود بہت سی نگاھیں نیلی ٹوپی اور اسکارف والی پیاری سی سنہرے بالوں‌والی بچی کو دیکھ رہی تھیں، جو سیاہ لباس میں ملبوس خاتون کے گلے میں باھیں ڈالے بےقابو ہوکر بڑی بےقراری سے بلک رہی تھی۔ منہ سے بار بار ایک ہی لفظ چیخ بن بن کر ابھر رہا تھا: ''ھائے لڑکا! لڑکا!''

اگلی صبح سرکس کے اشتہار میں ''ربڑ کے پتلے'' کے کرتبوں کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ اس کا نام کہیں بھی تو سنائی نہ دیا۔ اور کیسے سنائی دیتا... ''ربڑ کا پتلا'' اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا!!

کنستانتین استانیوکوویچ

ماکسیمکا

یہ افسانہ روس کے میدانوں اور پہاڑوں میں نہیں بلکہ منطقۂ حارہ کے سمندر کی فیروزی دوری میں بحریہ کے بادبانی جہاز کے عرشے پر وقوع پذیر ہوتی ہے۔ مشہور و معروف ادیب کنستانتن میخائیلووچ استانیوکووچ (۱۸۴۳ء تا ۱۹۰۳ء) نے یہ افسانہ ۱۸۹۶ء میں لکھا تھا۔ بچوں کےلئے انہوں نے اپنی ''سمندری کہانیاں،، اور ایک بڑی کتاب ''جہاز کورشون پر دنیا کے گرد سفر،، شائع کی تھیں۔

کنستانتن کے والد نے، جو ایڈمرل تھے، انہیں گیارہ سال کی عمر میں بحریہ کے اسکول میں داخل کر دیا۔ یہ آئندہ ادیب سترہ سال کی عمر میں تیز رفتار سمندری جہاز ''کلیوالا،، پر دنیا کے گرد سفر کےلئے روانہ ہوا جو تین برس تک جاری رہا۔ بائیس سال کی عمر میں بحریہ کی نوکری کو خیرباد کہہ کر استانیوکووچ نے کوئی سال بھر ایک گاؤں کے اسکول میں استاد کی طرح کام کیا اور بعد کو اخبارنویس بن گئے۔ انقلابیوں سے روابط رکھنے کے جرم میں انہیں گرفتار کرکے سائبیریا کے علاقے میں نظربند کر دیا گیا۔ یہیں، جلاوطنی کی حالت میں، انہوں نے ''سمندری کہانیاں،، لکھیں جن سے انہیں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔

استانیوکووچ کی کتابوں پر بچپن کے انمٹ تاثرات کی چھاپ ہے جب انہوں نے سیواستوپول کے قلعے کے فوجی گورنر کے بیٹے کی حیثیت سے نہ جانے کتنی بار روسی سپاہیوں اور جہازیوں کی بہادری، جرأت اور بلند انسانیت کی مثالیں اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ ان سپاہیوں اور جہازیوں کو کسی بھی طرح کے حقوق حاصل نہیں ہیں اور وہ اپنے کمانڈروں اور افسروں کے پوری طرح سے تابعدار ہیں۔ اپنی کہانیوں میں استانیوکووچ نے اس بات کو اجاگر کیا کہ کسان غلامی جس کو انہوں نے اپنی کم‌عمری میں دیکھا تھا، کس قدر ناپسندیدہ اور بھیانک ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے روسی جہازیوں کی انسان‌دوستی اور شرافت کی، بچوں سے محبت کی، زبان اور جلد کی رنگت کا لحاظ کئے بغیر ضرورتمندوں کی مدد کےلئے ہر وقت تیار رہنے کی تصویرکشی کی۔

توسک کے نام

۱

جہاز کا گھنٹہ ابھی ابھی بجا تھا - چھ بجے تھے - بحر اوقیانوس کے بیچ گرم سیر خطے کی ایک سہانی صبح تھی -

مشرق میں سورج سونے کے گولے کی طرح چمکتا اور دھکتا ہوا ہلکے نیلے آسمان پر تیزی سے اٹھ رہا تھا - صاف شفاف آسمان کی گہرائیوں میں برف کی طرح سفید بادلوں کے ٹکڑے نازک جھالروں کی طرح ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے - سورج کی منور کرنوں نے سمندر کی بے کراں وسعت پر نور کی چادر پھیلا رکھی تھی - سمندر کی لہراتی ہوئی ناپیدا کنار پہنائی کو نیلے افق کے کنارے گھیرے ہوئے تھے -

فضا پر گمبھیر خاموشی طاری تھی -

البتہ ان لاتعداد ہلکی نیلی لہروں کی آواز آ رہی تھی، جو ایک دوسرے کے پیچھے لگاتار بھاگ رہی تھیں - جب یہ لہریں اوپر اٹھتیں تو ان کی چاندی جیسی سفید چوٹیاں سورج کی روشنی میں چمک اٹھتیں - پھر یہ لہریں اوپر اٹھ کر ہولے ہولے اس طرح پیار بھرے انداز میں ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتیں جیسے چپکے چپکے کہہ رہی ہوں کہ گرم سیر خطے کا یہ بوڑھا سمندر ہمیشہ مطمئن اور پرسکون رہتا ہے -

یہ سمندر تیرتے ہوئے جہازوں کو مامتا بھری شفیق ماں کی طرح اپنی عظیم الشان چھاتی پر سنبھال لیتا ہے اور پھر ملاحوں کو نہ کسی طوفان کا ڈر رہتا ہے نہ کسی آندھی کا دھڑکا -

اس وقت سمندر بالکل سنسان تھا -

دور دور تک نہ کوئی بادبان نظر آ رہا تھا نہ دھواں اڑنے کا نشان - جہاں تک نظر کام کرتی تھی سمندر ہی سمندر دکھائی دیتا تھا -

کبھی کبھی کوئی اڑنے والی مچھلی سطح آب پر اچھلتی اور اس کے چاندی جیسے سفید چمکدار فلس سورج کی کرنوں سے ٹکرا کر چمک اٹھتے - تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوئی کھلنڈڑی وھیل مچھلی اپنی کالی پیٹھ پانی سے باھر نکالتی اور زور سے پانی کا فوارہ چھوڑ دیتی - پھر کوئی کالی کالی فریگیٹ* چڑیا یا برف کی مانند سفید قادوسی پرندہ سطح سمندر

---

* ایک قسم کی چڑیا جو بحر اوقیانوس اور جنوبی سمندروں میں پائی جاتی ہے - (ایڈیٹر)

پر اڑتا دکھائی دیتا۔ کبھی کبھی کوئی چھوٹا سا پطریل پانی پر سے تیر کی تیزی سے اڑتا گذر جاتا جو افریقہ یا امریکہ کے دوردراز کناروں کو جا رہا ہے۔ اس کے بعد سمندر پر پھر سناٹا چھا جاتا۔ پھر وہی کاناپھوسی کرتی ہوئی لہریں، وہی سورج، وہی آسمان، اور ایک بار پھر وہی چمکتی دمکتی ہشاش بشاش اور لطف و عنایت سے بھرپور فضا قائم ہو جاتی۔

روسی دخانی جنگی جہاز کلیپر*، جس کا نام ''زابیاکا،، (جھگڑالو) تھا، سمندر کی چڑھتی اترتی موجوں پر ہلکے ہلکے ہچکولے کھاتا ہوا تیزی سے جنوب کی جانب بڑھ رہا تھا۔ وہ دن بدن شمال کی سرزمین سے دور ہوتا جا رہا تھا، وہ سرزمین جو افسردہ اور اداس ہونے کے باوجود اتنی پیاری اور دل‌کش تھی۔

''زابیاکا،، چھوٹا سا خوبصورت، سیاھی مائل اور صاف ستھرا جہاز تھا۔ اس کے تین اونچے اور ذرا خم لئے ہوئے مستولوں پر اوپر سے نیچے تک بادبان چڑھے ہوئے تھے۔ وہ ایک جانب ہلکا سا جھکا ہوا سات یا آٹھ ناٹ کی رفتار سے متوازن شمال مشرقی بادمراد کے موافق بہاؤ کے ساتھ ساتھ بڑھا جا رہا تھا۔ بڑے حسین اور ہلکے پھلکے انداز میں لہروں کے ساتھ اترتا، چڑھتا، اپنے پیش سے سمندر کو چیرتا، متلاطم بھنور کے بےترتیب جھاگوں کو کاٹتا اور چمک‌دار پھواریں اڑاتا جا رہا تھا۔ لہریں آہستہ آہستہ جہاز کے پہلوؤں کو چاٹ رہی تھیں۔ دنبالے کے پیچھے چوڑی سی سیمیں لکیر پیدا ہو گئی تھی۔

جہاز پر صفائی ستھرائی کا کام شروع ہو چکا تھا۔ آٹھ بجے صبح تک ڈیک کے اوپر اور نیچے صفائی ستھرائی ختم ہو جاتی تھی کیونکہ اس وقت جھنڈا لہرایا جاتا ہے اور جہاز کا روزمرہ کا کام شروع ہو جاتا ہے۔

ملاح وردی کی سفید قمیصوں میں ملبوس عرشۂ جہاز پر مصروف کار تھے۔ قمیصوں کے چوڑے نیلے کالروں کے بیچ سے ان کی مضبوط اور دھوپ میں جھلسی ہوئی گردنیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کے پیر ننگے تھے اور پتلونیں گھٹنوں سے اوپر چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ عرشۂ جہاز، جہاز کے پہلوؤں، توپوں، پیتل کے سامان اور ''زابیاکا،، کے ڈیک پر رکھی ہوئی ہر اس چیز کو دھونے، گھسنے اور رگڑ کر صاف کرنے میں مشغول تھے جسے صفائی کی ضرورت تھی۔ سارے ملاح بڑی توجہ اور احتیاط کے ساتھ اس طرح کام میں جٹے ہوئے تھے جیسے ملاح اپنے جہاز کو صاف کرتے وقت محتاط رہتے ھیں۔ وہ اینٹ کے برادے، کپڑے اور پالش کرنے کے مسالے سے ہر چیز کو خوب چمکا رہے تھے۔ انھیں اس بات کا بڑا خیال تھا کہ کسی چیز پر، چاھے چھوٹی ہو یا بڑی، ذرا بھی داغ یا دھبہ نہ رہ جائے۔

سارے ملاح بڑی دیانتداری کے ساتھ خوب دل لگاکر کام کرنے میں مشغول تھے۔

---

* ایک قسم کا تیزرو دخانی جہاز۔ (ایڈیٹر)

جب کبھی انھیں ''غراتے،، صدرملاح متویئچ کی کوئی برجستہ فراٹےدار گالی سنائی دیتی تو وہ سب منہہ بند کئے چپکے چپکے ھنسنے لگتے۔ گو روسی ملاحوں کے کان گالیوں سے خوب آشنا ھوتے ھیں اس کے باوجود متویئچ کی گالیاں اتنی زوردار ھوتی تھیں کہ ان کو سن کر ملاحوں کے کان بھی کھڑے ھو جاتے تھے۔ متویئچ ٹھیٹ قسم کا پرانا جہازران تھا۔ اس کی بھوری آنکھیں باھر کو نکلی پڑتی تھیں اور چہرہ دھوپ میں جلنے اور ساحلوں پر کثرت سےنوشی کی وجہ سے لال پڑ گیا تھا۔ ملاحوں کو گالیاں دینے سے اس کا مقصد یہ نہیں ھوتا کہ انھیں کام پر اکسائے بلکہ اس کا اصول یہ تھا کہ گالیوں کے بغیر ٹھیک طور سے کام ھی نہیں لیا جا سکتا ھے۔

متویئچ کی گالیوں کا کوئی بھی برا نہ مانتا۔ سب ملاح جانتے تھے کہ وہ رحمدل اور بھلا آدمی ھے، ان کے ساتھ ھمیشہ مناسب برتاؤ کرتا ھے اور کبھی اپنی افسری کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھاتا۔ سارے ملاح ایک عرصے سے اس کی اس عادت کے بھی عادی ھو چکے تھے کہ وہ گالی کے بغیر تین لفظ ایک ساتھ نہیں بول سکتا تھا۔ سارے ملاح اس سلسلے میں اس کے الفاظ کے خزانے اور گالیوں کی نئی نئی ترکیبوں سے خوب لطف اٹھاتے۔ واقعی وہ اس میدان کا بڑا ماھر استاد تھا۔

وقتاً فوقتاً کوئی ملاح جہاز کے اگلے حصے کے بلند عرشہ کی طرف چلا جاتا جہاں پانی کا ٹب رکھا تھا اور سگریٹ جلانے کی بتی ٹنگی تھی۔ وھاں وہ تیز و تند تمباکو کے دو چار دم لگاتا اور اپنے دوستوں سے ایک آدھ بات کرکے کام پر لوٹ آتا اور پھر گھسائی اور رگڑائی میں لگ جاتا۔ جب ملاحوں کی نظر دبلے پتلے درازقد چیف افسر پر پڑتی تو وہ اور بھی تندھی سے کام کرنے لگتے۔ چیف افسر صبح سویرے سے جہاز کے کونے کونے کا معائنہ کر رھا تھا۔

نگراں افسر سنہرے بالوںوالا نوجوان تھا۔ اس کی ڈیوٹی صبح چار بجے سے لیکر آٹھ بجے تک ھوتی تھی۔ اس وقت نگراں افسر پر نیند کا وہ غلبہ نہیں تھا جو ڈیوٹی شروع ھونے کے پہلے آدھہ گھنٹے کے دوران رھا تھا۔ وہ سفید لباس پہنے ھوئے تھا۔ اس کی قمیص گلے پر سے کھلی ھوئی تھی۔ وہ جہاز کے دیدبان پر ٹہل رھا تھا اور صبح کی تازی اور ٹھنڈی ھوا میں لمبی لمبی سانسیں لے رھا تھا۔ ھوا سورج کی حدت سے ابھی تک گرم نہ ھوئی تھی۔ وقتاً فوقتاً وہ یہ دیکھنے کےلئے قطب‌نما کے قریب رک جاتا کہ آیا سکان‌گیر جہاز کو صحیح راستے پر چلا رھا ھے یا نہیں، یہ دیکھتا کہ بادبان ٹھیک طریقے پر لگے ھوئے ھیں یا نہیں، آسمان پر کہیں آندھی لانےوالے سیاہ بادل تو نہیں ھیں۔ ایسے وقت میں مفرح اور صحت‌بخش ھوا اس کی گردن کے پچھلے حصے پر اٹکھیلیاں کرنے لگتی۔

سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ نگراں افسر کو اس پرسکون گرم سیر خطے میں ذرا سی بھی فکر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

وہ برابر ٹہلتا رھا اور اس بات کے سپنے دیکھتا رھا کہ جب اس کی ڈیوٹی ختم ھوگی

تو نہایت اطمینان سے چائے کے گرم گرم گھونٹ پیئےگا اور اس کے ساتھ افسروں کا کھانا تیار کرنےوالے ماہر باورچی کے بنائے ہوئے تازے بن کھائےگا۔ یہ باورچی بڑے لذیذ بن بناتا تھا بشرطیکہ وہ وادکا نہ پی جائے جو اسے آٹے میں خمیر پیدا کرنے کے لئے ملتی تھی۔

۲

اتنے میں یکبارگی جہاز کے اگلے سرے سے پہرہ‌دار کی بدحواس اور بوکھلائی ہوئی چیخ بلند ہوئی اور صبح کے سکوت کو توڑتی چلی گئی:

''سمندر میں ایک آدمی ہے!،،

ملاحوں نے جیسے ہی یہ چیخ سنی فوراً اپنا کام چھوڑ دیا اور دوڑ کر جہاز کے اگلے سرے پر پہنچے اور بڑی بےچینی سے سمندر میں گھورنے لگے۔

''کہاں! کہاں؟..،، وہ سب پہرہ‌دار سے پکار کر پوچھنے لگے۔ پہرہ‌دار سنہرے بالوں‌والا نوجوان ملاح تھا۔ اس وقت اس کا چہرہ گھبراہٹ کے مارے سفید ہو گیا تھا۔

''وہ دیکھو! وہاں!،، اس نے تھرتھراتے ہوئے ہاتھ سے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اب مجھے وہ آدمی نظر نہیں آرہا ہے۔ مگر دوستو میں نے ابھی ایک لمحہ پہلے اسے دیکھا تھا! وہ ایک مستول سے چمٹا ہوا تھا۔ ایسا دکھائی دیا جیسے وہ مستول سے بندھا ہوا ہو،، وہ گھبرایا ہوا کہے جا رہا تھا اور مستول کو دوبارہ دیکھنے کی لاحاصل کوشش کر رہا تھا۔

نگراں افسر پہرہ‌دار کی چیخ سے گھبرا اٹھا۔ اس نے جلدی سے اپنی آنکھوں سے دوربین چپکا لی اور پہرہ‌دار نے جس جانب اشارہ کیا تھا اس طرف بڑی بےچینی سے گھور گھور کر دیکھنے لگا۔

سگنل‌مین بھی اپنی چھوٹی سی دوربین سے دیکھنے لگا۔

''تمھیں کچھ نظر آ رہا ہے؟،، نوجوان افسر نے پوچھا۔

''ہاں جناب۔ ذرا سا اور بائیں جانب، جناب۔،،

مگر اسی لمحے خود اس افسر کو بھی مستول کا ایک ٹکڑا دکھائی دے گیا جو لہروں کے ساتھ ساتھ ابھرتا اور ڈوبتا بہا جا رہا تھا۔ اس سے ایک انسانی جسم بھی چمٹا ہوا نظر آ رہا تھا۔

یہ دیکھتے ہی افسر نے اپنے مضبوط اور صحت مند پھیپھڑے کی پوری طاقت سے تھرتھراتی ہوئی آواز میں چلا کر حکم دیا:

''ملاحو فوراً ڈیک پر جمع ہو جاؤ! بادبان کا گھیرا تنگ کرو! کشتی نیچے اتار دو!،،

اور پھر سگنل‌مین کی جانب پلٹ کر اس نے بےچینی سے کہا:

''اس آدمی پر اپنی آنکھیں گاڑے رکھو!،،
صدر ملاح نے زور سے سیٹی بجائی اور گرج کر آدمیوں سے کہا:
''نیچے کے ڈیک سے فوراً نکل آؤ!،،
سارے آدمی پاگلوں کی طرح دوڑ کر اپنے اپنے مقام پر پہنچ گئے۔

کپتان اور چیف افسر پہلے ہی دیدبان پر پہنچ گئے تھے۔ دوسرے افسران سوتے سے جاگ کر نیم خوابیدگی کے عالم میں یونیفارم پہنتے سیڑھیاں پھلانگتے ڈیک کی طرف دوڑ پڑے۔

جب سارے ملاح ڈیک پر جمع ہو گئے تو چیف افسر نے قاعدے کے مطابق کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ملاح اس کے فوری حکموں پر اس طرح تیزی کے ساتھ حرکت کرنے لگے جیسے ان کو اس بات کا بخوبی احساس ہو کہ اس وقت ایک ایک سکنڈ قیمتی ہے۔

سات منٹ کے اندر اندر تقریباً سارے بادبان مستول پر لپیٹ دئے گئے اور ''زابیاکا،، لہروں پر آہستہ آہستہ اٹھتا اور ڈوبتا ہچکولے کھانے لگا۔ ایک لمبی کشتی میں سولہ کشتی کھینےوالے اور ایک پتوار سنبھالنےوالا افسر سوار ہوگئے اور یہ کشتی جلدی سے نیچے اتار دی گئی۔

جیسے ہی کشتی جہاز سے پرے ہٹی کپتان نے دیدبان پر سے چلاکر کہا ''خدا حافظ،،۔

ملاحوں نے جان لگاکر کشتی کھینی شروع کی اور ڈوبتے آدمی کو بچانے کےلئے تیزی کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

مگر ان سات منٹوں کے دوران میں جب کہ ''زابیاکا،، کو تھامنے کی کوشش کی گئی جہاز ایک میل سے زیادہ آگے نکل چکا تھا اور اب دوربین کے ذریعے بھی نہ تو وہ مستول دکھائی دے رہا تھا نہ اس سے چمٹا ہوا انسانی جسم۔

بہرحال قطب‌نما کے ذریعے وہ رخ دیکھ لیا گیا تھا جس طرف مستول بہا جا رہا تھا۔ اب وہ اسی جانب اپنی کشتی کھیتے ہوئے بڑھے جا رہے تھے۔

''زابیاکا،، کے جہازرانوں کی آنکھیں کشتی کا پیچھا کر رہی تھیں جو لہروں کی جھاگ پر کبھی ابھرتی اور کبھی لہروں کے درمیان آبریزوں میں ڈوبتی بڑھی جا رہی تھی۔ لہروں کے درمیان کشتی کھوپرے کے خول کی مانند چھوٹی سی دکھائی دے رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ صرف ایک کالا سا دھبہ بن کر رہ گئی۔

۳

عرشۂ جہاز پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔

ملاح جہاز کے اگلے بلند عرشے اور ڈیک پر اکٹھا تھے اور تھوڑی دیر بعد آپس میں آہستہ آہستہ کانا پھوسی کرنے لگتے:

''یہ آدمی ضرور کسی شکستہ جہاز کا ملاح ہوگا۔''

''اس سمندر میں کوئی جہاز بھی ڈوب نہیں سکتا ہے۔ کوئی بہت ہی شکستہ اور خراب جہاز ہوگا تب ہی ڈوبے گا!''

''ٹھیک کہتے ہو۔ مگر ہو سکتا ہے کہ یہ جہاز رات کی تاریکی میں کسی دوسرے جہاز سے ٹکرا گیا ہو۔''

''ہو سکتا ہے کہ اس میں آگ لگ گئی ہو۔''

''اور صرف ایک آدمی زندہ بچ گیا ہو!''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ دوسرے آدمیوں نے کشتیوں میں پناہ لےلی ہو اور یہ بیچارا پیچھے چھوٹ گیا ہو۔''

''کیا پتہ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں؟''

''یہاں پانی کافی گرم ہے اس لئے شاید ابھی زندہ ہو۔''

''اسے شارک مچھلیوں نے کیسے چھوڑ دیا؟ یہ سمندر تو ان مچھلیوں سے بھرا پڑا ہے۔''

''ہاں دوستو۔ ملاح کی زندگی میں تو بس خطرے ہی خطرے ہیں۔ میں اسے خوب جانتا ہوں'' ایک ملاح نے ٹھنڈی آہ دباتے ہوئے کہا۔ یہ ایک نوجوان لڑکا تھا۔ اس کے بال کلے تھے اور ایک کان میں بالی لٹکی ہوئی تھی۔ وہ اسی سال بحری فوج میں بھرتی ہوا تھا اور اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ سیدھا کھیتوں سے سمندر پر آیا تھا۔ یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر افسردگی سی چھا گئی۔ اس نے ٹوپی اتاری اور آہستہ سے سینے پر اس طرح صلیب کا نشان بنایا جیسے چپکے چپکے خدا سے دعا مانگ رہا ہو کہ خدا اسے سمندر کی ہولناک موت سے محفوظ رکھے۔

جہاز پر پون گھنٹے تک نہایت ہی تکلیف‌دہ خاموشی طاری رہی۔

آخرکار سگنل‌مین یکایک خوشی سے چلایا۔ اس نے چھوٹی سی دوربین اپنی آنکھوں پر چپک رکھی تھی:

''کشتی واپس آ رہی ہے!''

کشتی قریب ہونے لگی تو چیف افسر نے چلا کر پوچھا:

''کیا ملاحوں نے اسے بچا لیا ہے؟''

''مجھے تو کشتی میں وہ آدمی نظر آ نہیں رہا، جناب!'' سگنل‌مین نے کہا اور اس بار اس کی آواز میں پہلی سی خوشی نہیں تھی۔

''مجھے خدشہ ہے کہ ملاح اسے بچا نہ سکے'' چیف افسر نے کپتان کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''زابیاکہ'' کا کپتان ادھیڑ عمر اور چھوٹے قد کا موٹا سا قوی ہیکل آدمی تھا۔ اس کے بھر بھرے موٹے گلوں اور ٹھوڑی پر سیاہی مائل بھوری گھنی ڈاڑھی تھی۔ اس

کی چھوٹی چھوٹی گول گول آنکھوں سے باز کی سی پھرتی اور تیزی جھلکتی تھی۔ اس نے بیچینی سے کندھے جھٹکاتے ہوئے اور جھلاهٹ بھرے لہجے میں چیف افسر سے کہا:

''آپ کا خیال غلط ہے۔ کشتی میں ایک تجربہ کار افسر موجود ہے اور اگر وہ اس آدمی کو بچا نہ لیتا تو کبھی اتنی جلدی نہ لوٹ آتا۔''

''مگر سگنل‌مین کو کشتی پر وہ آدمی نظر نہیں آ رہا!''

''ہو سکتا ہے کہ وہ کشتی کے نچلے حصے میں پڑا ہو۔ بہر حال ہمیں ابھی سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔''

کپتان بیچینی سے دیدبان پر ٹہلنے لگا۔ وہ بار بار رکتا اور واپس آتی ہوئی کشتی کی طرف دیکھنے لگتا۔ آخرکار اس نے دوربین اٹھائی اور بہت غور سے دیکھا۔ اس بار بھی اسے کشتی پر وہ آدمی نظر نہ آیا مگر کشتی کے افسر کے چہرے پر اطمینان اور خوشی کے تاثرات دکھائی دئے۔ یہ دیکھ کر اسے یقین سا ہو گیا کہ اس آدمی کو بچا لیا گیا ہے۔

کپتان کے مرجھائے چہرے پر مسکراهٹ کھیل گئی۔

چند منٹ بعد کشتی جہاز سے آ لگی اور کشتی کو مع جہازرانوں کے اوپر اٹھا لیا گیا۔

افسر کشتی سے باهر نکلا اور اس کے پیچھے پیچھے ملاح نکلے۔ ان کے چہرے لال ہو گئے تھے، پسینہ بہہ رہا تھا اور تھکن کی وجہ سے سانس پھول رہی تھی۔ ایک ملاح ایک چھوٹے سے لڑکے کو تھامے ہوئے تھا جس کی جان ان ملاحوں نے بچا لی تھی۔ یہ ایک حبشی لڑکا تھا جس کی عمر دس گیارہ سال کی تھی۔ وہ پانی میں شرابور تھا۔ اس کے دبلے پتلے چمکدار سیاہ جسم سے پھٹی قمیص چپکی ہوئی تھی۔

یہ چھوٹا سا لڑکا مشکل سے کھڑا ہو سکتا تھا۔ وہ بری طرح تھرتھرا رہا تھا اور اپنی بڑی بڑی اور دھنسی ہوئی آنکھوں سے ملاحوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں خوشی بھی تھی اور ڈر بھی جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ واقعی اس کی جان بچ گئی ہے۔

''ہم نے جب اس بیچارے کو بچایا تو وہ ادھہ موا ہوچکا تھا۔ ہمیں اس کو ہوش میں لانے میں کافی دقت پیش آئی'' افسر نے کپتان سے کہا۔

''اسے فوراً بیماروں کے کیبن میں لے جاؤ!'' کپتان نے حکم دیا۔

لڑکے کو فوراً بیماروں کے کیبن میں پہنچا دیا گیا۔ وهاں اس کا جسم خشک کرکے اسے سونے کے تختے پر لٹا دیا گیا اور موٹے موٹے کمبلوں سے لپیٹ دیا گیا۔ اس کے بعد جہاز کے ڈاکٹر نے اس کا علاج شروع کیا اور اس کے منہه میں قطرہ قطرہ برانڈی ٹپکانے لگا۔

لڑکے نے تشنگی کے عالم میں برانڈی نگلنی شروع کردی اور ڈاکٹر کی طرف منت بھری نظروں سے دیکھ دیکھ کر اپنے منہه کی طرف اشارے کرنے لگا۔

اس دوران میں عرشۂ جہاز پر بادبان پھر چڑھا دئے گئے تھے اور پانچ منٹ کے اندر اندر ''زابیاکا،، پھر پرانی رفتار سے اپنے راستے پر بڑھا جا رہا تھا اور سارے ملاح ادھورے کاموں کو پورا کرنے میں مشغول ہو چکے تھے۔

جہاز پر ہر طرف بڑے جوش و خروش سے اسی لڑکے کا ذکر ہو رہا تھا۔ ہر شخص اس کے کمزور جسم اور ادھہ موئی حالت پر اظہار خیال کر رہا تھا۔

کچھ ملاح اس کی خیریت دریافت کرنے کےلئے اتنے بیچین تھے کہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد دوڑتے ہوئے بیماروں کے کیبن کی طرف جاتے اور اس کی بابت دریافت کرتے۔

''ڈاکٹر اس کا علاج کر رہا ہے۔ وہ اسے ضرور بچا لیگا!،،

گھنٹہ بھر بعد ٹاپ‌سین* کورشونوف نے بتایا کہ چھوٹا حبشی لڑکا گرم سوپ کے چند چمچے پینے کے بعد سو گیا ہے۔

''باورچی نے اس کےلئے خاص طور پر سوپ تیار کیا تھا یارو! سوپ کیا تھا پرہیزی یخنی تھی،، کورشونوف نے بڑے جوش کے ساتھ کہا۔ وہ اس وقت خوش تھا کہ چلو کم سے کم ایک وقت تو لوگ اس کی باتیں سنجیدگی کے ساتھ کان دھرکر سن رہے ھیں (وہ پرلے درجہ کا بدنام جھوٹا مشہور تھا) اور اس وقت وہ ایسی بات بتا رہا ہے جس میں جھوٹ کی آمیزش کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔

ایسے زرین موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش میں وہ جلدی جلدی کہہ رہا تھا:

''ڈاکٹر کے مددگار نے مجھے بتایا کہ جب ڈاکٹر لڑکے کو غذا دے رہا تھا تو لڑکا منہہ ھی منہہ میں بڑبڑا رہا تھا۔ وہ اور سوپ مانگ رہا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کے ھاتھوں سے سوپ کا پیالہ چھیننے کی کوشش بھی کی۔ مگر ڈاکٹر نے اسے زیادہ سوپ نہیں دیا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ 'اسے بہت آھستہ آھستہ غذا دینی چاھئے ورنہ مر جائیگا۔'،،

''پھر لڑکے نے کیا کیا؟،،

''کچھ نہیں۔ اسے ڈاکٹر کا کہنا ماننا پڑا۔،،

اس وقت کپتان کا اردلی سوئکن کپتان کے سگار کا بچا ہوا ٹکڑا لئے ہوئے اس جگہ آ گیا جہاں پانی کے ٹب کے گرد ملاح اکٹھا تھے۔

ہر شخص فوراً اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''تم نے کچھ سنا سوئکن، اب اس حبشی لڑکے کے ساتھ کیا کیا جائےگا؟،،

سوئکن کے بال لال تھے اور چہرے پر جھائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ ملاحوں کی نفیس قمیص پہنے ہوئے کافی قرینے کے لباس میں ملبوس تھا۔ پیروں میں کینویس کے جوتے تھے۔ اس نے بڑے بارعب انداز میں سگار کا ایک کش لیا اور بڑے ذمہ‌دارانہ لہجے میں اس طرح کہا جیسے اسے سب کچھ معلوم ہو:

---

* جہاز کے اوپری حصے میں کام کرنےوالا جہازران۔ (ایڈیٹر)

''اس کے ساتھ کیا کیا جائےگا؟ بس یہی کہ جب ہم 'راس امید، پہنچینگے تو اسے ساحل پر اتار دینگے۔''

اور پھر تھوڑی دیر ٹھیر کر اس نے کچھ حقارت سے کہا:

''یہ کالا کلوٹا ناکارہ لڑکا ہمارے کس کام کا؟ کالے پیلے وحشی ھی تو ہوتے ھیں یہ سب حبشی!''

''وحشی ہوں یا نہ ہوں۔ وہ بھی تو آخر ہماری تمہاری طرح خدا کی ھی مخلوق ھیں'' جہاز کے بوڑھے بڑھئی زخارچ نے کہا۔

سارے ملاحوں نے جو اس وقت وہاں تمباکو پی رہے تھے زور و شور سے اس کی ھاں میں ھاں ملائی۔

''مگر یہ بیچارا لڑکا 'راس امید، سے اپنے گھر تک کیسے جائیگا۔ میرا دل کہتا ھے کہ اس کے ماں باپ بھی کہیں نہ کہیں ضرور ہونگے'' کسی نے کہا۔

''اوہ۔ 'راس امید، میں بہت سے حبشی رہتے ھیں۔ وہ معلوم کر لینگے کہ یہ لڑکا کہاں کا رہنےوالا ھے'' سوئکن نے کہا اور سگار کے ٹکڑے کا آخری کش لگاکر چلا گیا۔

''بڑا آیا ڈینگیں مارنےوالا۔ خوشامدی ٹٹو کہیں کا!'' بوڑھے بڑھئی نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

٤

دوسرے دن بھی حبشی لڑکا خاصہ کمزور تھا مگر اپنے سر سے گزری ہوئی مصیبت کے جھٹکے سے بڑی حد تک نجات پا چکا تھا۔ اس لئے خوش طبع اور موٹے ڈاکٹر نے اپنے مخصوص انداز میں ہنستے ہوئے اس کے گال تھپ تھپائے اور اسے یخنی کا پورا ایک پیالہ پینے کی اجازت دے دی۔ لڑکا گرم یخنی کا پورا پیالہ ایک سانس میں غٹاغٹ پی گیا۔ اس نے اپنی بڑی بڑی اور ابھری ہوئی آنکھوں میں بڑی محبت اور تشکر بھرکر ڈاکٹر کو دیکھا۔ اس کے کالے کالے دیدے سفید پردے پر اور بھی ابھرے دکھائی دے رہے تھے۔

اس کے بعد ڈاکٹر نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ لڑکا سمندر میں کیسے پہنچ گیا تھا اور کتنے دن تک وہ غذا کے بغیر رہا۔ ڈاکٹر نے طرح طرح کے اشاروں سے بات کرنے اور مریض کو اپنی بات سمجھانے کی لاکھ کوشش کی لیکن اس سے گفتگو کرنے میں قطعی ناکام رہا۔ اگرچہ لڑکا ڈاکٹر سے زیادہ انگریزی جانتا تھا مگر وہ دونوں جو دو چار الفاظ جانتے تھے ان کو بھی کچھ اس طرح گڈمڈ کر دیتے کہ سارا مضمون خبط ہو جاتا تھا۔ چنانچہ وہ ایک دوسرے کا مطلب سمجھنے میں بالکل ناکام رہے۔

تب ڈاکٹر نے اپنے مددگار کو بھیجا کہ جہاز کے ایک چھوٹے افسر کو بلا لائے جسے سارے افسر پیتیا کے نام سے پکارتے تھے۔

''پیتیا، تم تو اچھی خاصی انگریزی بول لیتے ہو ۔ دیکھو شاید تم اس سے باتیں کر سکو۔ میں نے تو اپنی بساط بھر کوشش کرکے دیکھ لیا،، ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے کہا ۔ ''اس سے کہو کہ میں اسے دو تین دن میں اٹھنے بیٹھنے کی اجازت دے دونگا ۔ ،،

نوجوان افسر لڑکے کے بستر کے کنارے بیٹھ گیا اور اس سے انگریزی زبان میں پوچھنے لگا ۔ وہ کوشش کرکے چھوٹے چھوٹے جملے بول رہا تھا اور ہر لفظ کو خوب کھول کر اور اس پر زور دےکر کہہ رہا تھا ۔ اس کے کہے ہوئے سب الفاظ تو لڑکے کی سمجھ میں نہیں آئے مگر پھر بھی وہ بہت کچھ مطلب سمجھ گیا ۔ لڑکا بھی کئی ایک لفظوں کو گڈمڈ کرکے اور ہاتھوں وغیرہ کے اشارے کی مدد سے اس کے سوالات کے جواب دینے کی کوشش کرنے لگا ۔

ان دونوں کی گفتگو کا یہ طویل اور بوجھل سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا ۔ اس کے بعد چھوٹے افسر نے اس لڑکے کے جوابوں اور تاثرات سے اس کی بپتا کا جو کچھ اندازہ لگایا تھا اس کی ایک دھندلی مگر صحیح صحیح رپورٹ افسروں کے وارڈ روم میں بیان کی ۔

یہ حبشی لڑکا ایک امریکی جہاز ''بیٹسی،، پر سفر کر رہا تھا اور اس جہاز کے کپتان (''ایک سنگدل حیوان،، چھوٹے افسر نے زور دے کر کہا) کا ملازم تھا ۔ وہ اس کپتان کے کپڑے دھوتا، جوتے پالش کرتا اور اس کی میز پر کافی اور اس کے ساتھ ساتھ برانڈی چنتا تھا (یا یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ برانڈی زیادہ مقدار میں اور کافی برائے نام) ۔ کپتان اس کو ''بوائے،، کہہ کر پکارتا تھا ۔ چھوٹا حبشی اس نام کا اتنا عادی ہو گیا تھا جیسے یہی اس کا اصلی نام ہو ۔ اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ اس کا باپ کون ہے اور اس کی ماں کہاں ہے ۔ کپتان نے ایک سال قبل اسے موزمبیق میں بردہ فروشی کے ایک بازار میں خریدا تھا اور اس وقت سے کوئی دن ایسا نہ گزرا تھا جبکہ کپتان نے اس لڑکے کی پٹائی نہ کی ہو ۔ ''بیٹسی،، جہاز سینیگل سے روانہ ہوا تھا اور ریو جا رہا تھا ۔ اس جہاز پر حبشی غلاموں کا ایک غول لے جایا جا رہا تھا ۔ دو دن قبل یہ جہاز ایک دوسرے جہاز سے ٹکرا کر ڈوب گیا تھا (چھوٹے افسر کی رپورٹ کا یہ حصہ لڑکے کے اس بیان پر مبنی تھا جس کے اظہار کے وقت اس لڑکے نے ''دھم! دھم! دھم!،، کی آواز نکلی اور ساتھ ھی ساتھ جہاز کے کمرے کی دیوار کو مکے سے پیٹا) ۔ لڑکا موجوں کی لپیٹ میں آگیا اور بہتے ہوئے ایک مستول سے چمٹ گیا اور تقریباً دو دن تک اسی عالم میں بہتا رہا ۔

یہ لڑکا جہازوالوں کے ہمدردانہ اور مشفقانہ سلوک پر گھبرائے گھبرائے انداز میں اور سہمی سہمی نظروں سے جس تعجب کا اظہار کر رہا تھا اور جہاز کے ڈاکٹر اور چھوٹے افسر کی طرف پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ کر جس تشکر کا اظہار کر رہا تھا، ان احساسات کی ادائگی کے لئے موزوں سے موزوں الفاظ بھی ناکافی ثابت ہوتے ۔ اس کی چمکتی ہوئی سیاہ پیٹھ کی خستہ حالی جس پر زخموں کے نشان نظر آتے تھے اور نحیف اور دبلی پتلی

جلد کے اندر سے جھلکتی ہوئی ہڈیاں اس کی مصیبت اور کس‌مپرسی کی خود منہہ بولتی تصویریں تھیں۔

چھوٹے افسر کی رپورٹ اور ڈاکٹر کی تصدیق نے وارڈ روم میں بیٹھے ہوئے سب افسروں کے دلوں پر گہرا اثر کیا۔ ایک افسر نے یہ تجویز پیش کی کہ اس لڑکے کو کیپ ٹاون میں روسی قونصل کی تحویل میں دے دیا جائے اور اس کے اخراجات کے لئے آپس میں چندہ اکٹھا کیا جائے۔

اس شام کو جب چھوٹے افسر کے نوجوان اردلی ارتیمی سوخین نے (جس کو سب لوگ ارتیوشکا کے نام سے پکارتے تھے) جہاز کے اگلے حصہ پر بیٹھ کر تمام ملاحوں کی موجودگی میں یہ قصہ بیان کیا تو اس کا اثر اور بھی زیادہ گہرا ہوا۔ اس قصہ کو بیان کرتے وقت جب وہ امریکی کپتان کے جابرانہ اور بہیمانہ سلوک کا ذکر کرتا تو اس میں اپنی طرف سے بھی تھوڑا سا نمک مرچ اور لگا دیتا اور ایسا کرنے میں خود ایک طرح کی خوشی سی محسوس کرتا۔

''وہ روزانہ اس بیچارے معصوم بچے کو اذیت پہنچاتا تھا۔ اس سے ذرا سی بھی غلطی ہوجاتی تو اس کے منہہ پر اس زور سے ان گنت تھپڑ لگاتا کہ بچے کے منہہ سے خون ٹپکنے لگتا۔ اور پھر وہ کھونٹی پر سے اپنی ایک بڑی سی خوفناک پیٹی اتار لیتا جو موٹے چمڑے کی بنی ہوئی تھی اور اس سے لڑکے پر کوڑے برسانے لگتا۔،، وہ کہتا جا رہا تھا اور پوری کوشش کر رہا تھا کہ چھوٹے لڑکے کی مصیبتوں اور تکلیفوں کی بھیانک سے بھیانک تصویر کھینچے۔ ''اس سور کے بچے کو مطلقاً اس بات کی پروا نہ تھی کہ یہ بچہ حبشی النسل سہی مگر ہے تو بیکس و مجبور بچہ! اس بیچارے کی پیٹھ اب تک داغ داغ ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اس کو دیکھنے ہی سے بیحد تکلیف ہوتی ہے۔،،

ارتیوشکا پر ان تمام واقعات کا بہت اثر تھا۔ وہ بڑے جوش سے کہے جا رہا تھا۔

ابھی تھوڑے ہی عرصے پہلے یہ ملاح خود بھی غلام کسان تھے اور کوڑوں اور مارکٹائی کی اذیت سے بخوبی آشنا تھے۔ انھیں چھوٹے لڑکے کی اذیتوں کو محسوس کرنے کے لئے اس بات کی قطعی ضرورت نہ تھی کہ ارتیوشکا ان کے سامنے ان واقعات کو بڑھا چڑھا کر اور نمک مرچ لگاکر بیان کرے۔ ان سب کی دلی خواہش تھی کہ اگر امریکی کپتان ابھی تک سمندر کی شارک مچھلیوں کا نوالہ نہیں بنا ہے تو اب بن جائے۔ ان کی بددعا تھی کہ اس کا برے سے برا حشر ہو۔

''ہمارے ملک کے کسان تو آزاد ہوچکے ہیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ میں ابھی غلامی موجود ہے؟،، ایک بوڑھے ملاح نے کہا۔

''ہاں وہاں بعض لوگ آج بھی غلام ہیں۔،،

''میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اور اس کے باوجود امریکی اپنے آپ کو آزاد قوم کہتے ہیں۔،،

''وہ حبشیوں کو غلام رعیت سمجھتے ھیں،، ارتیوشکا نے وضاحت کرتے ھوئے کہا۔ افسروں کے وارڈ روم میں جو گفتگو ھوئی تھی اس کو سننے کے بعد اسے اس موضوع پر تھوڑی بہت معلومات حاصل ھوئی تھیں۔ ''اور یہی وجہ ھے کہ امریکی آپس ھی میں لڑ رھے ھیں*۔ کچھ امریکی حبشیوں کو آزادی دلانا چاھتے ھیں اور دوسرے جن کے پاس حبشی غلام ھیں وہ ان کو آزادی دینا نہیں چاھتے۔ اتنی سی بات پر وہ ایک دوسرے کا گلا کاٹ رھے ھیں۔ مگر افسروں کا کہنا ھے کہ آخرکار لڑائی میں کامیابی انھی لوگوں کو ھوگی جو حبشیوں کی آزادی کی حمایت میں لڑ رھے ھیں۔ یہ لوگ یقیناً ایسے تمام امریکیوں کو ختم کر دینگے جو دوسروں کو غلام رکھنا چاھتے ھیں،، اس نے کہا اور یہ کہتے وقت اسے خوشی سی محسوس ھوئی۔

''مجھے قوی امید ھے کہ خدا ان کی مدد کریگا۔ دنیا کے اور انسانوں کی طرح حبشی بھی آزادی کا خواھشمند ھے۔ چڑیا بھی پنجرے میں اداس رھتی ھے اور انسانوں کی بھی تو یہی فطرت ھے،، زخارچ بڑھئی نے کہا۔

سانولے رنگ کا نوجوان ملاح جس کی نوکری کا پہلا سال تھا اور جس نے ''سمندر کی زندگی کے خطرناک ھونے،، کا ذکر کیا تھا بڑے غور سے ساری گفتگو سن رھا تھا۔ اس نے اس موقع پر پوچھا:

''تو کیا یہ حبشی لڑکا جسے ھم نے بچا لیا ھے اب آزاد ھو جائیگا؟،،

''کیوں نہیں۔ تمھیں شک کس بات پر ھے؟،، ارتیوشکا نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا حالانکہ وہ خود اس کے متعلق یقینی طور پر کچھ نہیں جانتا تھا۔ اسے کچھ نہیں معلوم تھا کہ امریکی قانون کے تحت ایک فرد کے کیا حقوق ھوتے ھیں۔

مگر اس کی اپنی منطق یہی تھی کہ لڑکا ضرور آزاد کر دیا جائیگا۔ اس شیطان کپتان کی لاش مچھلیوں کے پیٹ میں پہنچ چکی تھی لھذا اب ڈر کس بات کا تھا؟

اور وہ کہے جا رھا تھا:

''جب ھم 'راس امید، پہنچ جائینگے تو اسے صرف ایک نئے پاسپورٹ کی ضرورت ھوگی اور اس کے بعد وہ جہاں جانا چاھے جا سکیگا۔،،

پاسپورٹ کے خیال نے اس کے شبہات کو اور بھی زائل کر دیا۔

''بالکل ٹھیک!،، نوجوان ملاح نے جلدی سے کہا۔ لڑکے کی آزادی کے خیال ھی سے اس کے مچلتی ھوئی آنکھوں والے معصوم اور گلابی چہرے پر مسکراھٹ کھیل گئی۔

شام کا جھٹپٹا جلد ھی ختم ھوگیا اور گرم سیر خطے کی سہانی رات اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ ھر طرف چھا گئی۔ آسمان کی مخملی بلندی پر کروڑوں تارے جگمگانے

---

* یہاں ذکر ھے ریاستہائے متحدۂ امریکہ میں اندرونی جنگ کا۔ (مصنف کا نوٹ)

لگے۔ سمندر پر ہر طرف تاریکی چھا گئی۔ کبھی کبھی جب جہاز کے پہلوؤں کے قریب پانی کٹ کٹ کر ادھر ادھر اچھلتا تو ہلکی سی چمک پیدا ہو جاتی۔

جلد ہی دعا کرنے کا بگل بجایا گیا۔

اس کے بعد گارڈ کے وہ سب آدمی جن کی ڈیوٹی شروع ہونےوالی تھی اپنے اپنے بستر لےکر ڈیک پر پہنچ گئے اور سو گئے۔

پہرہ‌دار سامان اور آلات کے درمیان بیٹھ گئے اور آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے اور پہرے کا وقت کاٹنے لگے۔ اس رات اکثر ٹولیوں میں حبشی لڑکا ہی موضوع گفتگو بنا رہا۔

۵

دو دن بعد حسب معمول صبح کے سات بجے ڈاکٹر مریضوں کے کیبن میں گیا اور اپنے واحد مریض کا معائنہ کرنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ اب مریض اس قابل ہو گیا ہے کہ ڈیک پر جا سکتا ہے اور دوسرے ملاحوں کے ساتھ کھانا کھا سکتا ہے۔ اس نے یہ بات لڑکے کو صرف اشاروں ہی اشاروں میں سمجھائی مگر اس مرتبہ حبشی لڑکا فوراً اس کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ اب بالکل تندرست ہوچکا تھا اور اتنا خوش وخرم دکھائی دیتا تھا جیسے یہ بات بالکل بھول چکا ہو کہ دو ہی دن پہلے مرتے مرتے بچا تھا۔ وہ اچھل کر بستر سے نکلا اور بھاگ کر اپنی ملاحوں کی اسی قمیص میں ڈیک پر دھوپ کھانے کے لئے جانا چاہتا تھا جو اس پر تھیلے کی طرح جھول رہی تھی۔ ڈاکٹر کی نظر اس کے چھوٹے سے کالے اور نحیف جسم پر پڑی۔ وہ لڑکے کا حلیہ دیکھ کر بےتحاشا ہنسنے لگا۔ اس کا مددگار بھی منہہ بند کرکے ہنسنے لگا۔ لڑکا کھڑا ہو گیا اور بھونچکا ہوکر سوچنے لگا کہ آخر ڈاکٹر کیوں اس کی قمیص کو جھٹکے دے رہا ہے اور اتنا بےتحاشا ہنس رہا ہے۔

یہ دیکھ کر لڑکے نے قمیص اتار دی اور مریضوں کے کمرے سے بالکل ننگ دھڑنگ باہر نکل کر جانے لگا مگر مددگار نے اسے روک لیا اور ڈاکٹر نے جو ابھی تک ہنس رہا تھا اس سے کہا:

''نہیں۔ نہیں...''

اس نے لڑکے کو اشاروں سے سمجھایا کہ وہ دوبارہ قمیص پہن لے۔

''ہم اسے کون سے کپڑے پہنائیں فیلیپوف؟'' ڈاکٹر نے ذرا سوچتے ہوئے اپنے مددگار سے کہا جو گھونگھریالے بالوں‌والا تیس سالہ بانکا جوان تھا۔ ''ہم نے اس کے متعلق پہلے سے کچھ نہیں سوچا۔ کیوں ہے نا!''

''ہاں جناب، اس کے بارے میں نہیں سوچا۔ اگر اس کی قمیص کو گھٹنوں پر سے

کاٹ دیا جائے اور اس کی کمر میں ایک پیٹی باندھ دی جائے تو یہ لباس اچھا خاصا مہذب نظر آنے لگےگا،، مددگار نے کہا۔ اس کی طبیعت کا یہ انوکھا خاصہ تھا کہ جب وہ اپنی گفتگو کو زیادہ پیچیدہ یا ملاحوں کے کہنے کے مطابق زیادہ ''عجیب،، بنانا چاھتا تو عموماً غیرضروری الفاظ استعمال کرنے لگتا تھا۔

''مہذب سے تمھارا کیا مطلب ھے؟،، ڈاکٹر نے مسکراتے ھوئے پوچھا۔

''میرا مطلب ھے بس 'مہذب، جناب۔ کون نہیں جانتا کہ مہذب سے کیا مراد ھے،، فیلیپوف نے اس طنز کو محسوس کرتے ھوئے کہا۔ ''صاف اور آرام دہ۔،،

''مجھے یقین نہیں کہ تمھارے کہنے کے مطابق یہ لباس واقعی 'مہذب، کہا جا سکےگا۔ وہ اس لباس میں پورا مسخرہ دکھائی دےگا۔ مگر فی‌الوقت ھمیں اس کو پہنانے کےلئے کوئی مناسب لباس تلاش کرنا ھے۔ بعد میں میں کپتان سے اجازت حاصل کر لونگا کہ اس کے ناپ کا لباس تیار کر دیا جائے۔،،

''اس کے ناپ کا لباس تیار کرنا کافی آسان ھے۔ جہازرانوں میں کچھ ملاح درزی کا کام بھی جانتے ھیں۔ وہ اس کےلئے لباس تیار کر دینگے۔،،

''بہت اچھا۔ اس وقت تک تم اس کے لئے اپنا تجویز کردہ مہذب لباس تیار کر دو۔،،

اس لمحے کسی نے بہت ھلکے ھلکے اور باادب انداز میں دروازہ کھٹ کھٹایا۔

''کون ھے؟،، ڈاکٹر نے پوچھا۔ ''اندر آجاؤ!،،

ایک سیدھا سادا سرخ اور سوجا سوجا سا چہرہ دروازے پر نمودار ھوا۔ اس شخص کے گل‌مچھے ھلکے بھورے تھے، ناک بے طرح سرخ اور آنکھیں سوجی سی تھیں لیکن پھر بھی ان آنکھوں سے بڑی زندہ‌دلی اور رحمدلی جھلک رھی تھی۔ وہ اندر داخل ھوگیا۔ چھوٹے سے قد مگر تندرست و توانا ھاتھ پیر کا یہ چاق و چوبند انسان جہاز کا فورٹاپ‌مین ایوان لوچکن تھا۔

اس کی عمر لگ بھگ چالیس سال کی تھی۔ وہ پندرہ برس سے بحری فوج میں کام کر رھا تھا اور اس جہاز کے بہترین ملاحوں میں سے تھا لیکن ساحل پر اترنے کے بعد پینے کے معاملے میں بدترین شرابی ثابت ھوتا تھا۔ شراب کی خاطر وہ اپنے جسم کے کپڑے بھی بیچ دیتا اور لنگوٹی لگائے جہاز پر واپس آ جاتا اور دوسرے دن صبح کو بڑی ڈھٹھائی سے کھڑا کوڑے کھانے کا انتظار کرتا رھتا جو بطور سزا لازمی طور پر اس پر برسائے جاتے تھے۔

''میں ھوں جناب،، لوچکن نے کرخت لہجے میں کہا۔ اس وقت وہ اپنے موٹے بھدے ننگے پیروں پر کھڑا بار بار پہلو بدل رھا تھا اور گھبراھٹ کے عالم میں ایک ھاتھ سے اپنی پتلون کی سیون کو اینٹھ رھا تھا۔ اس کا ھاتھ تارکول سے کام کرنے کی وجہ سے سیاہ پڑ چکا تھا۔

اس کے دوسرے ہاتھ میں گٹھری تھی۔

اس نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے اور نظروں سے ایسی شرمندگی اور ندامت ٹپک رہی تھی جو شرابیوں اور عموماً ان لوگوں کی آنکھوں میں جھلکتی ھے جو اپنی بری عادتوں کو محسوس کرتے ھیں۔

''کیا بات ھے لوچکن؟ کیا تم بیمار ھو؟''

''نہیں جناب۔ میں حبشی لڑکے کے لئے کچھ کپڑے لے آیا ھوں۔ میں نے دیکھا کہ اس کے پاس پہننے کے لئے کپڑے نہیں ھیں، سوچا کہ اس کے لئے تیار کر دوں۔ میں نے اس کا ناپ لے لیا اور اس کے لئے یہ کپڑے سی دئے۔ اگر آپ کی اجازت ھو تو میں اسے یہ کپڑے دے دوں؟''

''ضرور ضرور میرے دوست۔ تم نے تو ھماری فکر دور کردی'' ڈاکٹر نے حیرت کا اظہار کرتے ھوئے کہا۔ ''ھم ابھی یہی سوچ رھے تھے کہ اس لڑکے کو کیا پہنائیں۔ مگر تم نے تو ھم سے پہلے ھی سوچ لیا۔''

''میں نے اپنے فرصت کے اوقات میں یہ کام کیا ھے'' لوچکن نے بڑے خاکسارانہ انداز میں کہا۔

یہ کہتے ھوئے اس نے گٹھری کھولی اور اس میں سے کینویس کا بنا ھوا چھوٹا سا جہازی لباس نکالا۔ اس نے جھٹک کر لباس صاف کیا اور حیرت زدہ لڑکے کی طرف بڑھاتے ھوئے اور اس کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے ھوئے خوش خوش بولا:

''یہ تمھارے لئے ھے ماکسیمکا۔ یہ واقعی بہت اچھا یونیفارم ھے۔ اسے پہن لو! دیکھیں یہ تمھارے جسم پر کیسا لگتا ھے''۔ یہ کہتے وقت اس کی آواز میں وہ عاجزانہ انداز نہ تھا جو اس نے ڈاکٹر سے گفتگو کے دوران میں اختیار کیا تھا۔ اس کے برخلاف اُس کے لب و لہجے سے خوشی اور مسرت جھلک رھی تھی۔

''تم اسے ماکسیمکا کے نام سے کیوں پکار رھے ھو؟'' ڈاکٹر نے مسکراتے ھوئے پوچھا۔

''اس لئے جناب کہ ھم نے اسے سینٹ ماکسیم کے دن بچایا ھے۔ لہذا اس کا نام ماکسیمکا ھی ھونا چاھئے۔ اس کے علاوہ اس کا کوئی دوسرا نام ھے بھی تو نہیں! اور ھمیں کوئی نہ کوئی نام تجویز کرنا ھی ھے!''

چھوٹا حبشی لڑکا ملاحوں والے نئے اور اجلے یونیفارم کو پہن کر بہت خوش ھوا۔ ظاھر ھے اسے اس سے قبل ایسے کپڑے کہاں نصیب ھوئے تھے۔

لوچکن نے ھر زاویے سے اپنے تیار کئے ھوئے لباس کا معائنہ کیا۔ قمیص کو ایک طرف سے تھوڑا سا کھینچا اور دوسری طرف سے تھوڑا سا برابر کیا اور اسے یہ دیکھ کر اطمینان ھوا کہ لباس ناپ پر پورا اترا تھا۔

''اچھا تو ماکسیمکا چلو! ڈیک پر دھوپ میں بیٹھیں۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں جناب؟''

ڈاکٹر نے خوشی سے مسکراتے ہوئے سر ہلاکر ہاں کی۔ لوچکن لڑکے کا ہاتھ پکڑکر اسے جہاز کے اگلے بلند عرشے پر لے آیا اور اسے دوسرے ملاحوں کے آگے بڑھاتے ہوئے بولا:

''یہ ہے ماکسیمکا! یہ اب اس امریکی وحشی اور اس کے مظالم کو بھلا دےگا۔ یہ لڑکا جانتا ہے کہ روسی ملاح اس کے ساتھ کبھی بےرحمی سے پیش نہیں آئینگے۔''

اس نے بڑے پیار سے لڑکے کی پیٹھ تھپ تھپائی اور اس کے گھونگروالے بالوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''میاں ہم تمہارے لئے جلد ہی ٹوپی اور جوتا بھی تیار کر دینگے۔''

لڑکے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا مگر ملاحوں کے طوفان دیدہ چہروں کی مسکراہٹ دیکھ کر اسے یقین ہوگیا کہ یہ ملاح اس کے ساتھ کبھی برا سلوک نہیں کرینگے۔ لڑکا بھی ملاحوں کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا اور اس کے سفید سفید چمکیلے دانت دکھائی دینے لگے۔ اس وقت وہ اپنی جنم بھومی میں جنوبی سورج کی گرم کرنوں کی دھوپ سینک رہا تھا۔

اس وقت سے اس کا نام ماکسیمکا پڑا گیا۔

٦

لڑکا اب اپنے نئے جہازی لباس میں ملبوس تھا۔ ایوان لوچکن نے دوسرے ملاحوں سے اس کا تعارف کرانے کے بعد اعلان کیا کہ اب ماکسیمکا کی دیکھ بھال وہ خود کرےگا اور اسے اپنی نگرانی میں رکھےگا۔ کیوں نہ ہو اس نے لڑکے کے کپڑے جو سیئے تھے اور اس کا نام بھی تو تجویز کیا تھا!

لوچکن کے اداس دل میں جس کا کوئی رشتےدار نہیں تھا اس دبلے پتلے مریل لڑکے کے لئے، جو اتنی بالی عمر میں امریکی کپتان کے ظلم وستم کا شکار بن چکا تھا، یکایک ایسی غیرمعمولی ہمدردی آخر کیوں پھٹ پڑی تھی (اس کی اپنی زندگی خصوصاً بچپن اور جوانی کا دور کٹھن بیتا تھا)، اس کا دل اس بات کے لئے کیوں تڑپ اٹھا تھا کہ اس لڑکے کو جہاز پر ہر سکھ اور چین نصیب ہو، اس کے متعلق لوچکن نے کبھی ایک لفظ نہیں کہا۔ بہت سے سادہ لوح روسیوں کی طرح وہ بھی دوسرے لوگوں کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے شرماتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ لڑکے کی دیکھ بھال کرنے کا اعلان کرتے وقت اس نے اپنے ارادے کی وضاحت اس طرح کی کہ یہ ''چھوٹا سا مسخرہ بندر'' اسے بھا گیا ہے اس لئے اس کی نگرانی کی ذمہ‌داری وہ اپنے کاندھوں پر لینا چاھتا ہے۔

اس نے سخت لہجے میں سب کو اور خاص طور پر ملاح پیتروف کو متنبہ کیا کہ اس لڑکے کو کوئی نہ چھیڑے۔ ملاح پیتروف بڑا بدنام غنڈہ تھا اور نئے شرمیلے ملاحوں

کو جن کا جہاز پر پہلا سال ہوتا تھا، بہت تنگ کرتا تھا۔ لوچکن نے کہا کہ اگر کسی بدمعاش نے اس ''چھوٹے یتیم،، کو بھی تنگ کرنے کی ٹھانی تو اسے ایوان لوچکن سے نبٹنا پڑے گا۔

''ایسی غلطی کرنے کی کوئی جرأت نہ کرے ورنہ میں اس کا منہہ توڑ دونگا،، اس نے اس انداز سے کہا کہ اس کا جواب دینے کی ہمت کرنےوالا اس کے ارادوں کو خوب سمجھ لے۔ ''بچوں کے ساتھ بیرحمانہ برتاؤ کرنا سب سے بیہودہ گناہ ھے۔ چاھے بچے سفید نسل سے تعلق رکھتے ہوں چاھے کالی نسل سے۔ بچے بچے سب برابر ھیں۔ بچہ آخر کو بچہ ھی تو ھے۔ اس لئے اس کے ساتھ ھمیشہ محبت کا سلوک کرنا چاھئے،، اس نے اپنی گفتگو ختم کرتے ہوئے کہا۔

دوسرے ملاحوں نے ماکسیمکا پر لوچکن کی خود ساختہ سرپرستی کو جلد ھی قبول کر لیا حالانکہ بہت‌سوں کو اس میں شک تھا کہ وہ اس اھم ذمہ‌داری کو پورا کر بھی سکےگا یا نہیں۔

ملاحوں کا خیال تھا کہ لوچکن جیسا شرابی کبابی اور بدکار انسان بھلا لڑکے کی کیا خاک دیکھ بھال کرےگا!

ایک بوڑھے ملاح نے چوٹ کی:

''تو تم لڑکے کی انا کے فرائض انجام دوگے۔ کیوں ھے نا؟،،

''بالکل ٹھیک۔ ھاں انا!،، لوچکن نے اس آدمی کے عامیانہ اور بیہودہ انداز گفتگو کو نظر انداز کرتے ہوئے خوشی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم یہ کیوں سوچتے ہو کہ میں یہ کام اچھی طرح انجام نہیں دے سکونگا؟ وہ کسی رئیس کا لڑکا تو ھے نہیں! اس بچے کو تھوڑے سے کپڑوں کی بھی ضرورت ھوگی۔ مجھے اس کےلئے ایک اور سوٹ، ایک جوڑ جوتا اور ٹوپی بنانی ھوگی۔ ڈاکٹر اس کے لئے جہاز کے اسٹور سے کپڑے وغیرہ حاصل کرنے کی کوشش کر رھا ھے۔ ھمیں ماکسیمکا کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا چاھئے کہ جب ھم اسے 'راس امید، پہنچنے کے بعد اکیلا چھوڑ دیں تو وہ ھمیشہ روسی ملاحوں کے اچھے سلوک کو یاد کرتا رھے۔ ھم اس کے ساتھ کم سے کم اتنا سلوک تو کر ھی دینگے کہ وہ یہاں سے ننگا نہیں جائےگا۔،،

''مگر تم اس لڑکے سے بات کس طرح کر سکوگے لوچکن؟ نہ تم اس کی بات سمجھ سکوگے نہ وہ تمھاری!،،

''اوہ۔ ھم کسی نا کسی طرح ایک دوسرے کو سمجھ لینگے،، لوچکن نے یقین سے کہا۔ '' کالے ھونے سے کیا ھوتا ھے۔ وہ کافی ھوشیار لڑکا ھے۔ میں اسے جلد ھی اپنی زبان سکھا دونگا۔ وہ میرا کہا خوب سمجھ لےگا۔،،

اور اس نے پیار بھری نظروں سے چھوٹے لڑکے کی طرف دیکھا جو جہاز کے ایک کونے میں آلتی پالتی مارے بیٹھا متجسس نگاھوں سے ادھر ادھر تک رھا تھا۔

اس کی پیار بھری نظریں لڑکے کی نظروں سے ٹکرائیں تو لڑکا بھی مسکرا دیا۔ اس کی کھلی ہوئی اور تشکرآمیز مسکراہٹ اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ زبان نہ جاننے کے باوجود خوب سمجھ گیا ہے کہ لوچکن اس کا دوست ہے۔

ساڑھے گیارہ بجے جب صبح کا سارا کام ختم ہو گیا تو وادکا تقسیم ہونے کا وقت آیا۔ دو صدر ملاح اور آٹھ چھوٹے درجے کے افسروں نے ڈیک کے بیچ میں کھڑے ہوکر ایک حلقہ بنایا اور وادکا تقسیم ہونے کے اعلان کا بگل بجایا (ملاح اس بگل کو مذاق میں ''بلبل کا نغمہ،، کہتے تھے)۔ لوچکن نے خوشی سے مسکراتے ہوئے ہاتھ سے پینے کا اشارہ کیا اور ماکسیمکا کو سمجھایا کہ وہ وہیں بیٹھ کر اس کی واپسی کا انتظار کرے۔ اس کے بعد وہ اس تیزی سے ڈیک کی طرف روانہ ہو گیا کہ لڑکا متحیر رہ گیا۔

مگر زیادہ دیر اس کی یہ حالت نہیں رہی۔

وادکا کی تیز مہک جلد ہی عرشۂجہاز پر ہر طرف پھیل گئی۔ ملاح اپنے کھردرے اور کالے کالے ہاتھوں سے مونچھیں صاف کرتے ہوئے ڈیک سے واپس لوٹنے لگے۔ ان کے چہروں پر سنجیدگی اور اطمینان کی کیفیت تھی۔ اس منظر کو دیکھ کر لڑکے کی نظروں کے سامنے ''بیٹسی،، جہاز کے وہ نظارے پھر گئے جب ملاحوں کو ہفتہ میں ایک بار گلاس بھر رم شراب تقسیم ہوتی تھی۔ ''بیٹسی،، کا کپتان روزانہ اتنی چڑھا جاتا جو لڑکے کے اندازے کے مطابق کپتان کے لئے یقیناً ضرورت سے بہت زیادہ ہوتی تھی۔

وادکا کا بڑا سا جام چڑھانے کے بعد لوچکن مستی میں جھومتا جھامتا ماکسیمکا کے پاس لوٹا اور خوشی سے اس کی پیٹھ تھپ تھپائی اور اپنی مستی میں اس کو بھی شریک کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا:

''وادکا زندہ باد! ویری گوٹ شراب ہوتی ہے یہ، ماکسیمکا!،،

ماکسیمکا نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے گردن ہلا دی اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا:

''ویری گوٹ!،،

لڑکے کی اس فوری ذہانت پر لوچکن کو بڑی مسرت ہوئی۔

''شاباش ماکسیمکا!،، وہ چلا اٹھا۔ ''تم سب کچھ سمجھ لیتے ہو! اچھا اب چلو کھانا کھایا جائے۔ تمھیں بھوک لگی ہے؟،،

اور اپنا مطلب واضح کرنے کے لئے اس نے اپنے جبڑوں کو اوپر نیچے ہلایا۔

اس کا مطلب بھی سمجھنا مشکل نہ تھا کیونکہ ٹھیک اسی وقت لڑکے نے دیکھا کہ کچھ ملاح لکڑی کے بڑے بڑے پیالے لئے ہوئے ڈیک کے اوپر جا رہے ہیں۔ ان پیالوں میں سے شچی* کی اشتہاانگیز مہک آ رہی تھی۔

---

* کرم کلے کا شوربہ۔ (ایڈیٹر)

یہ دیکھ کر اس نے خوشی سے گردن ہلائی اور اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔
''سب کچھ سمجھ لیتا ہے!،، لوچکن نے کہا۔ اسے اس وقت لڑکے پر اور اپنی اس قابلیت پر کہ وہ لڑکے کو سب باتیں سمجھا لیتا ہے ایک طرح کا فخر محسوس ہونے لگا۔ اس نے لڑکے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور کھانا کھانے چل دیا۔

ڈیک پر ترپال بچھا ہوا تھا اور سب لوگ ٹانگیں سمیٹے بارہ بارہ کی ٹولیاں بنائے گول گھیروں میں بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے بھاپ نکلتی ہوئی شچی کی دیگیں رکھی تھیں۔ وہ سیدھے سادے لوگوں کی طرح بڑی خاموشی اور انہماک کے ساتھ شچی پی رہے تھے اور اس میں رسک بھگو بھگوکر کھا رہے تھے۔

لوچکن کھانےوالوں کے درمیان احتیاط سے قدم رکھتا اور راستہ بناتا ہوا ماکسیمکا کو ساتھ لئے اپنے گروہ کی طرف بڑھا جو سب سے بڑے مستول اور اگلے بادبان کے درمیان واقع تھا۔ وہاں پہنچ کر لوچکن نے اس کے منتظر ملاحوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:
''اچھا تو ساتھیو! ماکسیمکا کو اپنے میس میں شامل کر لیں ہم؟،،
''تم بھی کیا بات کرتے ہو! بیٹھ جاؤ تم دونوں!،، جہاز کے بوڑھے بڑھئی زخارچ نے کہا۔
''مگر شاید دوسروں کو کوئی اعتراض ہو۔ کیا خیال ہے تمھارا ساتھیو؟،، لوچکن نے دوبارہ پوچھا۔

ہر شخص نے اس لڑکے کو اپنے میس میں شریک کرنے کی حمایت کی اور کھسک کھسک کر ان کے بیٹھنے کے لئے جگہ بنا دی۔

اس کے بعد ہر طرف سے لوگوں نے ہنستے ہوئے چلا چلا کر کہنا شروع کیا:
''تم فکر نہ کرو۔ لڑکا ہم سب کا کھانا تو کھا نہیں جائیگا!،،
''نمکین گوشت کافی مقدار میں موجود ہے۔ اتنا کہ وہ بھی مزے میں کھا سکتا ہے!،،
''بچے کے لئے ہم چمچہ بھی لے آئے ہیں۔،،
''میں نے صرف اس لئے پوچھا کہ یہ لڑکا حبشی نسل کا ہے۔ تم سب جانتے ہی ہو کہ لوگ اسے ملیچ سمجھتے ہیں،، لوچکن نے کہا اور ڈیک پر بیٹھ گیا۔ اس نے ماکسیمک کو بھی اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ ''مگر میرا ایمان ہے کہ خدا کی نظروں میں سب انسان برابر ہیں۔ سب اپنی بھوک مٹانا چاہتے ہیں...،،
''بالکل ٹھیک! خدا اپنے سارے بچوں کو یکساں پیار کرتا ہے۔ وہ انسان انسان میں تفریق نہیں کرتا۔ سوئکن الو کا پٹھا ہے جو 'ملیچ ملیچ' کی بکواس کرتا رہتا ہے!،، زخارچ نے کہا۔

دوسرے تمام ملاح بھی زخارچ کی رائے سے یقیناً متفق تھے۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہ تھی کیونکہ روسی ملاح ہر رنگ اور نسل کے لوگوں سے، جن سے انھیں ملنے کا اتفاق ہوتا، ہمیشہ بڑی رواداری کا ثبوت دیتے۔

میس میں ماکسیمکا کا بڑا پرتپاک خیرمقدم ہوا۔ ایک ملاح نے اس کو لکڑی کا چمچہ تھما دیا، دوسرے نے رسک بھگوکر دیا۔ غرض کہ سارے ملاح اسے بڑی محبت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ لڑکے کو ملاحوں کا یہ سلوک کچھ عجیب سا لگا کیونکہ گوری چمڑیوالوں نے اس کے ساتھ کبھی اتنا ہمدردانہ برتاؤ نہیں کیا تھا۔

''اچھا تو اب ہمیں کھانا شروع کرنا چاہئے ورنہ شچی ٹھنڈا ہو جائیگا،، زخارچ نے کہا۔

ملاحوں نے اپنے سینوں پر صلیب کے نشان بنائے اور کھانا شروع کر دیا۔

''شروع کیوں نہیں کرتے ماکسیمکا؟،، لوچکن نے لڑکے کے چمچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ شچی ہے۔ بہت عمدہ۔ بہت مزےدار سوپ ہے،، اس نے زور دیتے ہوئے کہا۔

مگر ''بیٹسی،، جہاز پر ننھے حبشی کو گورے آدمیوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانے کی قطعی اجازت نہ تھی۔ اس جہاز پر اسے جھوٹا اور بچا کھچا کھانا بھی کسی اندھیرے کونے میں بیٹھ کر کھانا ہوتا تھا۔ اس لئے وہ اس وقت ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانے سے ڈر رہا تھا گو اس کی بھوکی آنکھیں کھانے پر گڑی ہوئی تھیں اور منہہ میں پانی بھر آیا تھا۔

''بچارا ڈر رہا ہے۔ اس سور کپتان نے اس کو بری طرح ڈرا دیا ہے،، زخارچ نے کہا جو لڑکے کی بغل میں بیٹھا ہوا تھا۔

یہ کہتے ہوئے اس نے ماکسیمکا کے گھونگروالے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور اپنا چمچہ اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

اس کے بعد ماکسیمکا کا ڈر دور ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ شچی، گوشت اور مکھن ملا ہوا باجرے کا دلیا خوب جی بھرکر کھانے لگا۔

لوچکن گاہے گاہے اس کا دل بڑھانے کی خاطر کہتا جاتا:

''ٹھیک بالکل ٹھیک ماکسیمکا۔ بہت اچھے میرے بھیا۔ خوب پیٹ بھرکر کھاؤ اور خوب تندرست ہو جاؤ۔،،

۷

جہاز پر ہر طرف ملاحوں کے خراٹوں کی آواز گونج اٹھی۔ وہ دو پہر کا کھانا کھانے کے بعد آرام کر رہے تھے۔ صرف پہرےدار اور متفرق کام جاننےوالے دو ایک ملاح جاگ رہے تھے۔ وہ فرصت کا فائدہ اٹھاکر جوتے ٹانکنے، نئی قمیص سینے یا پہننے کے کپڑوں کی مرمت کرنے میں مصروف تھے۔

''زابیاکا'' خراماں خراماں بڑھا جا رہا تھا۔ بادمراد اسے بہائے لئے جا رہی تھی۔

اور نگرانی کرنےوالے عملے کو زیادہ محنت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہاں اگر کسی وقت طوفان لانےوالے بادل آسمان پر اکٹھا ہوجاتے تو سارے ملاح فوراً کام میں مصروف ہوجاتے۔ تمام بادبان سمیٹ لئے جاتے تاکہ آندھی اور بارش کا جھکڑ خالی خولی مستولوں سے کٹ کر آگے نکل جائے۔ بہ‌الفاظ دیگر بادبانوں کو سمیٹ کر ان کا گھیرا اس قدر کم کر دیا جاتا کہ اس میں کم سے کم ہوا سما سکے۔

مگر اس دن مطلع بالکل صاف تھا۔ سیاہی مائل غبار کے اس چھوٹے سے دھبے کا کہیں پتہ نشان نہ تھا جو تیزی سے بڑھ کر طوفان کے گھنے گھنے بادل میں بدل جاتا ہے اور سورج اور آسمان کو ڈھک لیتا ہے۔ اور پھر آندھی کے جھونکے جہاز کو ایک طرف جھکا دیتے ہیں، بارش کا سیلاب ڈیک پر برسنے لگتا ہے۔ ہر شخص شرابور ہو جاتا ہے اور پھر یہ طوفان جس تیزی کے ساتھ آتا ہے اسی تیزی کے ساتھ گزر جاتا ہے۔ ناگہانی گھن گرج، بارش اور پھر خاموشی۔

آسمان پر پھر سورج چمکنے لگتا ہے اور عرشۂجہاز، مستول، رسے بلیاں، بادبان، اور ملاحوں کی قمیصیں جلدی سے سوکھنے لگتی ہیں۔ صاف شفاف اور پرسکون نیلے آسمان کی نظریں ایک بار پھر سمندر کی غیرمتلاطم اور مامتا بھری گود میں مچلنے لگتی ہیں۔ جہاز اپنے تمام کھلے ہوئے بادبانوں کے دوش پر رواں دواں بڑھتا رہتا ہے اور پہلے کی طرح اسے موزوں اور موافق باد مراد اڑائے لئے جاتی ہے۔

اس وقت بھی جہاز پر مکمل سکون اور خاموشی طاری تھی۔ جہازران آرام کر رہے تھے۔ جہاز کا دستور تھا کہ جب تک کوئی ناگہانی ضرورت نہ آن پڑے ملاحوں کے آرام میں خلل نہ ڈالا جائے۔

لوچکن جہاز کے اگلے مستول کے سائے میں بیٹھا تھا۔ وہ اس وقت دیگر جہازرانوں کی طرح نیند کے مزے نہیں لوٹ رہا تھا۔ اسے اس وقت جاگتا دیکھ کر پہرےداروں کو سخت تعجب ہوا کیونکہ لوچکن سونے میں اپنے جواب آپ تھا۔

وہ آہستہ آہستہ کچھ گنگنا رہا تھا اور کینویس کا جوتا بنانے میں مصروف تھا۔ وقتاً فوقتاً وہ ماکسیمکا کی طرف دیکھ کر (جو عرشۂجہاز پر اس کے قریب ہی ٹانگ پسارے گہری نیند سو رہا تھا اور اس کے کالے کالے پیر اس کی نئی سفید پتلون کے باہر نکلے ہوئے تھے) اندازہ لگانے کی کوشش کرتا کہ اس نے دو پہر کے کھانے کے بعد ماکسیمکا کے پیروں کا جو ناپ لیا تھا وہ صحیح ہے یا نہیں۔

تھوڑی دیر بعد جب اس کو اطمینان ہو گیا کہ ناپ ٹھیک ہے تو اس نے ان چھوٹے چھوٹے کالے پیروں کی طرف باربار دیکھنا ترک کر دیا اور اپنے کام میں لگ گیا۔

اس کہنہ مشق شرابی کے دل میں یہ سوچ کر خوشی اور مسرت کی لہر دوڑ گئی کہ وہ ایک غریب بےگھر یتیم کے لئے نیا جوتا اور اس کی ضرورت کی ساری چیزیں تیار

کر رہا ہے۔ وہ غیرشعوری طور پر اپنے بیتے دنوں کے متعلق سوچنے لگا۔ اس کی نظروں میں شراب نوشی کے لئے غیرقانونی طور پر جہاز کی چیزیں چوری سے بیچنے اور اس کے بعد بطور سزا کوڑے کھانے کے تمام مناظر گھوم گئے۔

یہ خیال آتے ہی اس نے سوچا اور صحیح سوچا کہ اگر وہ ایک بہادر اور نڈر ٹاپ‌مین نہ ہوتا، جس کے بہادرانہ کاموں نے ہر اس کپتان کو اور چیف افسر کو متاثر کیا تھا جس کے تحت اس نے کام کیا تھا، تو کب کا سزایافتہ گروہ میں شامل کر دیا جاتا۔

’’ہاں یہی وجہ ہے کہ مجھے بخش دیا گیا،، اس نے اونچی آواز میں کہا اور یہ کہتے ہوئے نہ جانے کیوں اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ’’یہی تو فکر کی بات ہے!،،

اس ’’فکر،، کی آخر کیا وجہ تھی۔ یہ فکر اس حقیقت کے احساس کے تحت تھی کہ وہ اس جہاز پر سب سے زیادہ بدنام شرابی تھا جس کے بارے میں سب کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ ساحل پر اترنے کے بعد قریب ترین شراب خانے تک جاتا ہے (کرونشتاد کی بات الگ ہے)۔ یا اس حقیقت کے احساس کے تحت کہ اس کے بہترین ٹاپ‌مین ہونے کی صلاحیت ہی نے اسے سزا یافتہ گروہ کی اذیت جھیلنے سے بچایا لیا تھا؟.. بہرحال یہ بات واضح اور صاف نہ تھی۔ ہاں ایک چیز البتہ ضرور عیاں تھی اور وہ یہ کہ زندگی کے کسی فکر بھرے خیال نے اس کے گننے میں چند منٹ کا خلل ڈال دیا اور لوچکن کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔ آخرکار اس نے اپنے آپ سے کہا:

’’ماکسیمکا کو جہازیوں کی وردی کی ایک قمیص کی ضرورت بھی ہوگی۔ وردی کی قمیص کے بغیر بھلا ملاح کیا جچےگا!،،

لوچکن نے آرام کے گھنٹے سے فائدہ اٹھاکر ماکسیمکا کے لئے جوتے کا تلا اور کینویس کا اوپری حصہ کاٹ لیا۔ جوتے کے تلے بالکل نئے چمڑے کے تھے جسے لوچکن نے اپنے ایک جہازران ساتھی سے ادھار لیا تھا۔ اس کا ساتھی بڑا کفایت شعار ملاح تھا جس کے پاس اس کے اپنے خریدے ہوئے جوتے تھے۔

لوچکن جانتا تھا کہ اس کے لئے پیسہ بچانا (خصوصاً جب وہ کسی بندرگاہ پر اترتا) کتنا مشکل ہے۔ اس لئے اس نے یہ انتظام کیا کہ اس کا قرض جہاز کا صدر ملاح ادا کرےگا اور یہ رقم وہ لوچکن کی تنخواہ سے کاٹ لےگا۔

جیسے ہی سیٹی بجی اور صدر ملاح واسیلی ایگورووچ کی (جسے ملاح ایگورچ کے نام سے پکارتے تھے) گرجدار آواز بلند ہوئی لوچکن نے لڑکے کو سوتے سے جگا دیا۔ اس نے سوچا کہ اگرچہ لڑکا جہاز پر ایک مسافر کی حیثیت رکھتا ہے لیکن عرشۂجہاز پر اسے بھی اور جہاز رانوں کی طرح رہنا چاہئے ورنہ ایگورچ برا مانےگا۔ وہ جانتا تھا کہ ایگورچ ’’نیک آدمی،، ہے اور اس وقت تک مکا نہیں دکھاتا ’’جب تک واقعی ایسا کرنا ضروری نہ ہو جاتا،، مگر پھر بھی اگر اسے جلال آ گیا تو وہ قاعدے کی خلاف‌ورزی کرنے پر

لڑکے کے ایک آدھہ گھونسہ جما بیٹھےگا۔ اس لئے بہتر یہی ہےکہ حبشی کو شروع ھی سے جہاز کے طور طریقے سے آگاہ کر دیا جائے۔

''اٹھنے کا وقت ھو گیا ماکسیمکا،، اس نے لڑکے کا کندھا ھلاتے ھوئے پیار سے کہا۔

ماکسیمکا نے آنکھیں کھولیں، انگڑائی لی اور جب دیکھا کہ تمام ملاح اٹھ چکے ھیں تو خود بھی جلدی سے کود کر کھڑا ھوگیا اور گھبرائی ھوئی نظروں سے لوچکن کو دیکھنے لگا۔ اس وقت اس کی آنکھوں سے ایسی وفاداری اور جاں‌نثاری ٹپک رھی تھی جیسے کوئی کتا اپنے مالک کی طرف دیکھ رھا ھے۔

''ڈرو نہیں ماکسیمکا! تم کتنے بھولے ھو۔ ذرا سی بات پر ڈر جاتے ھو! یہ دیکھو تمھارے لئے جوتے تیار کر رھا ھوں۔،،

یہ کہتے ھوئے اس نے لڑکے کے پیروں اور جوتے کے کینویس کے اوپری حصے کی طرف اشارہ کیا۔ کینویس کے جوتے اس کے ھاتھ میں تھے۔ لڑکے کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا کہ لوچکن کیا کہہ رھا ھے مگر اسے اس بات کا شاید اندازہ ھو گیا کہ وہ ضرور کوئی اچھی بات کہہ رھا ھے۔ وہ منہ پھاڑکر ھنس دیا۔ اس کے بعد وہ بڑے اعتماد کے ساتھ لوچکن کے پیچھے پیچھے نیچے جہازرانوں کے کمروں میں چلا گیا۔ وھاں پہنچ کر لوچکن نے نامکمل جوتے اور کپڑے سنبھال کر اپنے ملاحوں‌والے بکس میں رکھے۔ لڑکا متجسس نگاھوں سے اس کی طرف دیکھتا رھا۔ لوچکن نے اپنی ٹوپی اتاری۔ پہلے ٹوپی کی طرف اشارہ کیا، پھر ماکسیمکا کے سر کی طرف اشارہ کیا اور بڑی مشکل سے اس کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگا کہ اس کے لئے بھی ایسی ھی ایک ٹوپی تیار کی جائیگی جس کی چاند سفید ھوگی اور دیوار پر کور ھوگی۔ لڑکے کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رھا ھے مگر اس کے باوجود وہ برابر اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتا رھا۔

کچھ نہ سمجھنے کے باوجود لڑکے کے ننھے سے معصوم دل نے اچھی طرح محسوس کرلیا کہ یہ گورے آدمی جو ''بیٹسی،، جہازوالے گوروں سے بالکل مختلف زبان بولتے تھے اس کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آ رھے ھیں۔ خاص طور پر لال بھبوکا ناک (جسے دیکھ کر اسے لال مرچ یاد آجاتی تھی) اور بھورے بالوں‌والا یہ ملاح۔ اسی ملاح نے تو اس کے لئے اتنا اچھا لباس تیار کیا ھے، اس کو اچھی اچھی چیزیں کھانے کے لئے دیتا ھے، اس کے ساتھ اتنی محبت اور التفات سے پیش آتا ھے۔ اسے بچپن کے بعد سے آج تک ایسی محبت میسر نہ ھوئی تھی۔ اس کی یاد کے افق پر ایک سیاہ فام عورت کی پیار بھری نظروں کا دھندلا سا خاکہ ابھرا جو اس کی طرف ایسی ھی پیار بھری نظروں سے دیکھا کرتی تھی۔

وہ لطف و محبت بھری نظریں اسے آج تک یاد تھیں۔ ان یادوں کے ساتھ ساتھ اس کی

نظروں کے سامنے تاڑ کے اونچے اونچے درخت اور کیلے کے پتوں کی چھت والی جھونپڑیوں کی دھندلی تصویریں بھی گھوم جاتیں۔ یہ سب اس نے جیسے خواب میں دیکھا تھا یا خود اس کے بچپن کے واقعات تھے۔ وہ ان یادوں کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ مگر بعض اوقات یہ آنکھیں اسے خواب میں نظر آتیں اور اسے بڑا سکون محسوس ہوتا۔ اور اب وہی پیار اور شفقت بھری نظریں خواب میں نہیں بلکہ حقیقت میں اس کی نظروں کے سامنے تھیں۔

اس جہاز پر اس کی زندگی اس طرح بسر ہو رہی تھی جیسی وہ سندر سپنوں میں دیکھا کرتا تھا — یہ زندگی ان دنوں سے کتنی مختلف تھی جب وہ مستقل مصیبت اور ڈر میں مبتلا رہتا تھا۔

لوچکن نے اسے ٹوپی کے متعلق سمجھانا ترک کردیا۔ اس نے بکس میں ہاتھ ڈال کر شکر کا ایک ڈلا نکالا اور ماکسیمکا کو دیا۔ اس کی یہ عنایت دیکھ کر لڑکا جذبے سے بےقابو ہو گیا۔ اس نے ملاح کے سخت اور کھردرے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں دبوچ لیا اور بڑی محبت اور انکسار سے تھپ تھپانے لگا اور ساتھ ہی ساتھ بڑی تشکر آمیز نظروں سے اس کی طرف تکنے لگا۔ ان نظروں میں سہمے اور دبے ہوئے انسان کی تڑپ تھی، جس کا دل کسی کی لطف و عنایت نے اچانک گرما دیا ہو۔ اس کے چہرے اور آنکھوں کے احسانمندانہ تاثرات کا اظہار اس کی کپکپاتی ہوئی دبی دبی آواز سے بھی ہو رہا تھا۔ اس نے شکر کا ڈلا منہہ میں ڈالنے سے پہلے شدت جذبات کے تحت اپنی دیسی زبان میں شکریہ کے ایک دو الفاظ آہستہ سے کہے جو ایسا معلوم دیتا تھا کہ حلق سے ادا کئے گئے تھے۔

”محبت کا بھوکا ہے ننھا! پیار کے دو بول بھی کبھی نہیں سنے تھے تم نے میرے بچے!،، لوچکن نے اپنی اکھڑ آواز کو زیادہ سے زیادہ نرم بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا اور ماکسیمکا کے گال تھپ تھپائے۔ ”کھاؤ کھاؤ شکر کھاؤ۔ کیوں مزیدار ہے نا!،، اس نے لڑکے سے کہا۔

اور اس طرح جہاز کے سب سے نچلے عرشے کے ایک تاریک گوشے میں ایک تجربہ کار عمر رسیدہ ملاح اور ایک بے سہارا حبشی لڑکے کے درمیان مہر دوستی ثبت ہو گئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دونوں ایک دوسرے سے بہت خوش اور مطمئن ہیں۔

”تمھیں روسی زبان سکھانی پڑےگی ماکسیمکا ورنہ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آئیگا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اچھا اب آؤ عرشۂجہاز پر چلیں۔ گولہ‌اندازی کی مشق کا وقت ہوگیا۔ تم وہاں چل سکتے ہو اور ہمیں گولہ‌اندازی کی مشق کرتے ہوئے دیکھ سکتے ہو۔،،

وہ دونوں عرشۂ جہاز پر چلے گئے اور جلد ہی طبل کی آواز نے گولہ اندازی کی مشق شروع کرنے کا سگنل دیا۔ ماکسیمکا ایک مستول سے چمٹ کر کھڑا ہو گیا تاکہ

ان ملاحوں کے قدموں سے ٹھوکر کھا کر گر نہ پڑے جو اپنے اپنے مقررہ مقامات کی طرف بھاگ رہے تھے۔ شروع شروع میں تو اسے بہت ڈر لگا اور وہ وہاں سہما ہوا کھڑا رہا مگر اس کا ڈر جلد ہی دور ہو گیا اور وہ بڑی دلچسپی سے سامنے دیکھنے لگا جہاں جہازی توپوں کو ڈھکیلتے ہوئے لاتے، ان کی نال میں جلدی جلدی جھاڑن گھسیڑتے اور پھر انھیں جہاز کے اگلے بائیں پہلو سے پیچھے ہٹا کر توپوں کے ساتھ تن کر سیدھے کھڑے ہو جاتے۔ اس نے سوچا کہ جہازی اب توپ داغینگے مگر اسے یہ سوچ کر تعجب ہو رہا تھا کہ آخر وہ کس چیز کو نشانہ بنائینگے کیونکہ سمندر میں کہیں بھی کسی اور جہاز کا بادبان دکھائی نہ دے رہا تھا۔ ایک بار اسے توپوں کے حملے کی زد میں آنے کا تجربہ بھی ہو چکا تھا۔ اس وقت توپ کا ایک گولہ تو ''بیٹسی،، جہاز کے دنبالے کے بالکل قریب ہی آ گرا تھا۔ واقعہ یہ ہوا تھا۔ ''بیٹسی،، جہاز اپنے سارے بادبان کھولے ہوئے تین مستول‌والے ایک جہاز سے بچنے کےلئے بڑی تیزی کے ساتھ اڑا جا رہا تھا۔ یہ جہاز بردہ‌فروش جہاز کا پیچھا کر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس وقت ''بیٹسی،، جہاز کے جہازرانوں کی آنکھوں سے دہشت ٹپک رہی تھی اور ''بیٹسی،، جہاز کا کپتان گھبراہٹ کے عالم میں ہر ایک کو ڈانٹ پھٹکار رہا تھا اور کوس کوس کر احکام جاری کر رہا تھا۔ اور پھر پیچھا کرنےوالا جہاز کافی پیچھے چھوٹ گیا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ یہ جہاز جو ان پر گولے برسا رہا تھا انگریزوں کا ایک جنگی جہاز تھا جو خاص طور سے بردہ فروشوں کو گرفتار کرنے کےلئے بھیجا گیا تھا۔ اس لئے حملہ‌آور جہاز کی زد سے بچ نکلنے پر دوسروں نے جب خوشیاں منانی شروع کیں تو وہ خود بھی جی کھول کر ان کے ساتھ شریک ہو گیا۔ اسے اس بات کا احساس نہ تھا کہ ظالم کپتان بردہ فروشی کے جرم میں پھانسی کے تختے پر لٹکائے جانے سے بچ نکلا تھا۔ *

ماکسیمکا توپوں کے دغنے کا انتظار کر رہا تھا مگر کوئی بھی توپ داغی نہ گئی۔ وہ نہایت جوش کے عالم میں کھڑا ہوا طبل کی آواز سن رہا تھا اور لوچکن کو دیکھ رہا تھا جو ایک توپ کے بغل میں کھڑا اس کی کمان کر رہا تھا اور نشانہ لگانے کے لئے بار بار توپ پر جھک رہا تھا۔

---

* گزشتہ زمانے میں، خاص طور سے اس وقت جب بردہ فروشی کا زور تھا، اس بدی کو ختم کرنے کےلئے یورپ کی تقریباً ساری ریاستوں کے درمیان ایک کنونشن ہوا جس کی رو سے فرانس اور انگلینڈ نے افریقہ اور امریکہ کے ساحلوں پر بردہ فروشوں کو پکڑنے کے لئے جنگی جہاز تعینات کردئے۔ جو لوگ پکڑے جاتے تھے ان کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ کپتان اور اس کے میٹ کو پھانسی دی جاتی تھی اور جہازیوں کو قیدبامشقت کی سزا دی جاتی تھی۔ غلاموں کو آزاد کر دیا جاتا تھا۔ (مصنف کا نوٹ)۔

توپ کی مشق دیکھنے میں ماکسیمکا کو بہت لطف آیا۔ مگر مشق کے ختم ہونے کے بعد لوچکن نے جب اسے چائے دی تو وہ اور بھی خوش ہوگیا۔ شروع میں جب اس نے دیکھا کہ ملاح پسینے میں شرابور گرم پانی کے پیالے پی رہے ہیں اور شکر کے ڈلے کتر کتر کھا رہے تھے تو اسے سخت تعجب ہوا۔ مگر پھر جب لوچکن نے اسے بھی ایک پیالہ اور شکر کی ڈلی دی تو اس نے اسے پسند کیا اور بڑے مزے لےلے کر پورے دو پیالے پی گیا۔

اس دن شام کو جیسے ہی سہ پہر کی تمازت کم ہوئی اور ''دماغ بہتر طریقے پر کام کرنے لگے،، لوچکن نے اس کو روسی زبان کا پہلا سبق دیا لیکن ظاہر ہے اس میں اسے زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ لوچکن بڑی محنت اور مشکل سے اپنے شاگرد کو صرف اتنا سکھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کا نام ماکسیمکا ہے اور اس کے استاد کا نام لوچکن۔ یہ منظر تمام ملاحوں کےلئے اچھی خاصی تفریح کا سامان بن گیا۔

لوچکن حالانکہ کبھی بھی پیشہ‌ور معلم نہ رہا تھا مگر وہ جس صبر اور نرمی سے لڑکے کو نام سکھانے اور روسی کی سدھ بدھ کرانے کی کوشش کر رہا تھا، اسے دیکھ کر ماہر سے ماہر استاد کو بھی رشک آجاتا جسے کبھی اتنی دشواریوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

اس نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کے انوکھے طریقے ایجاد کئے اور ان پر عمل شروع کیا۔

پہلے اس نے لڑکے کے سینے میں انگلی سے ٹھوکا دیا اور کہا ''ماکسیمکا،، اور پھر اپنی طرف اشارہ کرکے کہا ''لوچکن،،۔ جب اس طریقے کو متعدد بار استعمال کرنے کے بعد بھی لڑکے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو لوچکن اس سے ذرا پرے ہٹ گیا اور وہاں سے پکارا ''ماکسیمکا،،۔ ماکسیمکا بتیسی نکال کر ہنس دیا مگر پھر بھی اس کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ اس کے بعد لوچکن کے دماغ میں دوسری ترکیب آئی۔ اس نے ایک دوسرے ملاح سے کہا کہ وہ ماکسیمکا کا نام لے کر پکارے۔ اس ملاح نے نام پکارا تو لوچکن نے لڑکے کی طرف اس طرح اشارہ کیا جیسے اب کے اسے کامیابی کا پورا یقین ہو۔ اس نے اپنی کوشش کو زیادہ بارآور کرنے کی غرض سے لڑکے کی قمیص کا کالر پکڑ کر آہستہ سے ہلایا۔ مگر اس بار بھی کامیابی نہ ہوئی۔ لڑکا خوشی سے ہنس دیا اور ہلائے جانے سے یہ سمجھا کہ اسے ناچنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ وہ فوراً کود کر آگے بڑھا اور ایک خوبصورت ناچ ناچنے لگا جسے دیکھ کر سارے ملاح بیحد خوش ہوئے۔ یہ دیکھ کر لوچکن کو بڑی مسرت ہوئی۔

جب ناچ ختم ہوا تو ماکسیمکا کو محسوس ہوا کہ ملاحوں کو یہ ناچ بہت پسند آیا اس لئے کہ بہت‌سوں نے اس کی پیٹھ اور کندھوں پر شاباشی دی اور اس کا سر سہلاتے

ہوئے زور زور سے ہنس کر کہنے لگے:

''شاباش ماکسیمکا! بہت عمدہ!''

نہ جانے لوچکن لڑکے کو اپنا نام سکھانے میں کامیاب ہوتا یا نہیں۔ وہ سبق دوبارہ شروع کرنےوالا تھا کہ چھوٹا افسر وہاں آگیا جو انگریزی جانتا تھا۔ اس نے لڑکے کو انگریزی میں بتایا کہ اس کا نام ''بوائے'' نہیں بلکہ ''ماکسیمکا'' ہے اور اس کے دوست کا نام لوچکن ہے۔ اس طرح معاملہ سدھر گیا۔

''اب وہ جان گیا ہے کہ تم نے اسے کیا نام دیا'' افسر نے لوچکن سے کہا۔

''بہت بہت شکریہ جناب'' لوچکن نے خوش ہوکر کہا۔ ''میں نے سارے طریقے آزما ڈالے۔ لڑکا ذھین ہے مگر اس کے باوجود میں اسے اپنا مطلب نہ سمجھا سکا۔''

''وہ اب خوب سمجھ گیا ہے۔ اس سے پوچھ کر دیکھو۔''

''ماکسیمکا!''

چھوٹے لڑکے نے اپنی طرف اشارہ کیا۔

''یہ تو بہت اچھا ہوا جناب! اچھا، لوچکن کون ہے؟'' لوچکن نے لڑکے سے پوچھا۔

ماکسیمکا نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

وہ دونوں زور سے ہنس پڑے اور دوسرے ملاح بھی ان کی ہنسی میں شریک ہو گئے۔ ملاحوں نے لوچکن سے کہا:

''تمہارا ننھا حبشی تو چل پڑا!''

اس کے بعد سبق آسانی سے چلنے لگا۔ لوچکن مختلف چیزوں کی طرف اشارہ کرتا اور پھر ان کا نام لیتا۔ وہ چیزوں کا نام لیتے وقت الفاظ کو زیادہ سے زیادہ توڑمروڑ دیتا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح ''سہل'' انداز میں بولنے سے الفاظ بدیسی زبانوں سے زیادہ قریب ہو جاتے ہیں، آسانی سے سمجھ میں آ جاتے ہیں اور یاد رہتے ہیں۔ رات کے کھانے کا بگل بجنے تک ماکسیمکا اس کی مدد سے کافی الفاظ دوھرانے لگا۔

''شاباش لوچکن! تم تو بہت اچھی طرح پڑھا رہے ہو! اگر اسی رفتار سے لڑکا سیکھتا رہا تو ہمارے 'راس اسید' پہنچنے تک کافی روسی سیکھ جائےگا'' دوسرے ملاحوں نے کہا۔

''شرط لگا لو وہ ضرور سیکھ جائےگا! ہمیں 'راس اسید' پہنچنے میں ابھی بیس دن لگینگے اور ماکسیمکا ہوشیار لڑکا ہے!''

''ماکسیمکا'' کے لفظ پر لڑکے نے لوچکن کی طرف دیکھا۔

''اب اپنا نام خوب پہچانتا ہے! اچھا آؤ یار چلو رات کا کھانا کھانے چلیں۔''

رات کے کھانے کے بعد جب دعا ختم ہو گئی اور سونے کےلئے بستر تقسیم کر دئے گئے تو لوچکن نے لڑکے کا بستر ڈیک پر اپنے برابر بچھا دیا۔ ماکسیمکا خوش خوش بڑے آرام سے ملاحوں کے گدے پر لیٹ گیا۔ اس کے سر کے نیچے ایک تکیہ تھا اور اوڑھنے

کے لئے ایک بڑا سا کمبل ۔ یہ ساری چیزیں لوچکن نے اس کے لئے سامان کے نگراں افسر سے حاصل کی تھیں ۔

''اب سو جاؤ ماکسیمکا!،، ہمیں صبح سویرے اٹھنا ہے!،،

ماکسیمکا تو خود ہی اونگھ رہا تھا ۔ اونگھتے میں اس نے اپنا نام ''ماکسیمکا،، اور اپنے دوست کا نام اپنے لہجے میں ''لوچیکی،، دوھرایا (پہلے سبق کے اعتبار سے اس نے ان الفاظ کا تلفظ اتنا برا نہیں کیا) ۔

لوچکن نے سوتے ہوئے بچے کے جسم پر صلیب کا نشان بنایا اور جلد ہی خود بھی زور زور سے خراٹے لینے لگا ۔

لوچکن بارہ بجے پہرے پر جانے کے لئے جاگ کھڑا ہوا اور لیونتیف کے ساتھ اوپر چڑھ گیا ۔ لیونتیف سب سے آگے کے مستول کے سرے پر پہرہ دیتاتھا ۔

ان دونوں نے پہلے تو اس بات کا اطمینان کیا کہ سب ٹھیک ٹھاک ہے اور اس کے بعد آلتی پالتی مارکر بیٹھ گئے اور جاگتے رہنے کی خاطر ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے ۔ کرونشتاد کے قصوں اور پچھلے کپتانوں کا ذکر ہونے لگا جن کے تحت وہ کام کر چکے تھے ۔ بیچ بیچ میں تھوڑی دیر کےلئے وہ خاموش ہوجاتے ۔

''میں نے کہا لیونتیف،، لوچکن نے یکایک کہا ''کیا تم نے واقعی کبھی وادکا نہیں پی؟،،

سنجیدہ، متین اور مہذب لیونتیف لوچکن کی جہازرانی کی صلاحیتوں کا بڑا مداح تھا لیکن ساتھ ھی اس کی مےنوشی کی عادت کو بری نظر سے دیکھتا تھا ۔ اس نے زور دے کر کہا :

''کبھی نہیں!،،

''تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ تم نے اسے کبھی ھاتھ بھی نہیں لگایا؟،،

''کبھی کبھی تہوار کو میں نے ایک آدھہ جام پی لیا ہے ۔ بس اس سے زیادہ کبھی نہیں ۔،،

''اچھا تو یہی وجہ ہے کہ تم وادکا کے راتب کی جگہ پیسے لےلیتے ہو؟،،

''پیسہ زیادہ کارآمد شے ہے دوست ۔ ھم نوکری سے خلاصی پانے کے بعد جب روس واپس جائینگے تو یہی رقم تو ھمارے کام آئیگی ۔،،

''بالکل ٹھیک کہتے ہو ۔،،

''لیکن تم وادکا کا ذکر اس وقت کیوں کر رہے ہو لوچکن؟،،

''اس لئے کہ میرا خیال ہے کہ تم خوش قسمت انسان ہو ۔،،

لوچکن تھوڑی دیر کےلئے خاموش ہو گیا اور پھر اس نے کہا :

''کیا یہ سچ ہے کہ جادو کے ذریعے شراب نوشی کی لت کا علاج ہو جاتا ہے؟،،

''ہاں میں نے بھی سنا ہے ۔ 'کوبچک، جہاز پر ھمارے ایک چھوٹے افسر نے ایک

آدمی کا اس طرح علاج کر دیا تھا۔ وہ کچھ جادو منتر جانتا تھا۔ اور 'زابیاکا' پر بھی ایک آدمی ہے جو یہ علاج کر سکتا ہے۔،،

''کون؟،،

''زخارچ بڑھئی۔ مگر یہ اس کا اپنا راز ہے۔ وہ ہر شخص کے لئے یہ نہیں کرےگا۔ مگر کیا تم مجھ سے یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم شراب نوشی ترک کرنےوالے ہو؟،، لیونتیف نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

''نہ جانے میں اسے ترک کر سکونگا یا نہیں... مگر میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ شراب کی خاطر کم سے کم اپنے کپڑے بیچنا تو چھوڑ دوں!،،

''تو اعتدال کے ساتھ پینے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟،،

''کوشش تو بہت کی مگر اس میں کامیاب نہ ہو سکا یار۔ پینا شروع کرتا ہوں تو رکنا ناممکن ہو جاتا ہے! مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میری قسمت ہی بری ہے!،،

''اس میں قسمت کا کوئی قصور نہیں۔ تمھیں خود عقل نہیں ہے۔ بس اس کی یہی ایک وجہ ہے،، لیونتیف نے سختی سے کہا۔ ''آدمی کو چاہئے کہ اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔ تم زخارچ سے اس بارے میں بات کیوں نہیں کرتے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس معاملہ میں تمھاری کچھ مدد کرے... مجھے تو اس بات میں شبہہ ہے کہ اس علاج کا بھی تم پر کوئی اثر ہو سکےگا یا نہیں،، لیونتیف نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

''مجھے بھی یہی خدشہ ہے۔ میرا علاج کوئی نہیں کر سکتا!،، لوچکن نے کہا اور کچھ سوچ کر اس طرح مسکرایا جیسے اسے اس احساس پر فخر ہو کہ وہ لاعلاج ہے۔

۸

تین ہفتے گذر گئے۔ ''زابیاکا،، کیپٹاون پہنچ چکا تھا مگر ابھی بندرگاہ میں داخل نہ ہو سکا تھا۔ سخت باد مخالف چل رہی تھی۔ بعض وقت اس ہوا میں طوفان کی سی تیزی آجاتی اور اسی وجہ سے جہاز لنگر نہ ڈال سکا۔ ہوا اور سمندر کی لہروں کا اتار چڑھاؤ اس قدر تیز تھا کہ جہاز کو بھاپ سے چلانے کی کوشش کرنا بھی بیکار تھا۔ اس سے کوئلہ ضائع ہونے کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوتا۔

''زابیاکا،، موسم کی تبدیلی کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے اونچے بادبان لپٹے ہوئے تھے اور وہ لہروں کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ زور زور سے ھچکولے کھا رہا تھا۔

اس طرح سات دن گزر گئے۔

آخرکار ہوا کا زور کم ہوا اور جہاز اپنی سفید چمنی سے دھواں اڑاتا ہوا کیپٹاون کی بندرگاہ میں داخل ہوا۔

یہ کہنا بے سود ہے کہ ملاح اس وقت کس قدر خوش تھے۔

پھر بھی اس جہاز کا ایک جہازران ایسا تھا جسے نہ صرف یہ کہ کیپٹاون آنے کی کوئی خوشی نہ تھی بلکہ جیسے جیسے جہاز کنارے سے قریب ہوتا جاتا اس کی اداسی اور افسردگی اور بڑھتی جاتی تھی۔

یہ جہاز ران لوچکن تھا جسے جلد ہی ماکسیمکا سے جدا ہونا تھا۔

اپنے جہازران ساتھیوں کی امید کے خلاف اس ماہ کے دوران میں لوچکن نے ماکسیمکا کی اتنی توجہ اور خیال سے دیکھ بھال کی تھی کہ بری طرح اس سے وابستہ ہو گیا تھا اور چھوٹا حبشی بھی اس سے بیحد مانوس ہوگیا تھا۔ وہ دونوں اب ایک دوسرے کی باتیں بہت اچھی طرح سمجھنے لگے تھے کیونکہ لوچکن ایک اچھا استاد ثابت ہوا تھا اور ماکسیمکا نے اچھے اور ذہین شاگرد ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ ماکسیمکا اب اتنی ٹوٹی پھوٹی روسی بول لیتا تھا کہ اس کا مطلب سمجھ میں آ جاتا تھا۔ جوں جوں وہ ایک دوسرے کو بہتر سمجھتے گئے ایک دوسرے کے بہتر دوست بنتے گئے۔ ماکسیمکا کے پاس اب دو جوڑ کپڑے، ایک جوڑ جوتا، ایک ٹوپی اور ایک پیٹی تھی جس پر ملاحوں والا چاقو لگا ہوا تھا۔ وہ ایک ذہین اور زندہ دل لڑکا ثابت ہوا اور بہت جلد تمام جہازرانوں کا منظور نظر بن گیا۔ حتی کہ صدر ملاح ایگورچ بھی، جو ''بیکار مسافروں،، کو برداشت نہ کر سکتا تھا، اس لڑکے پر بہت مہربان ہوگیا کیونکہ ماکسیمکا رسی کھینچنے میں ہمیشہ دوسروں کا ھاتھ بٹانے پر تیار ہو جاتا اور جہاز پر اپنی بساط بھر ہر کام اس طرح انجام دیتا کہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنے کام سے اپنے ''سفر کا معاوضہ ادا کر دیا تھا،،۔ وہ بڑی پھرتی سے بندر کی طرح اوپر مستولوں پر چڑھ جاتا اور طوفان کے دوران ذرا سا بھی نہ ڈرتا۔ وہ مجموعی طور پر صحیح معنوں میں ملاح لڑکا تھا۔

وہ بہت نرم دل اور بھلی طبیعت کا حامل تھا اور اکثر جہاز کے اگلے حصے کے عرشے پر ناچ کر یا میٹھی اور سریلی آواز میں اپنی زبان کے گیت گا کر ملاحوں کو خوش کرتا۔ ہر شخص اس کا خیال رکھتا تھا۔ ارتیوشکا، جو چھوٹے افسر کا نوکر تھا، اس کےلئے افسروں کے وارڈ روم سے میز پر کے بچے کھچے کیک اور کھانے کی دوسری چیزیں اٹھا لاتا تھا۔

حبشی لڑکا لوچکن کا بیحد گرویدہ ہو گیا تھا اور کتے کے پلے کی طرح ہمیشہ اس کے پیچھے پیچھے لگا رہتا تھا۔ وہ اس کے پہرے کی ڈیوٹی کے وقت اوپر چڑھ جاتا اور جہاز کے ماتھے پر پہرے کے مقام پر اس کے ساتھ بیٹھ جاتا۔ لوچکن نے جو اسے روسی الفاظ سکھائے تھے وہ ان لفظوں کو بھی بڑی محنت سے بولنے کی کوشش کرتا تھا۔

کیپ‌ٹاون کی ڈھلوان چٹانیں قریب ہوتی جا رہی تھیں۔ ”زابیاکا“ پوری رفتار سے آگے بڑھتا جا رہا تھا اور اندازہ تھا کہ دو پہر تک بندرگاہ میں لنگر انداز ہو جائیگا۔

دن بہت خوشگوار تھا۔ ہر طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ مگر اس کے باوجود لوچکن بالکل خوش نظر نہ آ رہا تھا۔ وہ اپنے کمان کی توپ کی بڑی تیزی سے پالش کر رہا تھا۔ ماکسیمکا اس کے قریب ہی کھڑا تھا اور گاھے گاھے اس کی مدد کرتا جاتا تھا۔

”ہمیں جلد ہی ایک دوسرے کو خدا حافظ کہنا پڑےگا میرے اچھے لڑکے ماکسیمکا۔“

”خدا حافظ کیوں؟“ ماکسیمکا متعجب ہوا۔

”راس امید“ پہنچنے کے بعد تمھیں ساحل پر اتار دیا جائیگا۔ اس کے سوا ہم تمھارے ساتھ کر بھی کیا سکتے ہیں؟“

لڑکے کو کچھ نہیں معلوم تھا کہ اس کے ساتھ کیا کیا جانےوالا ھے۔ لوچکن نے جو کچھ کہا وہ بھی اچھی طرح اس کی سمجھ میں نہ آیا مگر اس نے لوچکن کے غمگین تاثرات سے اندازہ لگا لیا کہ اس نے ضرور کوئی رنج اور افسوس کی بات کہی ھے۔ یہ باتیں سن کر اس کے شگفتہ اور حساس چہرے پر جو بہت جلد اس کے اندرونی خیالات اور احساسات سے متاثر ہو جاتا، یکایک مردنی چھا گئی۔ اس نے کہا:

”نہیں سمجھا میں لوچیکا!“

”میرے دوست تمھیں ساحل پر اتار دیا جائےگا۔ میرا سفر جاری رہےگا مگر ماکسیمکا یہاں رک جائیگا۔“

اور اس نے اشاروں سے اپنا مطلب سمجھانے کی کوشش کی۔

لڑکا اب اس کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے لوچکن کا ھاتھ پکڑ لیا اور گڑگڑا گڑگڑا کر ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کہنے لگا:

”مجھے بھیجو مت کنارا... رہنے دو یہاں... ماکسیمکا لوچیکا، لوچیکا ماکسیمکا... میں روسی ملاح... ھاں ھاں...“

یہ سن کر یکایک لوچکن کے دل میں ایک خیال آیا۔

”ماکسیمکا کیا تم روسی ملاح بننا چاھتے ہو؟“

”ھاں، ھاں“ ماکسیمکا نے پھر اپنا سر زور زور سے ھلاتے ہوئے کہا۔

”یہ تو بہت اچھا ھے (مجھے اس کا پہلے ہی کیوں نہ خیال آیا۔ مجھے دوسروں سے اس کا ذکر کرنا چاہئے اور پھر ہم صدر ملاح سے کہینگے کہ وہ بڑے افسر سے اس کے متعلق کہے۔“

کچھ ہی لمحوں بعد وہ جہاز کے اگلے حصے کے عرشہ پر دوسرے ملاحوں سے اس کے متعلق بات چیت کرنے لگا:

”سنو دوستو! ماکسیمکا ہم سے جدا ہونا نہیں چاھتا! ہمیں اس بات کی اجازت لینی

چاھئے کہ اسے اسی جہاز پر رھنے کی اجازت دے دی جائے اور اس سے ملاح کا کام لیا جائے۔ کیا رائے ھے تم لوگوں کی؟''

تمام ملاحوں نے اس کی تجویز کی پرزور حمایت کی۔

اس کے بعد لوچکن صدر ملاح کے پاس گیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ سارے ملاحوں کی التجا کو بڑے افسر تک پہنچا دے۔

''ایگورچ مہربانی کرکے ھمارا یہ کام کر دو'' اس نے کہا۔ ''بڑے افسر تک ھماری التجا پہنچا دو اور ان سے کہو کہ ماکسیمکا خود ٹھیرنا چاھتا ھے اور سب باتیں کہہ دو۔ اگر ھم اس کو 'راس امید' پر اکیلا چھوڑ دینگے تو وہ بچارا کیا کرےگا؟ کہاں جائیگا؟ نہ جانے اس بچارے کو کن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے۔ یہ ھمارے لئے بڑی شرم کی بات ھوگی ایگورچ۔ لڑکا بڑا معصوم، بھلا اور دیانت‌دار ھے۔ کیوں ھے نا؟''

''ھاں ٹھیک کہتے ھو۔ اچھا تو میں رپورٹ کر دونگا۔ ماکسیمکا واقعی بڑا سلیقے کا اور معصوم لڑکا ھے۔ مگر مجھے اس بات کا یقین نہیں کہ کپتان ایک حبشی کو روسی جنگی جہاز پر رکھنے کے لئے آمادہ ھوگا یا نہیں۔ یہی تو ایک دقت طلب مسئلہ ھے۔''

''کوئی دقت نہ ھوگی ایگورچ۔ ھم اسے عیسائی بنا لینگے۔''

''اس سے تمھارا کیا مطلب ھے!''

''ھم اسے اپنے مذھب کے مطابق حلقۂعیسائیت میں شامل کر لینگے اور پھر وہ روسی حبشی بن جائیگا!''

ایگورچ کو یہ تجویز پسند آئی اور اس نے ملاحوں کی درخواست کو فوراً چیف افسر کے پاس پہنچانے کا وعدہ کر لیا۔

چیف افسر نے صدر ملاح کی درخواست کو غور سے سنا اور کہا:

''میرا خیال ھے کہ اس تجویز میں لوچکن کا ھاتھ ھے۔''

''لوچکن اکیلا اس تجویز کا حامی نہیں جناب بلکہ سارے جہازران یہ درخواست کر رھے ھیں۔ ھم اگر اس لڑکے کو یہیں اتار دینگے تو نہ جانے اس کا کیا حشر ھو؟ ھر شخص اس چیز کو بری طرح محسوس کر رھا ھے۔ کچھ نہیں تو ھم اسے کیبین بوائے ھی بنا سکتے ھیں جناب! یہ چھوٹا لڑکا بہت اچھا کام کرتا ھے اور پھر اگر ھم اسے حلقۂعیسائیت میں شامل کرلیں‌گے تو اس کی روحانی نجات بھی ھو جائیگی۔''

چیف افسر نے اس کے بارے میں کپتان سے گفتگو کرنے کا وعدہ کر لیا۔

جھنڈا لہرانے کے وقت کپتان عرشۂ جہاز پر آیا تو چیف افسر نے اس سے ملاحوں کی درخواست کا تذکرہ کیا۔ پہلے پہل تو کپتان اس درخواست کو قطعی طور پر نامنظور کر دینا چاھتا تھا مگر اس پر غور کرنے کے بعد (اور شاید اس وقت اسے خود اپنے بچوں کا خیال آ گیا) اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور کہا:

''بہت اچھا۔ لڑکا ٹھہر سکتا ھے۔ ھم اسے فی‌الوقت کیبین بوائے بنا دینگے اور پھر جب کرونشتاد واپس لوٹینگے تو وھاں اس کا کوئی دوسرا انتظام کر دینگے۔ واقعی — اسے ساحل پر کیوں اتاریں خصوصاً جب کہ وہ خود جہاز پر رھنا چاھتا ھے! لوچکن کو جازات ھے کہ وہ اس کا سرپرست اور استاد بنا رھے۔ کتنے تعجب کی بات ھے کہ لوچکن اتنا شرابی کبابی ھونے کے باوجود اس لڑکے سے اتنی محبت کرتا ھے۔ ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ اس نے لڑکے کےلئے خود سارے کپڑے تیار کئے۔''

جہاز کے اگلے حصے کے عرشے پر یہ خبر پہنچی کہ ماکسیمکا کو جہاز پر رھنے کی اجازت مل گئی ھے تو ھر طرف خوشیاں منائی جانے لگیں۔ اس بات کی سب سے زیادہ خوشی یقیناً خود لوچکن اور ماکسیمکا کو تھی۔

ایک بجے جہاز کیپ‌ٹاون کی بندرگاہ میں لنگر انداز ھوا۔ دوسرے دن صبح کو جہاز کے اولین پہرےداروں کو ساحل پر جانے کی چھٹی ملی۔ ان میں ماکسیمکا اور لوچکن بھی تھے۔

''کہیں ماکسیمکا کو شراب کی خاطر بیچ نہ کھانا'' ایگورچ نے جہاز سے اترتے ھوئے ھنس کر کہا۔

یہ بات لوچکن کے دل کو جا لگی اور اس نے تڑپ کر جواب دیا:

''تم کیا جانو۔ ھو سکتا ھے کہ ماکسیمکا کی وجہ سے میں رات کو کافی سنجیدہ اور ھوش میں لوٹوں!''

لیکن حسب معمول وہ اس رات بھی پیتے پیتے مدھوش ھوگیا۔ اس کے باوجود سب لوگوں کو یہ دیکھ کر سخت تعجب ھوا کہ وہ عمر میں پہلی مرتبہ اپنے جسم کے کپڑوں سمیت جہاز پر واپس لوٹا۔ بعد میں معلوم ھوا کہ وہ اس سلسلے میں ماکسیمکا کا ممنون احسان ھے۔ ماکسیمکا نے جب دیکھا کہ اس کا دوست شراب نگلتا ھی جا رھا ھے تو وہ دوڑکر قریب کے شراب خانے پہنچا اور وھاں سے دوسرے روسی ملاحوں کو بلا لایا جنھوں نے لوچکن کو اٹھا لیا اور اسے کشتی پر بٹھا کر جہاز پر واپس لے آئے۔ ماکسیمکا راستہ بھر لوچکن کے ساتھ ساتھ رھا۔

لوچکن راستہ بھر نشے میں بڑبڑاتا رھا:

''ماکسیمکا کہاں ھے؟ ماکسیمکا کو بلاؤ۔ میں نے اسے شراب کی خاطر نہیں بیچ دیا۔ وہ میرا سب سے بڑا یار ھے۔ ماکسیمکا کہاں ھے؟''

اور جب اس نے ماکسیمکا کو اپنے پہلو میں دیکھ لیا تو چپ ھو گیا اور پھر سو گیا۔

ایک ھفتہ بعد ''زابیاکا'' ''راس اسید'' سے روانہ ھوا۔ اس کے بعد جلد ھی ماکسیمکا کو حلقۂ عیسایت میں شامل کر لیا گیا اور اس کا عیسائی نام ماکسیمکا اور خاندانی نام ''زابیاکن'' (جہاز کے نام پر) رکھ دیا گیا۔

تین سال بعد وہ ''زاییاکا،، پر کرونشتاد پہنچا تو چودہ سال کا نوجوان تھا اور چھوٹے افسر پیتیا کی کوششوں اور محنت کی وجہ سے وہ اب لکھ پڑھ بھی سکتا تھا۔

کپتان نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اسے کرونشتاد ٹریننگ اسکول میں جہازی بیماروں کے خدمت‌گار کی تربیت حاصل کرنے کے لئے داخل کرا دیا۔ لوچکن بھی بحری فوج کی ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد کرونشتاد میں ہی بس گیا تاکہ اپنے چہیتے لڑکے سے قریب رہ سکے۔ وہ دل‌وجان سے ماکسیمکا کی بہتری اور بھلائی کی کوشش کرنے لگا۔ ماکسیمکا ہی کی وجہ سے اب اس نے شراب پینے کی خاطر کپڑے بیچنا ترک کر دیا اور ''اعتدال،، کی حد تک پینا سیکھ لیا تھا۔

وسیولود گارشین

سگنل

وسیولود میخائلووچ گارشین کی پیدائش ۱۸۸۵ء میں ہوئی تھی، ۳۳ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔ اپنی مختصر زندگی میں وہ بہت ہی کم لکھ پائے۔ بس کوئی ایک درجن افسانے اور قصے ان سے یادگار ہیں اور تقریباً سبھی بڑی عمر والوں کےلئے ہیں۔ لیکن گارشین کو بچوں کےلئے کتابوں کی اور تعلیم و تربیت کے سوالوں کی ہمیشہ فکر رہی۔ انھوں نے پیٹرس‌برگ کے تعلیمی کارکنوں کے حلقے سے رابطہ قائم کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ بچوں کے پڑھنے کے لئے کتابوں کا انتخاب کرنے میں والدین اور بچوں کے استادوں کی مدد کی جائے۔ اس حلقے کے ممبر کی حیثیت سے گارشین نے ''بچوں کے ادب کا جائزہ،، نامی المناخ کی ادارت کی جو ۱۸۸۵ء اور ۱۸۸٦ء میں شائع ہوا۔ اسی کے ساتھ ہی انھوں نے بچوں کےلئے کئی بیرونی ادیبوں کے قصوں کا ترجمہ کیا۔ گرشین کے اپنے طبعزاد قصوں ''پام کے درخت کا فخر،،، ''مینڈک اور گلاب کا قصہ،، اور خاص طور سے ''سفر کی شوقین مینڈکی،، سے سوویت بچے واقف ہیں اور انھیں بہت پسند کرتے ہیں۔ موخرالذکر میں مصنف نے کچھوے اور مرغابیوں کی پرانی ہندوستانی حکایت سے استفادہ کیا ہے۔

افسانہ ''سگنل،، ۱۸۸۷ء میں بڑی عمر کے لوگوں کے ایک رسالے میں شائع ہوا تھا لیکن جلد ہی اسے بچوں کی کتاب کی حیثیت سے مقبولیت حاصل ہو گئی۔ افسانہ بڑی سادگی اور دلکشی سے لکھا گیا ہے اور اس میں اس قنوطیت پرستانہ خیال کی تردید کی گئی ہے کہ مبینہ طور پر دنیا میں بدی چھائی ہوئی ہے۔ یہ افسانہ سچائی اور نیکی کو اور محنت کش انسان کی قابل‌قدر اخلاقی خوبی کو مسلم کرتا ہے۔

سیمیون ایوانوف ریلوے لائن کا نگراں تھا۔ ایک ریلوے اسٹیشن اس کے کیبن سے بارہ ورست کے فاصلے پر تھا اور دوسرا تقریباً دس ورست پر تھا۔ پچھلے سال چار ایک ورست کے فاصلے پر ایک شاندار کتائی مل قائم کی گئی تھی۔ اور اب اس کی اونچی چمنی جنگل کی اوٹ سے اپنا سیاہ چہرہ لئے جھانکتی نظر آتی تھی۔ کیبن کے چاروں طرف دور دور تک قرب و جوار کے دوسرے نگرانوں کے کیبنوں کے علاوہ اور کوئی گھر نہیں تھا۔

سیمیون ایوانوف ایک ٹوٹا ہوا کمزور اور بیمار انسان تھا۔ نو سال پہلے تک جنگ کے شعلوں سے گزرتا رہا تھا۔ لڑائی کے دوران میں ایک افسر کے خدمتگار کی حیثیت سے محاذ پر گزارے تھے۔ بھوک سہی تھی، کڑکڑاتی سردی اور گرمی کی تپش سے گزرا تھا، شدید سردی میں، انتہائی گرمی کی تپتی ہوئی دھوپ میں پچیس پچیس، تیس تیس میل پیدل مارچ کیا تھا۔ گولے بارود سے بھی دوچار ہوچکا تھا مگر شکر ہے خدا کا کبھی کسی گولی کا نشانہ نہیں بنا۔ ایک مرتبہ اس کی رجمنٹ کا اور دشمن کا مقابلہ ہوا۔ ہفتے بھر تک ترکوں سے جھڑپیں ہوا کیں۔ ہمارے سپاہی گھاٹی کے ایک طرف اور ترک دوسری طرف۔ صبح سے شام تک مسلسل گولیاں سنسناتی رہتی تھیں۔ سیمیون کا افسر بھی رجمنٹ کے ساتھ تھا۔ خود سیمیون دن میں تین تین دفعہ رجمنٹ کے باورچی‌خانے سے افسر کےلئے کھانا اور کھولتا ہوا سماوار لےکر گھاٹی سے چڑھا کرتا تھا۔ وہ سماوار سنبھالے میدان سے گزرتا تو کانوں کے قریب گولیاں سنسناتی ہوئی گزرتیں۔ اور چٹانوں سے ٹکراکر بکھر جاتیں۔ سیمیون کا دل دھڑک دھڑک اٹھتا۔ کبھی کبھی تو خوف سے آنکھیں بھر جاتیں، مگر وہ ہمت باندھے آگے ہی بڑھتا رہتا۔ افسر لوگ اس سے بہت خوش تھے کہ اس کی وجہ سے ہر وقت گرما گرم چائے ملتی رہتی تھی۔ یوں تو وہ محاذ سے زندہ سلامت لوٹ آیا تھا، مگر ٹانگوں اور بازوؤں میں مستقل درد بیٹھ گیا تھا۔ اس کے برے دن آگئے تھے۔ گھر لوٹا تو معلوم ہوا کہ بوڑھا باپ بھی چل بسا ہے اور چار سالہ بیٹا بھی۔ بچہ گلے کی کسی بیماری کا شکار ہوگیا تھا۔ اس بھری دنیا میں ایک بیوی کے سوا اب سیمیون کا اور کوئی اپنا نہ تھا۔ کھیتی کیاری ہو نہیں سکتی تھی۔ گٹھیا زدہ ہاتھ پاؤں میں اتنا دم کہاں تھا کہ یہ جوکھوں کا کام کرسکے۔ گاؤں میں جیون بتانا ناممکن ہوگیا تو میاں

بیوی نے جنم بھومی کو خیرباد کہا اور روزگار کی تلاش میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ انھوں نے سرحدی علاقے میں بھی قسمت آزمائی، خیرسون اور دون کے علاقے کے چکر بھی کاٹے مگر کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ آخر ہارکر بیوی نے کسی کے گھر میں ملازمت کرلی اور سیمیون تلاش معاش میں آگے بڑھ گیا۔ ایک دفعہ قسمت سے ریل کے انجن میں بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔ ایک اسٹیشن پر ریل رکی تو سیمیون کو اسٹیشن ماسٹر کا چہرہ کچھ جانا پہچانا سا لگا۔ سیمیون نے غور سے اسٹیشن ماسٹر کو دیکھا اور اسٹیشن ماسٹر نے سیمیون کو، اور تب دونوں ایک دوسرے کو پہچان گئے۔ یہ اسٹیشن ماسٹر اس کی رجمنٹ میں افسر رہ چکے تھے۔

''ایوانوف ہو نا تم؟،، افسر نے پوچھا۔

''جی ہاں سر!،،

''یہاں کیا کر رہے ہو، ایوانوف؟،،

سیمیون نے جھٹ اپنی داستان غم اسے سنا ڈالی۔

''تو اب جا کہاں رہے ہو؟،،

''پتہ نہیں، سر!،،

''بےوقوف! کیا مطلب ہے تمھارا — 'پتہ نہیں، سر!'؟،،

''میرا مطلب ہے، سر کہ میرا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں ہے۔ نوکری کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں!،،

اسٹیشن ماسٹر نے غور سے اسے دیکھا، کچھ سوچا اور بولا:

''دیکھو بھائی، تم کچھ دن یہیں اسٹیشن پر رہو۔ شادی تو ہوچکی ہے نا تمھاری؟ بیوی کہاں ہے؟،،

''جی سر، شادی شدہ ہوں۔ بیوی کرسک میں ایک بیوپاری کے ہاں کام کر رہی ہے۔،،

''تو ٹھیک ہے اسے خط لکھ کر یہیں بلا لو۔ میں فری ٹکٹ دلوا دوں گا۔ چند دن میں ریل کی پٹری کے نگراں کا کام نکلنے والا ہے۔ میں ڈویژن چیف سے تمھارے لئے بات کرلوں گا۔،،

''بہت بہت شکریہ جناب!،،

اور اس طرح سیمیون اسی اسٹیشن پر ٹک گیا۔ وہ اسٹیشن ماسٹر کے باورچی خانے کے کام میں ھاتھ بٹاتا، چولہے کےلئے لکڑی کاٹتا اور پلیٹ‌فارم اور احاطے کی صفائی کرتا۔ پندرہ ایک دن کے اندر اندر بیوی بھی وھیں پہنچ گئی۔ تب وہ دونوں ایک دستی ٹرالی کار میں بیٹھ کر اپنے کیبن پہنچ گئے۔ کیبن حال ھی میں بنا تھا۔ اور خوب گرم اور آرام‌دہ تھا۔ جلانے کی لکڑی کی بھی کوئی کمی نہ تھی۔ کیبن کے پچھلے مکینوں کا لگایا ہوا سبزی ترکاری کا چھوٹا سا باغیچہ بھی تھا۔ اور ریلوے لائن کے دونوں طرف ھاتھ ھاتھ بھر قابل کاشت زمین بھی موجود تھی۔ سیمیون کا جی خوش ہوگیا۔ فوراً دماغ نے کام

کرنا شروع کردیا : تھوڑی بہت کھیتی کروں گا، جلد ہی گائے بھی آجائےگی اور گھوڑا بھی!

اسٹیشن کی طرف سے اسے وردی دی گئی ۔ اس کے علاوہ ایک ہری اور لال جھنڈی، لال‌ٹین اور بھونپو، اور ریلوے لائن کے نٹ بولٹ کسنے کےلئے ہتوڑی رینچ اور کروبار بھی دئے گئے ۔ اس کے اوزاروں، ہتیاروں میں ان چیزوں کے علاوہ ایک کھرپا، ایک جھاڑو، چند نٹ بولٹ اور کچھ سیخیں بھی شامل تھیں ۔ اس کے علاوہ اسے ایک ٹائم ٹیبل اور قاعدے قوانین کی دو کتابیں بھی مہیا کردی گئیں ۔ شروع شروع میں تو سیمیون نے رات رات بھر جاگ کر ٹائم‌ٹیبل زبانی یاد کرلیا ۔ ریل کے آنے سے دو گھنٹے پہلے ہی وہ اپنے علاقے کی پٹری کا معائنہ کرتا ۔ اور پھر کیبن کے باہر بنچ پر بیٹھ‌کر غور سے اندھیرے میں دور دور تک دیکھنے اور کان لگاکر سننے کی کوشش کرتا کہ کہیں ریل کے گھڑگھڑانے کا شور یا دور سے آتی ہوئی کوئی مدھم آواز تو نہیں آرہی ۔ جلد ہی قاعدے قانون بھی اسے زبانی یاد ہوگئے ۔ حالانکہ وہ ٹھیک سے پڑھ بھی نہیں سکتا تھا لیکن تھوڑا تھوڑا کرکے اس نے سب رٹ لیا ۔

گرمیوں کا موسم تھا ۔ کام بھی کچھ ایسا دشوار نہ تھا ۔ ان دنوں تو برف صاف کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی تھی ۔ یوں بھی اس لائن پر گاڑیاں بہت دیر دیر پر آتی تھیں ۔ سیمیون دن میں دو دو بار اپنے علاقے کی پٹریاں چیک کرتا ۔ کہیں نٹ کس رہا ہے، کہیں کسی پیچ کو صحیح طرح بٹھا رہا ہے ۔ کہیں پٹری کی تہہ برابر کر رہا ہے تو کہیں پانی کے نلکوں کا جائزہ لےرہا ہے ۔ ان سب کاموں سے نبٹ کر وہ گھر کا کام کاج دیکھنے گھر لوٹ آتا ۔ مشکل یہ تھی کہ وہاں چھوٹے سے چھوٹا کام کرنے کےلئے بھی اسے انسپکٹر سے اجازت لینا پڑتی تھی ۔ کسی بھی کام کی اجازت دینے سے پہلے انسپکٹر معاملے کو ڈویژن چیف کے سامنے پیش کرتا ۔ اور اس طرح چھوٹے سے چھوٹے کام کےلئے مدتوں انتظار کرنا پڑتا تھا ۔ سیمیون اور اس کی بیوی اس صورت‌حال سے پریشان ہوچلے تھے ۔

اس صورت سے دو مہینے بیت گئے ۔ سیمیون نے اڑوس پڑوس کی پٹریوں کے نگراں کارکنوں سے بھی راہ و رسم پیدا کرلی ۔ ان میں سے ایک بہت بوڑھا تھا اور حکام جب دیکھو تب اسے کام سے الگ کرنے پر آمادہ رہتے تھے ۔ وہ تو بچارا اب کیبن سے باہر مشکل سے نکلتا تھا ۔ دیکھ بھال کا اس کا کام بیوی ادا کرتی تھی ۔ دوسرا نگراں جس کا کیبن مقابلتاً نزدیک تھا، جوان آدمی تھا ۔ دبلا پتلا مگر جاندار ۔ سیمیون اس سے پہلی بار ریلوے لائن ہی پر ملا تھا ۔ دونوں اپنے اپنے علاقے کی دیکھ‌بھال کرتے کرتے ایک نقطے پر پہنچ گئے تھے ۔ سیمیون نے ٹوپی اتارتے ہوئے سر کی ہلکی سی جنبش سے اسے سلام کیا اور کہا :

''سلام، پڑوسی!،،

پڑوسی نے ترچھی نظر سے اسے دیکھا ۔

''سلام!،، اس نے کہا اور تیزی سے پیٹھ موڑلی ۔

کچھ دن بعد دونوں کی بیویوں کی بھی مڈبھیڑ ہوگئی ۔ سیمیون کی بیوی آرینا نے

پڑوسن سے دعا سلام کیا تو اس نے بھی کسی گرمجوشی کا اظہار نہ کیا۔ ہوں ہاں کرکے جلدی سے وہاں سے چلی گئی۔ سیمیون کی بھی اس سے ایک ملاقات سر راہ ہوچکی تھی۔

''تمھارا شوہر بہت کم گو معلوم ہوتا ہے، بی بی۔ ہیں نا؟''

پہلے تو نوجوان عورت نے کوئی جواب ہی نہ دیا، پھر بولی:

''اور وہ بات کیا کرے! خدا بھلا کرے تمھارا، سب کی اپنی اپنی مشکلیں پریشانیاں ہی بہت ہیں!''

بہرحال مہینے سوا ایک میں ان کی اچھی خاصی دوستی ہوگئی۔ سیمیون اور واسیلی کی ملاقات اکثر ریلوے لائن پر ہوجاتی۔ دونوں پٹری کے برابروالے پشتے پر بیٹھکر پائپ پیتے اور زندگی کے اتار چڑھاؤ پر باتیں کرنے لگتے۔ واسیلی کی زندگی میں تو سنانے کو تھا ہی کیا، مگر سیمیون اسے اپنے گاؤں دیہات کے بارے میں بتاتا اور محاذ پر گزارے ہوئے دنوں کا ذکر کرتا رہتا۔

''بڑے پاپڑ بیلے ہیں میں نے!'' اس نے کہا۔ ''خدا جانتا ہے زیادہ عمر نہیں ہے میری، مگر بس بڑے کٹھن دن گزارے ہیں، خیر جیسی اس کی مرضی۔ اس کے آگے تو سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔ تو واسیلی، یہ بات ہے، بھائی میرے!''

واسیلی نے پائپ کی راکھ جھاڑی اور اٹھتے ہوئے بولا:

''نہ یہ ہماری بدبختی ہے، نہ خدا کی مرضی کہ آج ہماری یہ حالت ہے۔ یہ تو سب انسان کا کیا دھرا ہے۔ میں تو کہتا ہوں انسان سے بڑھکر ظالم اور خونخوار جانور تو اس دھرتی پر پیدا ہی نہیں ہوا۔ اجی بھیڑیا بھی بھیڑیے کو نہیں کھاتا۔ مگر آدمی کا بس چلے تو دوسرے آدمی کو کچا نگل‌جائے۔''

''اب یہ تو نہ کہو بھائی۔ بھیڑیا تو بھیڑیے کو کھاتا ہے۔''

''ارے یہ تو ایک مثال ہے۔ مگر سچ یہ ہے کہ آدمی ہے بڑا خونخوار درندہ۔ اگر وہ اتنا لالچی، اتنا بےدرد نہ ہوتا تو زندگی اتنی کٹھن ہرگز نہ ہوتی۔ جسے دیکھو تم کو ٹھوکر مارنے پر اتارو ہے۔ بس چلے تو بوٹیاں کاٹ لیں، کچا چباجائیں!''

سیمیون سوچ میں پڑگیا۔

''کہہ نہیں سکتا، بھائی'' اس نے کہا۔ ''شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں۔ لیکن اگر ایسا ہے تو اوپروالے کی مرضی!''

''اگر تمھارے سوچنے کا ڈھنگ یہی ہے'' واسیلی نے ٹوکا ''تو تم سے بات کرنا بیکار ہے۔ اگر تم ہر برائی، ہر بدکاری کو خدا کی مرضی سمجھکر، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا چاہتے ہو، سر جھکاکر ہر بلا کو سہنا چاہتے ہو تو پھر میں تو یہی کہوں‌گا کہ تم آدمی نہیں جانور ہو۔''

یہ کہتے کہتے وہ مڑا اور صاحب سلامت کئے بغیر ہی روانہ ہوگیا۔ سیمیون بھی

اٹھ کھڑا ہوا۔

''ارے پڑوسی،، اس نے آواز دی۔ ''خفا کیوں ہوتے ہو!،،

مگر واسیلی نے تو پلٹ کر دیکھا نہیں۔ سیمیون اس وقت تک برابر کھڑا اسے تکتا رہا جب تک وہ نکڑ کے قریب نشیب تک پہنچ کر نظروں سے اوجھل نہیں ہوگیا۔ تب سیمیون بھی گھر لوٹ آیا۔ گھر پر اس نے بیوی سے کہا:

''سنتی ہو آرینا، یہ جو ہمارا پڑوسی ہے نہ، یہ آدمی نہیں، زہر ہے زہر!،،

بہرحال انھوں نے آپس میں لڑائی نہیں باندھی بلکہ پھر ملے، پھر دنیا زمانے کے مسائل پر باتیں کیں۔

''ارے بھائی، یہ سب انسان کا کیا دھرا ہے۔ ورنہ تم اور میں آج یوں ان کیبنوں میں گھٹ کر زندگی نہ بتاتے!،، واسیلی نے کہا۔

''تو ان کیبنوں میں ایسی کیا برائی ہے؟ رہا تو جا سکتا ہے!،،

''رہا تو جا سکتا ہے، رہا تو جا سکتا ہے! تمھارا بھی جواب نہیں۔ برسوں جیئے، مگر کیا خاک جیئے۔ کہاں کہاں گھومے، کیا کچھ نہیں دیکھا، مگر سیکھا، سمجھا خاک نہیں! میں کہتا ہوں ہم غریبوں کی زندگی ہے کیا۔ چاہے یہاں ان کیبنوں کی زندگی ہو، چاہے کہیں اور بیت رہی ہو۔ کیا ہے یہ جیون؟ ارے یہ خونخوار درندے ہمارا سارا خون پی رہے ہیں، نچوڑ ڈالا ہے انھوں نے ہمیں۔ اور جب ہم بوڑھے ہوجائیں گے تو مالک ہمیں یوں نکال پھینکینگے جیسے ہم انسان نہ ہوں سوروں کا چارا ہوں۔ کیوں بھئی کیا تنخواہ ہوگی تمھاری؟،،

''ارے کیا تنخواہ ہے بھیا واسیلی، بس کل بارہ روبل!،،

''مجھے بھی کل ساڑھے تیرہ ملتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کیوں؟ کمپنی کے قانون کے حساب سے تو ہم سب کو پندرہ ماہوار ملنا چاہئے۔ اوپر سے بجلی، پانی اور ایندھن مفت۔ میں پوچھتا ہوں تمھیں بارہ اور مجھے ساڑھے تیرہ روبل مہینہ دینے کا فیصلہ آخر کون کرتا ہے۔ میں کہتا ہوں باقی تین روبل تمھارے اور ڈیڑھ روبل میرے آخر کس کی جیب میں جاتے ہیں؟ ہے تمھارے پاس اس کا جواب؟ اوپر سے تم کہتے ہو کہ کیا برا ہے! اور سوال صرف تمھارے حصے کے تین اور میرے حصے کے ڈیڑھ روبل کا نہیں ہے۔ پورے پندرہ بھی دیں تو کم ہے! پچھلے مہینے ڈائرکٹر اسٹیشن سے گزرا تھا تو میں نے اپنی آنکھوں سے سارا نقشہ دیکھا تھا۔ ہاں میں نے دیکھا تھا اسے۔ یہ اعزاز حاصل ہوچکا ہے مجھے۔ بڑے مخصوص ڈبے میں سفر کررہا تھا۔ پورے ڈبے پر اکیلے کا قبضہ تھا۔ بڑی شان سے پلیٹ‌فارم پر اترا، ذرا کی ذرا کھڑے ہوکر توند پر چمکتی ہوئی سونے کی زنجیر کی نمائش کی، چقندر سے لال موٹے موٹے گال دکھائے اور بس۔ ہمارا خون پی پی کر بھینسا ہورہا ہے۔ آہ، کاش میرے ہاتھ میں طاقت ہوتی۔ نہیں میں زیادہ دن نہیں رہ سکتا یہاں۔ میں چلا جاؤں گا کہیں کہیں بھی۔،،

''مگر میاں جاؤگے کہاں، واسیلی؟ سب جگہ ایک ہی حال ہے۔ یہاں کم سے کم سر پر

چھت تو ہے - گرم اور آرام‌دہ کمرہ ہے - تھوڑی زمین ہے - پھر بیوی بھی کام کرتی ہے -،،

''زمین؟ دیکھا نہیں تم نے اس زمین کا حال - ایک ٹھنڈ بھی نہیں ہے اس پر - پچھلے سال بہار میں بندگوبھی بوئی تھی میں نے تو اچانک انسپکٹر پہنچ گیا - بولا: 'ارے بھئی یہ سب کیا ہے - اطلاع کیوں نہیں دی تم نے؟ نہ اطلاع دی نہ اجازت لی! اکھاڑو انھیں - پھینکو اکھاڑکر ان سب پودوں کو ...،، پیئے ہوئے تھا سالا! اور کوئی وقت ہوتا تو شاید کچھ نہ کہتا، مگر اس وقت تو سر میں سما گئی - بولا: 'تین روبل جرمانہ!'،،

واسیلی نے بات ختم کی، ذرا کی ذرا خاموشی سے پائپ چوستا رہا، پھر بولا:

''کچھ اور کہتا تو کھوپڑی پھوڑ دیتا!،،

''بہت تیز مزاج ہو تم، پڑوسی - میں تو یہی کہوں گا!،،

''مزاج کا کیا سوال ہے اس میں، میں تو سچ بات کہتا ہوں - اپنے دماغ سے سوچتا ہوں اور ڈھکی چھپی کہتا نہیں - وہ کمبخت موٹا بھینسا ہنگامے کو دعوت دے رہا ہے - تو پھر ہوگا ہنگامہ - دیکھ لینا تم میں نے بھی ڈویژن چیف سے رپورٹ نہ کی تو بات نہیں - دیکھ لینا تم!،،

اور اس نے واقعی شکایت کردی -

ڈویژن چیف ایک دفعہ لائن کا معائنہ کرنے آیا تھا - پیٹرسبرگ سے کچھ اہم ہستیاں تین دن بعد اس لائن پر آنےوالی تھیں - معائنہ کرنے - اس لئے ظاہر ہے ان کے آنے سے پہلے سب کچھ بالکل نوک پلک سے درست ہونا ضروری تھا - ریل کی پٹری کی تہہ کی صفائی کرکے اسے ہموار کیا گیا، ایک ایک سلیپر کو ٹھونک بجاکر دیکھا گیا - میخیں اور بھی اندر تک ٹھونکی گئیں، ایک ایک نٹ بولٹ کسا گیا - ہر ایک پوسٹ پر رنگ کیا گیا - اور ہر لیول کراسنگ پر پیلی ریت بچھائی گئی - پڑوس کے کیبن‌والی عورت نے اپنے بوڑھے کو کیبن سے نکال کر جھاڑیاں صاف کرنے کے کام پر لگا دیا - سیمیون بھی ہفتے بھر کام میں جٹا رہا، سب چیزیں ٹھیک ٹھاک کیں، اپنے کوٹ کی مرمت کی، اسے دھویا، صاف کیا اور اینٹ کے چورے سے گھس گھس کر اپنی تانبے کی بیلٹ کو خوب چمکایا - واسیلی بھی مصروف رہا - ڈویژن چیف صاحب ٹرالی پر سوار ہوکر آئے تھے - چار آدمی ہینڈل چلا رہے تھے - جبھی تو ٹرالی کے گیئر گھڑگھڑا رہے تھے - پہیے گنگنا رہے تھے اور ٹرالی تیزی سے لائن پر دوڑتی چلی آرہی تھی - جیسے ہی ٹرالی ہوا سے باتیں کرتی سیمیون کے کیبن تک پہنچی، وہ دوڑا اور جھٹ اٹنشن ہوکر سپاہیانہ شان سے رپورٹ دی - ہر چیز بالکل باقاعدہ اور صحیح تھی -

''بہت دن سے کام کر رہے ہو، یہاں؟،، چیف نے پوچھا -

''دوسری مئی سے، جناب!،،

''اچھا، ٹھیک ہے - شکریہ - اور کیبن نمبر ۱۶۴ پر کس کی ڈیوٹی ہے؟،،

ٹریفک انسپکٹر بھی چیف کے ساتھ ٹرالی پر موجود تھا - اس نے فوراً اطلاع دی:

''واسیلی سپریدوف کی، جناب!،،

''سپریدوف، سپریدوف؟ اوہ، وھی آدمی جس کے بارے میں پچھلے سال تم نے رپورٹ دی تھی؟''

''جی ھاں، سر!''

''ھوں! تو آؤ، ذرا واسیلی سپریدوف کو بھی دیکھ لیں۔ آگے چلو!''

چاروں ڈرائیوروں نے ھینڈل گھمائے اور ٹرالی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

سیمیون ٹرالی کو دوڑتے دیکھ رھا تھا اور سوچ رھا تھا: ''ضرور دال میں کچھ کالا ھے''۔

دو ایک گھنٹے بعد حسب معمول وہ لائن کے معائنے کےلئے نکلا تو دیکھتا کیا ھے کہ جنگل کی طرف سے کوئی ریل کی پٹری پر چلا آرھا ھے۔ غور سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ واسیلی ھے۔اس کے ھاتھ میں چھڑی تھی اور کندھے پر چھوٹی‌سی بقچی۔ گال پر رومال بندھا ھوا تھا۔

''کہاں چلے، پڑوسی؟'' سیمیون نے دور ھی سے آواز لگائی۔

واسیلی قدم بڑھاکر قریب آگیا۔ ارے اس کا تو چہرہ ھی بدل گیا تھا۔ رنگ دھلے کپڑے جیسا، آنکھوں سے وحشت ٹپکتی ھوئی۔ آواز دھنسی ھوئی...

''شہر جا رھا ھوں'' اس نے کہا۔ ''ماسکو... ھیڈ آفس!''

''ھیڈ آفس! ارے تو کیا شکایت کرنے جارھے ھو، بھائی؟ ارے چھوڑو بھول جاؤ!''

''بھول جاؤں؟ ناممکن۔ نہیں بڑے بھائی، نہیں۔ دیکھو اس نے مجھے سارا زخمی کردیا کمبخت نے۔ مرتے دم تک نہیں بھول سکتا۔ میں نہ بھولوں‌گا نہ بخشوں‌گا۔ ان کمبخت خونخوار درندوں کو سبق سکھا کر رھوں‌گا!''

''ارے چھوڑو بھی میرے بھائی'' سیمیون اس کا ھاتھ تھامتے ھوئے کہا۔ ''مان لو میری بات واسیلی۔ تم اپنے لئے اچھا نہیں کروگے۔''

''اچھے کا کیا سوال ھے؟ ارے میں خود جانتا ھوں کہ اپنے لئے اچھا نہیں کر رھا ھوں۔ تم قسمت کی بات کرتے تھے، ٹھیک ھی کرتے تھے۔ میرے لئے اچھا نہ ھوگا۔ مگر آدمی کو اپنے حق کےلئے کھڑا ضرور ھونا چاھئے۔''

''ھاں وہ تو ھے! مگر یہ سب ھوا کیسے؟''

''کیسے؟ اس نے غور سے ایک ایک چیز کا معائنہ کیا۔ ٹرالی سے اترکر کیبن میں بھی جھانکا۔ مگر میں تو پہلےھی جانتا تھا کہ سختی سے پیش آئےگا، اس لئے سب کچھ بالکل نوک پلک سے درست تھا۔ وہ واپس جا ھی رھا تھا کہ میں نے افسر کی شکایت کردی۔ ارے وہ تو ایک دم ھی چلانے لگا۔ 'یہاں سر پر سرکاری معائنے کا سہم سوار ھے اور تم ایک کمبخت پائیں باغ کا دکھڑا لے بیٹھے۔ لو اور سنو، وھاں مشیر خاص تشریف لارھے ھیں اور یہ اپنی بندگوبھیوں کی داستان سنانے چلے ھیں۔'، میں بھی جواب میں کچھ کہہ بیٹھا۔ کیا کروں رھا ھی نہ گیا۔ اور کوئی سخت بات تو کہی نہیں تھی میں نے، مگر وہ اکڑگیا۔ بس ایک دم ھی پھٹ پڑا۔ تڑاخ سے تھپڑ دے مارا۔ ارے لعنت ھے ھمارے

صبر و برداشت پر! مجھے چاہئے تھا کہ میں بھی الٹے ہاتھ کا دیتا۔ مگر خاموش کھڑا رہا۔ جیسے اس نے جو کچھ کیا، بالکل صحیح کیا۔ اور جب وہ چلے گئے، تب مجھے ہوش آیا۔ چہرے سے خون پونچھ کر رومال باندھا اور چل پڑا۔‘‘

’’مگر کیبن کا کام کون دیکھے گا؟‘‘

’’بیوی ہے وہاں۔ دیکھ لے گی۔ لعنت ہے ان کی ریل گاڑیوں پر!‘‘ یہ کہتے کہتے واسیلی اٹھ کھڑا ہوا۔

’’خداحافظ سیمیون۔ خدا جانے میری بات کوئی سنے گا بھی یا نہیں؟‘‘

’’ارے بھائی، پیدل تو نہیں جا رہے ہو نا؟‘‘

’’کوشش کروں گا اسٹیشن پہنچ کر کسی مال گاڑی میں جگہ مل جائے۔ بس پھر تو کل تک ماسکو پہنچ جاؤں گا!‘‘

دونوں پڑوسیوں نے ایک دوسرے کو خداحافظ کہا۔ واسیلی ایک عرصے تک غائب رہا۔ اس کا کام دھام اس کی بیوی دیکھتی رہی۔ بچاری کے دن رات کھلی آنکھوں گزر رہے تھے۔ برے سے برے وسوسے دل میں آتے اور اسے بےچین کرتے رہتے۔ تیسرے دن کمیشن پہنچ گیا۔ ایک انجن، ایک ڈبہ سامان کا اور دو فرسٹ کلاس کے ڈبے۔ مگر واسیلی کا اب بھی کوئی پتہ نہ تھا۔ چوتھے دن سیمیون اس کی بیوی سے ملا۔ رو رو کر غریب کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور آنکھیں لال ہورہی تھیں۔

’’لوٹ کے آیا وہ یا نہیں؟‘‘ سیمیون نے پوچھا۔

پڑوسن نے بےبسی کے ساتھ ہاتھ سے ’نہ‘ کا اشارہ کیا اور خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔

سیمیون بچپن میں بید کی بانسری بنانے میں استاد تھا۔ وہ کسی ڈنڈی میں لوہے کی گرم چھڑ سے نلکی بنالیتا، اس میں سوراخ کرتا، سرے کو منہ سے لگانے کے لئے تراشتا۔ وہ بانسری کو ایسا سریلا بنا دیتا کہ جو راگ چاہو بجا لو۔ وہ خالی وقت میں اب بھی بانسریاں بناتا اور مال گاڑی کے اس گارڈ کے ہاتھ شہر بھیج دیتا جس سے اس کی جان پہچان تھی۔ وہاں فی بانسری دو کوپک مل جاتے تھے۔ کمیشن کی آمد کے تین دن بعد وہ بیوی کو چھ بجے شام والی پسنجر کا انتظار کرنے کے لئے گھر پر چھوڑ کر چاقو لئے جنگل کی طرف چل دیا تاکہ بانسریوں کے لئے کچھ ڈنڈیاں کاٹ لے۔ وہ اپنے علاقے کی سرحد تک پہنچ گیا جہاں ریلوے لائن بڑی تیزی سے موڑ کھا کھاتی تھی، ڈھلان کے ساتھ ساتھ نیچے اترا اور پہاڑی کے دامن کے جنگلوں کی طرف مڑ گیا۔ وہاں سے تقریباً آدھے پونے میل پر بہت اچھی دلدل تھی جس کے کنارے کنارے بید کے جھنڈ کھڑے تھے۔ اس کی بانسریوں کے لئے لاجواب جھنڈ تھے یہ۔ اس نے چھوٹی بڑی کئی ڈنڈیاں کاٹیں اور ان کا گٹھا اٹھا کر جنگل سے ہوتا ہوا گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ سورج ڈوب چلا تھا۔ موت کے سے سناٹے میں کبھی کبھی چڑیوں کی چہکار ابھرتی یا پاؤں تلے دبتی ہوئی سوکھی چھپٹیوں کی چرچراہٹ سنائی دیتی اور بس۔ سیمیون قدم بڑھا کر پٹری کے پاس پہنچنے والا تھا کہ

اچانک اسے ایسا لگا جیسے کوئی لوہے پر لوہے سے چوٹ مار رہا ہو۔ اس کے قدم تیز ہوگئے۔ اس کے علاقے میں تو مرمت کا کوئی کام ہو نہیں رہا تھا، تو پھر اس آواز کا کیا مطلب؟ وہ جنگل کے سرے پر پہنچا تو ریلوے لائن کا پشتہ نظر آنے لگا۔ ٹیلے پر کوئی اکڑوں بیٹھا لائن کو چھو رہا تھا۔ سیمیون دبے پاؤں وہاں تک پہنچا۔ اس نے سوچا ضرور کوئی اچکا نٹ چرانے کے چکر میں ہوگا۔ لیکن جب اچانک وہ شخص کھڑا ہوا تو سیمیون نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں تو کروبار ہے، جسے وہ لائن کے نیچے گھسا کر پٹری اکھاڑنے کی کوشش کررہا ہے۔ سیمیون کی تو آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ چلانا چاہا تو حلق سے آواز ہی نہ نکلی۔ اور تب اچانک اس نے دیکھا کہ وہ تو واسیلی ہے۔ سیمیون دوڑا۔ مگر واسیلی ایک ہاتھ میں رینچ، ایک میں کروبار لئے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا اور گرتا پڑتا تیزی سے ٹیلے کی دوسری طرف اتر گیا۔

''واسیلی! ارے میرے بھیا! ارے میاں لوٹ آؤ، لوٹ آؤ میرے دوست! لاؤ مجھے وہ کروبار، میں ریلیں بٹھا دوں جلدی سے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔ آؤ، لوٹ آؤ! میرے بھائی۔ گناہ کا بوجھ روح پر نہ لو!،،

مگر واسیلی نے تو پلٹ کر بھی نہ دیکھا، سیدھا جنگل میں گھس کر غائب ہوگیا۔

سیمیون پریشان کھڑا، ریل کی اکھڑی ہوئی پٹری کو تک رہا تھا۔ بید کی ڈنڈیوں کا گٹھا ہاتھ سے گرچکا تھا۔ پل دو پل میں آنےوالی گاڑی مال نہیں تھی، پسنجر گاڑی تھی۔ اور اس کے ہاتھ میں تو ریل کو روکنے کےلئے بھی کچھ نہ تھا۔ جھنڈی تک نہیں تھی۔ اور خالی ہاتھوں سے لائن جمانا بھی ممکن نہ تھا۔ اب آدمی کوئی انگلیوں سے تو میخیں ٹھونک نہیں سکتا۔ کیا کرے دوڑ کر کیبن جائے، وہاں سے ضروری اوزار لائے؟ ''یا خدا مدد!،، وہ ہانپا۔

سیمیون سر پر پاؤں رکھ کر کیبن کی طرف بھاگا۔ سانس پھولا ہوا، ٹانگیں لڑکھڑاتی ہوئی قدم قدم پر ٹھوکر کھاتا ہوا بھاگتا رہا۔ جنگل تو پار کر لیا تھا۔ کیبن بس اب کوئی دو سو میٹر پر تھا۔ ٹھیک اسی وقت مل کی سیٹی گونج اٹھی۔ یا خدا! چھ بج رہے تھے۔ ٹرین دو منٹ میں گزرنے والی تھی۔ یا خدا رحم! اے مالک ان معصوم جانوں کو تیری حفاظت میں دیا! سیمیون کو تو آنے والا لمحہ جیسے جوتے کے تلے میں نظر آرہا تھا: انجن کا بایاں پہیہ پٹری کے سرے سے ٹکراتا ہے، تھرتھراکر سلیپر کو اکھاڑتا ہے اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے بکھر جاتے ہیں، ٹھیک اسی جگہ پٹری میں گہرا موڑ اور جھکاؤ ہے۔ اور پشتہ اسی پچاسی فٹ اونچا ہے۔ ریل گاڑی کھڑکھڑاتی ہوئی پشتے سے نیچے گرتی ہے۔ تھرڈ کلاس کے ڈبوں میں لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے ہیں، چھوٹے بچے... اس وقت کس بےفکری سے ٹرین میں بیٹھے ہوں گے۔ انھیں خطرے کا ذرا بھی احساس نہ ہوگا۔ یا خدا کیا کروں میں! مجھے راہ دکھا میرے مالک! اب تو کیبن تک پہنچنے اور لوٹنے کا بھی وقت نہیں ہے، مالک!..

کیبن کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی وہ الٹے پاؤں دوڑا۔ اندھادھند بھاگ رہا تھا، اسے خود بھی پتہ نہ تھا کہ جا کہاں رہا ہے۔ کیا کرنے جارہا ہے۔ اکھڑی ہوئی پٹری کے قریب پہنچا تو کچھ دیر پہلے کاٹی ہوئی بید کی ڈنڈیوں کا گٹھا وہیں پڑا نظر آیا۔ اس نے جھک کر زمین سے ایک ڈنڈی اٹھالی۔ نجانے کیوں — اور دوڑتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اسے دور سے ریل گاڑی کی آواز آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ کہیں دور سیٹی بجی اور ریل کی پٹری میں مسلسل تھرتھراہٹ سی پیدا ہوگئی۔ اس کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ اب اور دوڑنا ناممکن تھا۔ اور وہ اس خطرناک جگہ سے تقریباً دو ڈھائی سو قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ اچانک جیسے اسے روشنی سی نظر آئی۔ اس نے تیزی سے ٹوپی اتار کر اس میں رکھا ہوا سوتی رومال کھینچا، جوتے سے چاقو نکالا اور سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے خدا سے دعا کی۔ یا خدا مدد!

اور ایک ہی وار میں بائیں کہنی کے اوپر بازو کو چاقو سے زخمی کیا تو خون کا فوارہ سا ابل پڑا۔ اس نے تیزی سے رومال کو اپنے خون سے رنگا اور ہاتھ سے برابر کرکے چھڑی پر باندھ دیا۔ اور فضا میں لال جھنڈی لہرانے لگی۔

وہ پٹری کے پاس کھڑا لال جھنڈی ہلا رہا تھا، اب تو ریل گاڑی صاف نظر آنے لگی تھی۔ انجن ڈرائیور اسے دیکھ بھی پائے گا یا نہیں۔ اگر بہت قریب آنے پر دیکھا بھی تو اتنی بھاری گاڑی دو ڈھائی سو گز تک پہنچتے پہنچتے رک سکےگی بھلا!

خون مسلسل بہہ رہا تھا۔ اس نے زخمی بازو کو پہلو سے دبایا تاکہ خون کا بہاؤ کچھ کم ہوجائے مگر بےسود۔ شاید زخم بہت گہرا تھا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے کالے دھبے سے تیر رہے تھے اور پھر سب کچھ سیاہ پڑگیا اور کانوں میں مسلسل سائیں سائیں ہونے لگی۔ اب وہ نہ ٹرین دیکھ سکتا تھا، نہ اس کی گھڑگھڑاہٹ سن رہا تھا۔ ذہن پر بس ایک خیال چھایا ہوا تھا: ”میں گرجاؤں گا، جھنڈی بھی گر جائےگی۔ ریل گاڑی میرے اوپر سے گزرتی ہوئی چلی جائےگی۔ یا خدا میری مدد کر۔“

اور پھر نگاہوں میں ساری دنیا تاریک ہوگئی۔ دماغ سن ہوگیا۔ اور جھنڈی ہاتھ سے چھٹ گئی۔ مگر خون میں لتھڑی ہوئی جھنڈی زمین کو نہ چھو سکی۔ ایک ہاتھ نے بڑھ کر اسے تھاما اور سامنے سے دوڑتی ہوئی ریل گاڑی کے سامنے ہوا میں لہرا دیا۔ ڈرائیور نے جھنڈی کو دیکھا اور کمال پھرتی سے گورنر بند کرکے بریک لگائے۔ ریل گاڑی کھڑکھڑاکر کھڑی ہوگئی۔

ان گنت لوگ اپنے اپنے ڈبوں سے نکل کر اکٹھا ہو رہے تھے۔ پٹری پر ایک شخص خون میں لت پت بےہوش پڑا تھا۔ اور دوسرا خون میں لتھڑی ہوئی جھنڈی اٹھائے قریب کھڑا تھا۔

واسیلی نے مجمع پر نظر ڈالی اور سر جھکاکر بولا:

”مجھے گرفتار کرلو۔ ریل کی پٹری میں نے اکھاڑی تھی!“

لیو تالستائی

قفقاز کا قیدی

عظیم ترین روسی ادیب اور شہرہ آفاق ناولوں ''جنگ اور امن،، اور ''آننا کارینینا،، کے مصنف لیو تالستائی (۱۸۲۸ء تا ۱۹۱۰ء) نے اپنی زندگی اور محنت کے بہت سے سال بچوں کے ادب اور تعلیم کی نذر کئے۔ انھوں نے اپنے ایک خط میں اعتراف کیا ھے کہ ''بچوں سے اور اصول تعلیم سے مجھے عشق ھے...،، تالستائی کا تعلق امرأ کے ایک ممتاز خاندان سے تھا۔ وہ کاؤنٹ اور جاگیردار تھے۔ اپنے تعلقے ''یسنایا پلیانا،، میں انھوں نے کسانوں کے بچوں کے لئے ایک اسکول تعمیر کرایا جس میں وہ خود درس دیتے تھے۔ انھوں نے اصول تعلیم سے متعلق رسالہ ''یسنایا پلیانا،، شائع کیا اور ۱۸۷۲ء میں مشہور ''قاعدہ،، تصنیف کیا جس کے ساتھ چار ''بچوں کے پڑھنے کے لئے کتابیں،، ملحق تھیں۔

ان کتابوں کو لکھنے کی تیاری میں تالستائی نے خاص طور سے قدیم یونانی زبان سیکھی اور عربی میں اور سنسکرت میں اتنی دستگاہ حاصل کی کہ کتابیں پڑھ سکیں۔ تالستائی کی ''بچوں کے پڑھنے کے لئے کتابیں،، میں ہم یہ دیکھتے ھیں کہ مصنف نے شارل پیرو، گریم برادران، ھانس کرسٹیان اینڈرسن کے قصوں، ''الف لیلہ کے قصوں،، اور روسی عوامی قصوں کو مستعار لےکر اپنے الفاظ میں بیان کیا ھے۔ تالستائی کا مقصد یہ تھا کہ روسی بچوں کو دوسری قوموں کے روحانی خزانوں سے آشنا کریں۔ ''بچوں کے پڑھنے کےلئے کتابیں،، کا بڑا حصہ خود انھوں نے لکھا۔ اسی میں ''قفقاز کا قیدی،، بھی ھے جو نیک جذبات کی عام انسانیت کی اور قوموں کے درمیان دشمنی اور لڑائی کی احمقانہ اور غیرانسانی نوعیت کی کہانی ھے۔

تالستائی کی زندگی ھی میں ان کے ''قاعدہ،، کو عوامی اسکولوں کےلئے سرکاری طور پر منظور کر دیا گیا تھا۔ اور سوویت عہد میں ''قفقاز کا قیدی،، اور تالستائی کی متعدد دوسری کہانیوں کو بچوں کے پڑھنے کےلئے لازمی بنا دیا گیا ھے۔ عوامی تعلیم کی مشہور و معروف کارکن اور لینن کی حقیقی بہن ماریا اولیانووا نے ان کہانیوں کے بارے میں لکھا ھے کہ ''یہ کہانیاں ان کی باقی تخلیقات سے کسی طرح کم نہیں ھیں اور انھیں یقیناً ھماری زبان کے خزانے میں شامل ھونا چاھئے۔ یہ کہانیاں سارے سچے تخلیقی ادب کی طرح خوشی کا احساس عطا کرتی ھیں اور ان کی فطری دلکشی کا تقاضہ ھے کہ انھیں پڑھا جائے اور بالکل شروع ھی میں توجہ اور شعور کے ساتھ ان کا مطالعہ کیا جائے۔،،

۱

ژیلین روسی جاگیردار تھا اور فوجی افسر کی حیثیت سے قفقاز میں کام کرتا تھا۔

ایک دفعہ گھر سے اس کے نام خط آیا۔ بوڑھی ماں نے لکھا تھا کہ: ''اب میں بوڑھی ہوئی۔ جی چاہتا ہے مرنے سے پہلے اپنے نور نظر، اپنے بیٹے کو کلیجے سے لگا سکتی۔ بیٹے آکر مجھ سے مل جاؤ۔ بچھڑنے سے پہلے رخصت ہو لو۔ ممکن ہو تو اپنے ہاتھوں مجھے آخری منزل تک پہنچا دو! اس کے بعد خدا رکھے پھر کام پر چلے جانا۔ ارے بیٹے، میں نے تو تیرے لئے بہو بھی ڈھونڈ لی ہے۔ ایسی سمجھدار، ایسی پیاری ہے کہ بس دیکھا کرو۔ اور پھر اچھی صاحب جائیداد لڑکی ہے۔ کون جانے محبت کرو تو تم بھی بیاہ رچاکر یہیں رہ پڑو!،،

ژیلین سوچ میں پڑگیا۔ ''سچ تو ہے ماں اب بوڑھی اور کمزور ہوئیں، کون جانے پھر ملنا نصیب بھی ہو کہ نہیں! چلا ہی جاؤں۔ اور لڑکی قرینے کی ہو تو کیا ہرج ہے، شادی بھی کر ہی ڈالوں!،،

تو وہ اپنے بڑے افسر سے ملا، چھٹی حاصل کی، دوست احباب سے رخصت ہوا، اپنے ماتحت سپاہیوں کو رخصت کی خوشی میں چار بالٹی وادکا پلوائی اور روانگی کےلئے تیار ہو بیٹھا۔

قفقاز میں اس وقت لڑائی جاری تھی۔ کیا دن اور کیا رات سفر ناممکن تھا۔ روسیوں میں سے تو جہاں کوئی قلعے سے نکلتا، یا قلعے کی طرف جاتا نظر آتا تاتار اسے دبوچ لیتے۔ یا تو جان سے مار ڈالتے یا پکڑ کر پہاڑ کی طرف لیجاتے۔ اس صورت حال کے پیش نظر ہفتے میں دو دفعہ گارد کے سپاہی قافلوں کے ساتھ ایک قلعے سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے کی طرف جاتے تھے۔ آگے پیچھے سپاہی، درمیان میں عام شہری۔

گرمی کا موسم تھا۔ صبح سویرے دھندلکے میں قلعے کے قریب قافلہ اکٹھا ہوا، آگے پیچھے نگہبان سپاہی تھے۔ کارروان آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ ژیلین گھوڑے پر سوار تھا۔ اور اس کے سامان سے لدی ہوئی گاڑی قافلے کے ہمراہ چل رہی تھی۔

ان کی منزل تقریباً بیس پچیس ورست دور تھی۔ قافلہ بہت آہستہ بڑھ رہا تھا۔ کبھی سپاہی رک جاتے، کبھی کارواں کی کسی گاڑی کا پہیہ نکل جاتا، کبھی گھوڑے کھڑے

ہوجاتے اور لاکھ کہنے پر بھی ٹس سے مس نہ ہوتے۔ اور جب بھی ایسا کچھ ہوتا، سارے کا سارا قافلہ رک کر انتظار کرنے لگتا۔

سورج نجانے کب کا نصف آسمان پر چڑھ چکا تھا۔ مگر قافلے نے ابھی مشکل سے آدھا راستہ طے کیا تھا۔ اور راہ کا یہ عالم تھا کہ توبہ — گرد، گرمی، نہ پیڑ نہ سایہ نہ جھاڑیاں نہ پودے...

ژیلین گھوڑا بڑھاکر آگے نکل گیا تھا، اور اب رک کر قافلے کے قریب آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ لو بھئی وہاں تو قافلے کی سمت سے بگل بجانے کی آوازیں آنے لگیں۔ قافلہ پھر رک گیا تھا۔ ژیلین نے سوچا کہ ''کیوں نہ سپاہیوں کے بغیر اکیلا ہی نکل جاؤں۔ گھوڑا تو میرا سیکڑوں میں ایک ہے۔ اگر کہیں تاتاروں سے دوچار ہونا بھی پڑا تو گھوڑے کو سرپٹ دوڑا کر نکل جاؤں گا۔ جاؤں کہ نہ جاؤں؟..''

وہ رک کر یہی سوچ رہا تھا کہ اچانک ایک اور گھوڑ سوار افسر کوستیلین اس کے قریب آیا۔ کوستیلین بندوق سے لیس تھا۔ آتے ہی بولا:

''چلو ژیلین ہم تم اکیلے ہی نکل چلیں۔ طاقت جواب دے رہی ہے۔ بھوک سے برا حال ہے۔ اور گرمی کس بلا کی ہے۔ میری تو قمیص کا یہ عالم ہے کہ چاہو تو نچوڑ لو۔'' کوستیلین لحیم شحیم آدمی تھا۔ موٹا جسم، لال، بوٹی سا رنگ۔ سر سے پاؤں تک پسینے کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ ژیلین کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا:

''بندوق بھری ہوئی ہے نا؟''

''بھری ہوئی ہے۔''

''تو چلو چلیں۔ مگر ایک بات ہے — راہ میں کہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے...''

اور وہ دونوں گھوڑے دوڑا کر آگے نکل گئے۔ استیپ میں گھوڑے دوڑتے رہے۔ وہ چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھ بھی رہے تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے۔ دور دور تک ہر چیز صاف نظر آرہی تھی۔ اور پھر استیپ ختم ہو گیا، راستہ دو پہاڑوں کے درمیان ایک گھاٹی میں چل رہا تھا۔ ژیلین نے اپنے ساتھی سے کہا:

''میرے خیال میں اس پہاڑی پر چڑھ کر دوسری طرف نظر ڈال لیں، ورنہ پہاڑ کے اس پار سے اچانک ہی حملہ کر دیں گے کمبخت، اور ہمیں پتہ بھی نہیں چلے گا۔''

اس پر کوستیلین بولا:

''ارے دیکھنا کیا ہے، چلو آگے بڑھے چلو!'' لیکن ژیلین نے اس کی بات نہیں مانی۔

اور اس نے گھوڑے کو بائیں طرف موڑا، اور پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ ژیلین کا گھوڑا شکاری گھوڑا تھا (یہ ابھی بچھیڑا ہی تھا کہ ژیلین نے خود گلے میں جاکر، پورے سو روبل میں خریدا تھا اسے)۔ گھوڑا ہوا سے باتیں کرتا ہوا مالک کو لئے پہاڑی کی چڑھائی پر چڑھتا چلا گیا۔ ژیلین ابھی چڑھائی پر پہنچا ہی تھا کہ تھوڑی دور پر، ٹھیک اس

کے سامنے، تاتار گھوڑسوار کھڑے نظر آئے۔ کوئی تیس ایک آدمی تھے۔ ان پر نظر پڑتے ھی ژیلین نے چاھا کہ گھوڑا موڑ کر واپس پلٹ جائے۔ مگر تاتاروں نے اسے دیکھ لیا، دیکھتے ھی لپکے اس کی طرف۔ گھوڑے سرپٹ دوڑ رھے تھے، اور سوار تیزی سے خول سے بندوقیں کھینچ رھے تھے۔ ژیلین نے بھی گھوڑے کو مہمیز لگائی اور ڈھلان پر سرپٹ دوڑا دیا۔ اس نے آواز بلند کرکے کوستیلین کو پکارا۔

''بندوق تیار رکھو!،، اور پھر دل ھی دل میں گھوڑے سے بولا 'دوڑ چلو دوست۔ پہنچا دو مجھے منزل تک، دیکھو پاؤں رپٹنے نہ پائے! ٹھوکر کھاگئے تو سارے جاؤگے دوست! بس بندوق تک پہنچنے کی دیر ھے۔ پھر تو میں دیکھ لوں‌گا انھیں!،،

مگر ساتھی کے انتظار کا تو سوال ھی کیا، کوستیلین تو تاتاروں پر نظر پڑتے ھی قلعے کی طرف لپک پڑا۔ ھنٹر ھوا میں لہرا رھا تھا۔ کبھی گھوڑے کو دائیں مارتا، کبھی بائیں، گھوڑا تو یوں ھوا سے باتیں کر رھا تھا کہ اس کی گرد کو پانا بھی مشکل تھا۔ گرد کے بادلوں کی اوٹ سے اس کی دم لہراتی نظر آرھی تھی۔

ژیلین دیکھ رھا تھا کہ معاملہ بگڑ رھا ھے۔ بندوق تو ھاتھ سے جاتی رھی، اب ایک تلوار سے بھلا کیا ھو سکتا تھا۔ اس نے گھوڑے کا رخ واپس سپاھیوں کی طرف موڑ دیا۔ سوچا واپس لوٹ چلوں۔ مگر دیکھتا کیا ھے کہ چھ تاتار اس کا راستہ کاٹ دینے کے ارادے سے گھوڑوں پر سوار بڑھے چلے آ رھے ھیں۔ ان کے گھوڑے ھوا سے باتیں کر رھے تھے۔ ژیلین کا گھوڑا بہت شاندار تھا۔ مگر ان کے اسپ تو اور بھی لاجواب تھے۔ اور وہ راستہ کاٹنے کےلئے لپکے چلے آرھے تھے۔ اس نے گھوڑے کی لگام کھینچتے ھوئے سوچا کہ واپس موڑلوں۔ مگر سرپٹ دوڑتا ھوا گھوڑا اچانک بےقابو ھوگیا، سیدھا دشمن کی طرف، جیسے اڑتا چلا گیا۔ اچانک ژیلین نے دیکھا کہ نارنجی داڑھی والا ایک تاتار سبزہ گھوڑے پر سوار تیزی سے اس کی طرف بڑھ رھا ھے۔ وہ دانت نکوسے، بندوق تانے، چیختا چنگھاڑتا چلا آرھا تھا۔

''اف کمبختو!،، ژیلین نے سوچا۔ ''خوب جانتا ھوں تمھیں میں۔ اگر زندہ ھاتھ لگ‌گیا تو ھتھکڑی بیڑی پہناکر گڑھے میں ڈال دوگے، کوڑے ماروگے۔ جیتے جی تو ھاتھ آؤں‌گا نہیں تمھارے!..،،

ژیلین کوئی بہت لمبا چوڑا آدمی نہیں تھا۔ مگر تھا بڑا جیالا۔ تلوار تان، گھوڑا دوڑا، سیدھا نارنجی داڑھی والے تاتار کی طرف لپکا۔ سوچتا جا رھا تھا کہ ''یا تو گھوڑے تلے روند دوں‌گا یا تلوار سے سرقلم کردوں‌گا!،،

مگر ژیلین نے ابھی گھوڑے کو ایڑ بھی نہ لگائی تھی کہ پیچھے سے کسی نے گولی مار دی اور گولی گھوڑے کو لگ گئی۔ گھوڑا زخمی ھوکر پورے قد سے زمین پر آرھا۔ ژیلین کی ٹانگ اس کے بوجھ تلے دب گئی۔

اس نے اٹھنا چاھا۔ مگر دو بدبودار تاتار اس پر چڑھ بیٹھے۔ اور اس کی کلائیاں

پشت کے پیچھے کر کے مروڑنے لگے۔ ژیلین نے ایک جھٹکے سے اپنا پنڈ چھڑایا اور چھاتی پر چڑھے ہوئے تاتاروں کو دھکا دے کر اپنے اوپر سے ہٹایا، مگر باقی تین تاتار گھوڑوں سے کود کود کر اس پر جھپٹے، اور اس کے سر پر بندوقوں کے کندوں سے وار کرنے لگے۔ ژیلین کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا اور قدم ڈگمگا گئے۔ تاتاروں نے اسے دبوچ لیا۔ گھوڑے سے زین کے تسمے کھینچے، اس کے بازو کمر کے پیچھے کر کے مروڑے، اور انھیں مضبوط تاتاری گرہ سے باندھ دیا۔ پھر کھینچتے ہوئے زین تک لے گئے۔ کمبختوں نے اس کے سر سے ٹوپی اتار لی، پاؤں سے جوتے چھین لئے، سب کچھ لوٹ لیا — روپیہ پیسہ، گھڑی، سب کچھ! اور اس کے کپڑے تار تار کر دئے۔ ژیلین نے پلٹ کر اپنے گھوڑے پر نظر ڈالی۔ وہ نیک‌بخت جس کروٹ گرا تھا ابھی تک اسی کروٹ بے قراری سے ٹانگیں پٹخ رہا تھا۔ مگر اسے کسی صورت قرار نہیں تھا۔ اس کے سر میں زخم تھا۔ اور زخم سے کالا کالا خون بہہ رہا تھا — آس پاس کی گرد خون سے تر ہوئی تھی۔

ایک تاتار بڑھ کر گھوڑے کی زین کھینچنے لگا۔ گھوڑا ابھی تک اسی طرح بے قراری سے ٹانگیں پٹخ رہا تھا۔ اس بےرحم نے خنجر نکالا۔ اور دیکھتے دیکھتے گھوڑے کے حلق پر وار کردیا۔ حلق سے سیٹی کی سی آواز نکلی۔ بدن لرزا اور روح تن سے جدا ہوگئی!

اور تب تاتاروں نے اس کی لگام، زین، سب کچھ کھینچ لیا۔ پھر نارنجی داڑھی والا تاتار گھوڑے پر سوار ہوا، دوسرے تاتاروں نے ژیلین کو اس کے پیچھے گھوڑے پر لاد کر رسی سے کس کر تاتار کی پشت سے باندھ دیا تاکہ قیدی گرنے نہ پائے۔ اور اس صورت سے یہ قافلہ پہاڑی کی طرف روانہ ہوگیا۔

ژیلین تاتار کے پیچھے بیٹھا ڈولتا رہا، چہرے سے مسلسل خون رس رس کر تاتار کی بدبودار گردن پر گر رہا تھا۔ ژیلین کو دیوہیکل تاتار کی پشت اور موٹی گردن کے سوا اور کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اور ہاں ٹوپی کے نیچے سے تاتار کی استرہ پھری ہوئی گنجی چاند چمک رہی تھی۔ ژیلین کا سر پھٹا ہوا تھا اور آنکھوں کے اوپر خون کی بوندیں سوکھ گئی تھیں۔ وہ نہ ان بوندوں کو پونچھ سکتا تھا، نہ گھوڑے پر ذرا جم کر بیٹھ سکتا تھا۔ ہاتھ ایسے کس کر بندھے تھے کہ کلائیاں ٹوٹی جا رہی تھیں۔

یہ قافلہ بڑی دیر تک پہاڑی پر پہاڑی پار کرتا ہوا آخر دریا کے اس پار گیا۔ اب وہ سڑک پر پہنچ گئے اور گھاٹی میں آگے بڑھنے لگے۔

ژیلین نے لاکھ چاہا کہ ذرا غور سے راستہ دیکھتا رہے۔ آخر پتہ تو چلے اسے کہاں لیجا رہے ہیں یہ لوگ۔ مگر دیکھتا تو کیونکر۔ آنکھوں میں تو خون بھرا ہوا تھا۔ اور پلٹنا بھی ممکن نہ تھا۔

رفتہ رفتہ شام کا دھندلکا پھیلنے لگا۔ اور پھر راستے میں ایک دریا اور آیا۔ اب وہ سنگلاخ پہاڑ پر چڑھنے لگے۔ ہوا میں دھوئیں کی بو بسی ہوئی تھی اور کتے بھونک

رہے تھے۔ آخر وہ پہنچ گئے آؤل میں (تاتار گاؤں کو آؤل کہتے ہیں)۔ تاتار گھوڑوں سے اترنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے بہت سے تاتار بچے ادھر ادھر سے آکر ژیلین کے چاروں طرف جمع ہوگئے، چوں چوں کر رہے ہیں، خوش ہو رہے ہیں، اور پھر وہ اس پر پتھر برسانے لگے۔

تاتار نے بچوں کو ڈانٹ کر بھگایا۔ ژیلین کو گھوڑے سے کھینچا، اور زور سے ملازم کو آواز دی ۔ آواز سنتے ہی ایک نوگائی* ملازم دوڑا۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں، اور بدن پر صرف ایک قمیص تھی اور بس۔ اور قمیص بھی تو تار تار تھی۔ ساری چھاتی جھانک رہی تھی۔ تاتار نے اسے کچھ ہدایات دیں اور ملازم جلد سے بیڑیاں لے آیا۔ بلوط کے دو کندوں میں دو کھردرے اور سخت حلقے لگے ہوئے تھے۔ ایک حلقے میں تالا اور کنڈا بھی تھا۔

انھوں نے ژیلین کے ہاتھ کھول کر بیڑیاں پہنائیں، اور اسے گودام میں دھکیل کر آگے سے دروازہ بند کردیا۔ ژیلین گوبر پر گرا، اور کچھ دیر یونہی پڑا رہا۔ پھر اندھیرے میں ایک نرم سا کونا ٹٹولا اور لیٹ گیا۔

۲

ژیلین رات بھر سو نہ سکا۔ کھلی آنکھوں صبح ہوگئی۔ راتیں یوں بھی بہت چھوٹی تھیں، دیکھتے دیکھتے دیوار کے روزن میں صبح کی روشنی پھیلنے لگی۔ ژیلین اٹھا، مٹی کرید کرید کر روزن کو ذرا بڑا کیا اور باہر دیکھنے لگا۔

روزن سے سڑک نظر آ رہی تھی — پہاڑی کے دامن میں سڑک تھی، دائیں ہاتھ پر تاتاری مکان تھا اور اس کے برابر دو پیڑ کھڑے تھے۔ دیوڑھی پر کالا کتا لیٹا تھا۔ ایک بکری اور اس کے میمنے ہوا میں دمیں لہراتے چلے جا رہے تھے۔ اور پھر پہاڑی کی اوٹ سے ایک نوجوان تاتار عورت آتی نظر آئی۔ بدن پر ڈھیلی ڈھالی رنگین قمیص اور شلوار اور پاؤں میں اونچے جوتے۔ سر پر رومال بندھا ہوا تھا اور اس پر رکھی ہوئی ٹین کی بڑی سی گاگر سے پانی چھلک رہا تھا۔ وہ کبھی جھونک کھاتی، کبھی ڈگمگاتی چلی آ رہی تھی۔ ایک ہاتھ میں ننھے سے تاتار بچے کا ہاتھ تھا۔ بچے کا سر منڈا ہوا تھا، اور بدن پر لے دے کر بس ایک کرتا تھا۔ تاتار عورت سر پر گاگر سنبھالتی گھر کے اندر چلی گئی۔ اور پھر کل والا تاتار — وہی نارنجی داڑھی والا — ریشمی انگرکھا پہنے آتا نظر آیا۔ کمربند سے چاندی کا خنجر لٹک رہا تھا۔ ننگی ٹانگیں، پاؤں میں جوتے، سر پر ترچھی رکھی ہوئی، پوستین کی کالی اونچی ٹوپی۔ وہ کھڑا کھڑا انگڑائی لیتا رہا، لال داڑھی میں

---

* نوگائی — ایک قوم جس کی زبان تاتاری زبان سے ملتی جلتی ہے۔ (ایڈیٹر)

ہاتھ سے کنگھا کرتا رہا۔ کچھ دیر رکا، پھر ملازم کو ضروری ہدایتیں دے کر کہیں چلا گیا۔

اس کے بعد دو نہایت کم‌سن گھوڑ سوار پیاؤ کے قریب پہنچے۔ گھوڑوں کی پشتیں گیلی تھیں۔ اور کئی اور بچے بھاگتے ہوئے آئے۔ سب کے سر منڈے ہوئے اور بدن پر صرف لمبے ڈھیلے کرتے۔ دیکھتے دیکھتے بچوں کا جھنڈ سا بن گیا۔ پھر سب کے سب گودام کی طرف آئے، وہاں سے قمچیاں، ٹہنیاں لیں، اور دراڑوں میں گھسانے لگے۔ مگر جیسے ہی ژیلین ان کی طرف رخ کرکے کھنکارا، سب سر پر پاؤں رکھ کر چیختے ہوئے بھاگے۔ دور سے ننگی ٹانگیں چمکتی نظر آ رہی تھیں اور بس...

ژیلین کو شدت سے پیاس لگ رہی تھی، گلا سوکھ گیا تھا۔ سوچ رہا تھا کاش کوئی یہاں آجائے۔ اچانک گودام کا تالا کھلنے کی آواز آئی اور لال منہ‌والا تاتار ایک اور تاتار کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ دوسرے کا قد پہلےوالے سے کم تھا۔ اس کے سر کے بال کالے تھے اور آنکھیں چمک دار، رنگ سانولا تھا، اور منہ پر لالی سی تھی۔ اس کی چھوٹی سی داڑھی ترشی ہوئی تھی۔ چہرے سے خوش‌مزاجی عیاں تھی اور ہونٹوں پر مستقل مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس کا لباس بھی زیادہ شاندار تھا۔ نیلے رنگ کے ریشمی انگرکھے پر کارچوبی کام تھا۔ کمر کے پٹکے سے چاندی کی تلوار لٹک رہی تھی۔ پاؤں میں لال رنگ کے مراقشی چمڑے کے اونچے جوتے تھے۔ جوتوں پر بھی چاندی کا کام تھا۔ ان نرم جوتوں پر دوسرے موٹے جوتے تھے۔ سر پر سفید پوستین کی اونچی ٹوپی تھی۔

لال منہ‌والا تاتار قریب آیا اور نجانے کیا بولنے لگا۔ جیسے کسی پر بگڑ رہا ہو۔ پھر سردل سے ٹیک لگاکر اپنی تلوار سے کھیلنے لگا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور کنکھیوں سے بار بار ژیلین کو دیکھ رہا تھا، بھیڑیے کی طرح۔ اور سانولاوالا تو پارہ تھا پارہ، تیز، پھڑکتا ہوا۔ لپک جھپک ژیلین کے سر پر ہی تو آن‌پہنچا، پھر اس کے ٹھیک سامنے اکڑوں بیٹھ گیا، کھیسیں نکال کر ہنسا، اس کے شانے پکڑ کر جھنجھوڑے، اور اپنی زبان میں بار بار کچھ کہنے لگا۔ آنکھیں چمکا چمکا کر، زبان سے چٹخارے بھر بھر کر بار بار ایک ہی بات دوہرا رہا تھا: ”اوچھا رو — وسی! روسی او— وچھا!“

ژیلین کی خاک سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے۔ بہرحال ژیلین نے جلدی سے اس سے کہا: ”پیاس لگی ہے، پینے کو پانی دے دو!“

سانولا تاتار زور سے ہنسا: ”او — وچھا، رو — وسی!“ وہ اپنی ہی کہے جا رہا تھا۔

ژیلین نے ہونٹوں اور ہاتھ کے اشاروں سے اسے سمجھایا کہ پانی چاہئے۔

سانولا تاتار سمجھ گیا۔ اس نے گردن بڑھاکر احاطے کے اندر جھانکا اور زور سے کسی کو آواز دی: ”دینا!“

آواز سن کر ایک لڑکی بھاگتی ہوئی باہر آئی۔ تیرہ ایک سال کی دبلی پتلی سی بچی

کی صورت میں سانولے تاتار کی شباہت تھی۔ شاید اس کی بیٹی ہوگی۔ بچی کی آنکھیں بھی کالی اور چمکدار تھیں، اور چہرہ بہت دلکش۔ اس کے بدن پر نیلے رنگ کا لمبا سا ڈھیلا ڈھالا کرتا تھا۔ قمیص کی آستینیں بہت چوڑی تھیں اور گریبان، سینے اور کفوں پر سرخ گوٹ تھی۔ ٹانگوں میں شلوار تھی اور پاؤں میں اونچے جوتے۔ اور ان پر اونچی ایڑی والے ایک جوڑ جوتے اور تھے۔ گلے میں روبل کے سکوں کا ھار لٹک رہا تھا۔ اس کا سر کھلا ہوا تھا، اور ناگن جیسے کالے بالوں کی چوٹی میں سوباف تھا ، جس کے سروں پر چاندی کے روبل اور دوسرے سکے ٹنگے ہوئے تھے۔

باپ نے بیٹی سے کچھ کہا۔ دینا بھاگتی ہوئی گئی اور دوڑتی ہوئی لوٹی۔ ھاتھ میں دھات کا جگمگاتا ہوا جگ تھا۔ وہ ژیلین کو پانی دے کر، کچھ اس طرح جھک کر اکڑوں بیٹھی کہ سر گھٹنوں سے بھی نیچا کرلیا، یوں بیٹھ کر وہ آنکھیں پھاڑے ژیلین کو پانی پیتے دیکھنے لگی۔ جیسے کسی جانور کو دیکھ رہی ہو۔

ژیلین نے پانی پی کر جگ واپس لوٹایا تو وہ کچھ یوں اچھلی جیسے کوئی جنگلی بکری ہو۔ باپ بھی ھنس پڑا۔ پھر اس نے بیٹی کو اور کسی کام کےلئے بھیجا۔ وہ جگ اٹھا کر بھاگی اور ایک چوبی کشتی میں روٹی لے کر لوٹی۔ گول سینی ژیلین کے سامنے رکھ کر وہ پھر اسی طرح اکڑوں بیٹھ گئی، اور ایک ٹک روسی کو دیکھنے لگی... آنکھیں گڑوئے دیکھتی رہی، دیکھتی رہی...

اور پھر تاتار واپس چلے گئے۔ دروازے پھر بند کر دئے گئے۔

تھوڑی دیر بعد نوگائی ملازم ژیلین کے پاس آیا اور بولا :

''آئیدا مالک، آئیدا!،،

نوگائی بھی روسی سے قطعی نابلد تھا۔ مگر ژیلین سمجھ گیا کہ کہیں جانے کو کہہ رہا ہے۔

ژیلین بیڑیوں سمیت لنگڑاتا ہوا ساتھ ہولیا۔ مگر قدم اٹھانا دشوار تھا۔ وہ بڑی مشکل سے دائیں بائیں ٹانگیں کر کے قدم اٹھاتا ہوا، نوگائی کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ راستے میں تاتار گاؤں نظر آیا، یہی کوئی دس ایک گھر ہوں گے۔ اور ھاں تاتاروں کی لمبے میناروں‌والی مسجد نظر آئی۔ ایک گھر کے سامنے تین گھوڑے زین کسے کسائے تیار کھڑے تھے۔ کم‌عمر لڑکے گھوڑوں کی لگام تھامے کھڑے تھے۔ اچانک سانولا تاتار تیزی سے اس گھر کے اندر سے نکلا، اور ھاتھ کے اشارے سے ژیلین کو قریب بلایا۔ آپ ھی آپ ھنس بھی رہا تھا۔ اور زور زور سے اپنی زبان میں کچھ کہہ بھی رہا تھا۔ اسی صورت سے وہ دروازے تک پہنچا۔ ژیلین بھی گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ بیٹھک بہت شاندار تھی۔ دیواروں پر چکنی مٹی کی نفیس پتائی تھی۔ سامنےوالی دیوار کے ساتھ ساتھ پروں کے، رنگ برنگے، نرم گدے بچھے ہوئے تھے۔ دائیں بائیں دیواروں پر بیش‌قیمت قالین لٹک رہے تھے۔ قالینوں پر تلواریں، خنجر اور بندوقیں ٹنگی ہوئی تھیں — ان سب پر

چاندی منڈھی ہوئی تھی۔ ایک دیوار میں فرش کے ساتھ ہی چھوٹا سا آتش دان تھا۔ فرش مٹی کا تھا، صاف ستھرا اور چکنا، جیسے کھلیان۔ دیوار کے سامنے، ادھر سے ادھر تک نمدہ بچھا تھا اور نمدے پر قالین تھے، اور قالینوں پر پھولے پھولے گؤ تکیے رکھے تھے۔ قالینوں پر، گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے، چند تاتار بیٹھے تھے، جوتے پہنے ہوئے — سانولا والا، لال منہ‌والا، اور تین مہمان۔ ان کے سامنے سینی میں باجرے کی روٹیاں رکھی تھیں، کٹورے میں تازہ مکھن تھا اور جگ میں تاتاروں کی بیر — 'بوزہ' رکھی تھی۔ سارے تاتار ہاتھ سے کھا رہے تھے۔ ہاتھوں میں مکھن چپڑا ہوا تھا۔

سانولے تاتار نے اچھل کر، ژیلین کو سامنے بٹھانے کا حکم دیا — قالین پر نہیں بلکہ زمین پر — پھر خود قالین پر بیٹھ کر مہمانوں کو روٹی اور بیر پیش کرنے لگا۔ ملازم نے ژیلین کو جگہ پر بٹھایا، اپنے موٹے جوتے اتار کر دوسرے جوتوں کے ساتھ دروازے کے قریب رکھے، اور مالکوں سے ذرا سا ہٹ کر نمدے پر بیٹھ گیا۔ مالکوں کو کھاتے دیکھ کر اس کے منہ میں پانی آ رہا تھا۔

تاتاروں نے کھانا ختم کیا تو ایک تاتار عورت اندر آئی۔ وہ بھی اس بچی کی طرح ڈھیلے کرتے اور شلوار میں ملبوس تھی۔ سر پر رومال بندھا تھا۔ عورت نے روٹی اور مکھن کی سینی ہٹا کر خوبصورت سلفچی اور صراحی‌دار گردن‌والا آفتابہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ تاتاروں نے ہاتھ دھوئے۔ اکڑوں بیٹھ کر زانوؤں پر ہاتھ رکھے، چاروں طرف پھونکیں ماریں اور دعا کےلئے ہاتھ اٹھائے۔ انھوں نے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ اس کے بعد مہمان تاتاروں میں سے ایک ژیلین کی طرف مڑا اور اس سے روسی زبان میں بولا:

"تمھیں قاضی محمد نے پکڑا۔" یہ کہہ کر اس نے لال منہ والے تاتار کی طرف اشارہ کیا۔ "اور اب عبدالمراد کو دے دیا ہے۔" اب اس نے سانولے تاتار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "اب تمھارے مالک عبدالمراد ہیں۔"

ژیلین خاموش رہا۔ عبدالمراد نے مستقل ژیلین کی طرف اشارے کر کر کچھ کہنا شروع کیا۔ بار بار ہنس ہنس کر دوہرا رہا تھا: "رو — وسی سپاہی، او — وچھا روس!"

ترجمان نے اس کی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا: "یہ چاہتے ہیں کہ تم گھر خط لکھو کہ گھروالے تمھیں چھٹانے کےلئے معاوضہ بھیجیں۔ رقم ملتے ہی یہ تمھیں آزاد کر دیں گے۔"

ژیلین کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا:

"بہت معاوضہ مانگ رہے ہیں کیا؟"

تاتار آپس میں کچھ بولنے لگے۔ ترجمہ کرنےوالے نے کہا:

"صرف تین ہزار سکہ رائج الوقت۔"

"نہیں!" ژیلین نے کہا۔ "میں اتنی بڑی رقم کسی صورت ادا نہیں کر سکتا!"

یہ سن کر عبدل اچھل پڑا۔ ہاتھ چلاچلا کر ژیلین سے کچھ کہنے لگا۔ جیسے ژیلین اس کی ایک بات سمجھ رہا ہو۔ تب ترجمان نے اس کی بات کی وضاحت کرتے ہوئے

کہا: ''تو کتنا دے سکتے ہو تم؟،، ژیلین سوچتا رہا، سوچتا رہا۔ پھر بولا: ''پانچ سو روبل۔،، یہ سن کر تو سارے تاتار بیک‌وقت زور زور سے کچھ بولنے لگے۔ عبدل نے لال منہ والے پر چیخنا شروع کیا۔ ایسا بوکھلا کر چلایا کہ اس کے منہ سے کف نکلنے لگا۔ لال منہہ والا بھویں چڑھائے، آنکھیں مچکائے بار بار تت تت کر رہا تھا۔

اور جب سب تھک ہار کر خاموش ہوگئے تو ترجمان نے کہا:

''مالک کےلئے پانچ سو روبل معاوضہ بہت کم ہے۔ انھوں نے خود اپنی جیب سے دو سو روبل خرچ کرکے تمھیں خریدا ہے۔ قاضی محمد ان کے قرضدار تھے اور قرضے کے عوض میں تمھیں دیا ہے۔ تین ہزار سے کم ہو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر تم نے خط نہ لکھا تمھیں کوڑے مارے جائیں گے۔،،

''اونہہ،، ژیلین نے سوچا ''ان لوگوں کے سامنے جھکے، تو سمجھ لو مرے پر سو درے!،،

جھٹ اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ بولا:

''کہہ دو ان سے کہ اگر مجھے دھمکایا تو پھوٹی کوڑی نہیں دوں‌گا، خط بھی نہیں لکھوں‌گا۔ میں نہ کبھی تم سے ڈرا ہوں نہ ڈروں‌گا۔،،

ترجمان نے اپنی زبان میں اس کی بات دوھرائی۔ اور ایک دفعہ پھر سب ایک ساتھ زور زور سے بولنے لگے۔

بڑی دیر بک بک جاری رہی۔ پھر سانولا تاتار اچھل کر ژیلین کے پاس آیا اور بولا:

''روسی نژاد۔ ژیگیت۔ روسی نژاد ژیگیت!،،

ان کی زبان میں ژیگیت کا مطلب ہے ''کڑیل جوان،،۔ اس نے ھنس کر ترجمان سے کچھ کہا، اور ترجمان بولا:

''چلو ہزار روبل دے دینا۔،،

مگر ژیلین بات پر اڑا رہا۔ ''پانچ سو سے کوپک زیادہ نہیں دوں‌گا۔ اور اگر مار ڈالوگے تو اس سے بھی جاؤگے۔،،

تاتار آپس میں کچھ بحثابحثی کرتے رہے، پھر نوگائی ملازم کو نجانے کہاں بھیجا اور خود کبھی ژیلین کو دیکھ رہے ہیں تو کبھی دروازے کی طرف۔ ملازم جلد ہی لوٹ آیا۔ اس کے پیچھے کوئی اور بھی تھا۔ موٹا تازہ، ننگے پاؤں، پھٹے حال۔ اس کے پاؤں میں بھی بیڑیاں پڑی تھیں۔

اس پر نظر پڑتے ہی ژیلین ھکابکا رہ گیا — وہ کوستیلین تھا۔ تو وہ بھی نہ بچ سکا۔ تاتاروں نے انھیں قریب قریب بٹھا دیا۔ وہ ایک دوسرے کو حال دل سنانے لگے۔ تاتار خاموشی سے انھیں دیکھتے رہے۔ ژیلین نے کوستیلین کو بتایا کہ اس پر کیا کیا بیتی، کوستیلین نے بھی بتایا کہ کس طرح اس کا گھوڑا رک گیا، کیسے اس کا نشانہ چوکا اور کس طرح اس عبدل نے اس کا پیچھا کرکے اسے پکڑلیا۔

عبدل پھر اچھلا اور کوستیلین کی طرف اشارہ کرکے زور سے کچھ بولا۔ ترجمان نے انھیں بتایا کہ اب وہ دونوں ایک ھی مالک کے قبضے میں ھیں، جس نے پہلے فدیہ کی رقم منگوا دی، اسے پہلے رھائی مل جائے گی۔

''دیکھو،، وہ ژیلین سے بولا ''تم مستقل حیل حجت کر رہے ھو، مگر ساتھی تمھارا نیک ھے۔ اس نے گھر خط لکھ بھی دیا۔ اس کے گھروالے ہ ھزار روبل فدیے کے بھجوا دیں گے۔ اب دیکھ لینا اس کے کھانے پینے کا بھی خیال رکھا جائے گا۔ اس کے ساتھ اور بھی کسی قسم کی زیادتی نہیں کی جائے گی۔،،

ژیلین نے جواب دیا:

''ساتھی کی مرضی ھے۔ ھو سکتا ھے وہ دولت‌مند ھو۔ مگر میں امیرزادہ نہیں ھوں۔ میں نے تو،، بولا ''جو کہہ دیا ھے وھی کر دوں گا۔ چاھو تو مار ڈالو۔ تمھارا کوئی بھلا تو ھوگا نہیں۔ مگر پانچ سو روبل سے زیادہ کےلئے میں خط نہیں لکھوں گا۔،،

تاتار خاموش سے ھوگئے۔ اچانک عبدل جگہ سے اچھلا۔ قلمدان اٹھاکر اس میں سے پر کا قلم نکالا، کاغذ اور روشنائی نکالی، ژیلین کے پاس گیا اور اس کے شانے پر دھپ مارتے ھوئے اشارے سے کہا: ''لکھو، مجھے پانچ سو منظور ھیں!،،

''ذرا ٹھیرو،، ژیلین نے ترجمان سے کہا۔ ''تم اس سے یہ بھی کہہ دو کہ وہ ھم دونوں کو اچھا کھانے کو دے، معقول لباس دلوائے، قاعدے کے مطابق معقول سلوک کرے ھم سے، ھم دونوں کو ایک ھی جگہ رکھے۔ اس طرح ذرا ھمارا بھی دل لگا رھےگا۔ اور ھاں بیڑیاں اتروا دے۔،، یہ کہہ کر اس نے مالک کی طرف دیکھا اور زور سے ھنسا۔ مالک نے بھی قہقہہ لگایا۔ ترجمان کی زبانی اس کی بات سن کر بولا:

''لباس اچھے سے اچھا دوں گا۔ جوتے بھی ھوں گے، قبا بھی ھوگی۔ چاھو شادی بھی کرلو۔ کھانا بھی ایسا کھلواؤں گا کہ کیا کسی شہزادے نے کھایا ھوگا۔ اور اگر ساتھ رھنا چاھتے ھیں تو شوق سے رھیں۔ اناج کے کوٹھے میں رھیں۔ مگر بیڑیاں ھرگز نہیں اتریں گی۔ ورنہ نکل جائیں گے ھاتھ سے۔ البتہ رات کے وقت بیڑیاں اتار دیا کریں گے۔،، وہ اچھل کر کھڑا ھوگیا، اور کندھے جھٹک کر بولا: ''تمھارا بھی بھلا۔ میرا بھی بھلا!،،

ژیلین نے خط لکھ دیا، مگر ایسے نہیں لکھا کہ پہنچ سکے۔ دل ھی دل میں سوچ رھا تھا کہ بھاگ جاؤں گا۔

ژیلین اور کوستیلین کو اناج کے کوٹھے میں پہنچا دیا گیا۔ ان کےلئے مکئی کی کربی لائے، جگ بھر پانی اور روٹی آئی، دو پرانی قبائیں اور سپاھیوں والے پھٹے پرانے جوتے لائے گئے۔ صاف ظاھر تھا کہ جنگ میں کام آنےوالے کسی سپاھی کے جسم سے اتارا ھوا سامان تھا۔ رات کے وقت ان کی بیڑیاں اتار کر انھیں کوٹھے میں بند کر دیا گیا۔

۳

ژیلین اور اس کے ساتھی کو اس صورت سے رہتے قریب ایک مہینہ بیت گیا۔ مالک مستقل مذاق کرتا رہتا۔ ''تمھارا ایوان خو — و ب، امارا عبدل خو — و — وب!،، کھانا مگر بہت خراب دیتا تھا۔ یا تو موٹے اناج کی کچی پکی تنوری روٹیاں، یا پھر محض گندھا ہوا کچا آٹا۔

کوستیلین نے دوبارہ گھر خط لکھا۔ وہ مستقل رقم آنے کا انتظار کرتا اور دکھی ہوتا رہتا۔ دن دن بھر اسارے میں بیٹھا گھڑیاں گنا کرتا کہ کب خط آئےگا، یا پھر بےسدھ ہوکر سوجاتا۔ مگر ژیلین جانتا تھا کہ اس کا خط تو پہنچےگا نہیں۔ دوسرا خط اس نے لکھا نہیں۔

وہ سوچتا: ''ماں بچاری میری خاطر اتنی رقم کہاں سے لائیںگی بھلا؟ جو کچھ میں بھیجتا تھا اس میں مشکل سے گزر کرتی تھیں۔ اب اگر پانچ سو روبل بھیجنے پڑے تو بالکل ہی ڈھیر ہوجائیںگی۔ میں خود ہی سمجھ لوںگا ان تاتاروں سے!،،

وہ مستقل چوکنا رہتا، ہر طرف نظریں دوڑاتا اور بھاگنے کی راہیں سوچتا رہتا۔

کبھی سیٹی بجاتا ہوا گاؤں میں ادھر ادھر گھوم رہا ہے، کبھی بیٹھ کر کچھ دستکاری کر رہا ہے۔ کبھی مٹی کے کھلونے بناتا، کبھی پیڑوں کی شاخوں سے ٹوکریاں بنتا۔ ژیلین یوں بھی ہاتھ کے کام میں استاد تھا۔

ایک دفعہ اس نے مٹی کی گڑیا بنائی۔ آنکھ، ناک، ہاتھ، پاؤں اور تن پر تاتاروں جیسا لبادہ۔ اس نے گڑیا چھت پر رکھ دی۔ تاتارنیں پانی لینے آئیں تو مالک کی بچی دینا کی نظر گڑیا پر پڑگئی۔ جھٹ اس نے سب کو آواز دی، سب نے گاگریں رکھ دیں اور گڑیا کو دیکھ دیکھ کر خوش ہونے اور ہنسنے لگیں۔ ژیلین نے گڑیا اتار کر ان کی طرف بڑھائی۔ وہ ہنستی رہیں لیکن لینے کی ہمت نہیں پڑی۔ تب اس نے گڑیا نیچے رکھ دی اور خود کوٹھے کے اندر جاکر تماشا دیکھنے لگا۔

دینا بھاگتی ہوئی آئی، اس نے چوکنا نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا، لپک کر گڑیا اٹھائی اور یہ جا اور وہ جا۔

اگلی صبح سویرے دیکھتا کیا ہے کہ دینا گڑیا کو لال چیتھڑے میں لپیٹے، کلیجے سے لگائے، بچے کی طرح جھلاتی چلی آرہی ہے۔ منہ ہی منہ میں لوری بھی گا رہی تھی۔ اتنے میں بڑھیا باہر آکر اس پر برس پڑی۔ اس نے بچی کے ہاتھ سے گڑیا چھین کر اسے توڑ ڈالا اور دینا کو کسی کام کےلئے دوڑا دیا۔

اب ژیلین نے اس سے بھی اچھی ایک گڑیا بناکر دینا کو دی۔ ایک دفعہ دینا جگ لےکر آئی تو جگ زمین پر رکھ کر بیٹھ گئی، اور ژیلین کو دیکھنے لگی۔ بار بار جگ کی طرف اشارہ کرکے ہنس رہی تھی۔

''کس بات پر خوش ہو رہی ہے بچی؟،، ژیلین نے سوچا، اور جگ اٹھاکر منہ سے لگالیا۔ سوچا شاید پانی ہوگا۔ مگر اس میں تو دودھ تھا۔ اس نے خوب جی بھر کر دودھ پیا اور بولا: ''بہت اچھا!،، اور دینا کھل اٹھی۔

''اچھا، ایوان، اچھا!،، وہ اچھلی اور خوش ہوکر تالی بجانے لگی۔ پھر جھٹ سے جگ اٹھاکر بھاگ گئی۔

پھر تو وہ روزانہ چوری چھپے ژیلین کےلئے دودھ لانے لگی۔ تاتار بھیڑ کے دودھ کا پنیر بناکر ان کی ٹکیاں سی بناتے ہیں اور انہیں سکھا لیتے ہیں۔ بچی یہ ٹکیاں بھی چھپاکر لے آتی۔ ایک دفعہ مالک نے بھیڑ ذبح کی تو دینا گوشت کا ٹکڑا بھی آستین میں چھپاکر لے آئی۔ کھانا لے آتی اور اس کے سامنے چھوڑکر بھاگ جاتی۔

ایک دن بہت زور کا طوفان آیا۔ خوب کڑک چمک ہوئی، گھنٹے بھر تک موسلادھار بارش ہوتی رہی۔ سارے ندی چشمے چڑھ گئے۔ جہاں کل تک سوکھا تھا، وہاں گز گز بھر گہرا پانی بہنے لگا۔ پانی کا ایسا زور تھا کہ پتھر جگہ سے کھسکنے لگے۔ ہر طرف چشمے پھوٹ بہے۔ پہاڑوں میں گرج خوفناک تھا۔ طوفان جب ختم ہوا تو گاؤں میں ہر طرف چشمے بہنے لگے۔ ژیلین نے مالک سے چاقو لی اور ٹہنیوں سے ایک سلنڈر اور تختے کاٹے، ان تختوں میں پہیے لگائے، اور پہیے کے دو سروں پر دو گڑیاں بناکر لگا دیں۔

بچیوں نے اسے چیتھڑے کپڑے لادئے، اور اس نے گڑیوں کو کپڑے بھی پہنا ڈالے۔ ایک کو کسان بنایا، دوسری کو عورت۔ خوب مضبوطی سے ٹھونک کر پہیوں کو چشمے پر چھوڑ دیا۔ جیسے جیسے پہیے گھومتے گڑیاں جھومنے مٹکنے لگتیں۔

سارا گاؤں اکٹھا ہوگیا۔ لڑکے، لڑکیاں، عورتیں، مرد۔ سب آگئے۔ سب زیر لب کہہ رہے تھے:

''واہ روسی نژاد! واہ ایوان!،،

عبدل کے پاس ایک روسی گھڑی ٹوٹی پڑی تھی۔ اس نے ژیلین کو بلاکر دکھائی اور عجیب عجیب سی آوازیں نکالنے لگا۔ ژیلین بولا:

''لاؤ، درست کر دوں!،،

اس نے گھڑی لےکر چھری سے اسے کھولا، ٹھونکا، بجایا، پھر ٹھیک طرح سے بند کرکے واپس کر دی۔ گھڑی چلنے لگی۔ مالک خوش ہوگیا۔ اپنی پھٹی چتھڑی قبا اسے تحفے میں دے ڈالی۔ کیا کرتا لےلی۔ کچھ نہیں تو رات کو اوڑھنے کے کام آجائےگی۔

اور پھر تو ہر طرف چرچا ہوگیا کہ ژیلین بڑا کاریگر ہے۔ پھر تو دور دور کے گاؤں سے لوگ اس کے پاس آنے لگے۔ کسی کو بندوق یا پستول کا گھوڑا مرمت کروانا ہوتا، تو کسی کو گھڑی۔ مالک نے اس کےلئے سنسی، ڈرل اور برما منگوا دئے۔

ایک مرتبہ ایک تاتار بیمار پڑگیا تو یار لوگ پہنچ گئے ژیلین کے پاس: ''چلو چل کر اس کو دوا دو!،، ژیلین دوا علاج کے معاملے میں بالکل صفر تھا۔ پھر بھی مریض

کو دیکھنے گیا۔ سوچا: ''ھوسکتا ھے خود ھی ٹھیک ھوجائے۔'' خیر صاحب وہ اپنے کوٹھے میں آیا، پانی میں ریت مٹی گھولی، تاتاروں کے سامنے کچھ پڑھ کر پانی پر پھونکا اور مریض کو پلوانے کےلئے دے دیا۔ اس کی قسمت سے تاتار جلد ھی اچھا ھوگیا۔

اب ژیلین ان کی زبان بھی تھوڑی بہت سمجھنے لگا۔ بعض بعض تاتار بھی اس سے مانوس ھوگئے۔ جب بھی کوئی ضرورت پڑتی، ''ایوان، ایوان!'' پکارنے لگتے۔ مگر بعض اب بھی ایسے تھے جو اسے دیکھ کر یوں بھاگتے جیسے وہ کوئی جانور ھو...

لال منہ والا تاتار ژیلین سے ھمیشہ بےزار رھتا۔ دیکھتے ھی تیوریاں چڑھ جاتیں، پھنکارتا ھوا منہ موڑ کر چل دیتا۔ یا اس پر بگڑنے لگتا۔ اور ھاں ایک بڑے میاں اور تھے۔ اس گاؤں کے نہیں تھے۔ پہاڑی کے دامن کی کسی بستی سے آیا کرتے تھے۔ ژیلین انھیں جب بھی دیکھتا، نماز پڑھنے مسجد کی طرف جاتے دیکھتا۔ ان بڑے میاں کا قد چھوٹا سا تھا، سر پر ٹوپی اور ٹوپی پر رومال بندھا رھتا تھا، سفید داڑھی مونچھ بہت قرینے سے ترشی ھوئی، اور بجری جیسے لال چہرے پر جھریوں کا جال۔ ان کی ناک عقاب کی ناک کی طرح جھکی ھوئی تھی۔ آنکھیں سرمئی اور نہایت خونخوار تھیں، اور منہ پوپلا تھا۔ منہ میں صرف دو داڑھیں بچی تھیں۔ اکثر ایسا ھوتا کہ عمامہ پہنے، بیساکھیاں سنبھالے لنگڑاتے چلے آرھے ھیں، جیسے بھیڑیا ھو۔ ژیلین پر نظر پڑتے ھی بڑے میاں غصے سے کھنکھارتے، اور فوراً راستہ بدل دیتے۔

ایک دفعہ ژیلین پہاڑی کے دامن والی بستی میں پہنچ گیا کہ دیکھے تو بڑے میاں رھتے کہاں ھیں۔ وہ پگڈنڈی پر چلا جا رھا تھا کہ ایک باغیچہ نظر آیا۔ اس کا احاطہ پکا، پتھر کا تھا۔ احاطے کے اس طرف چیری اور شفتالو کی جھاڑیاں تھیں۔ اور پختہ چھت والا بنگلہ نظر آ رھا تھا۔ وہ اور قریب پہنچا۔ دیکھتا کیا ھے کہ کربی کے بنے ھوئے چھتے کھڑے ھیں، شہد کی مکھیاں بھنبھنا رھی ھیں، اور بڑے میاں گھٹنوں کے بل کھڑے کچھ کر رھے ھیں۔ ژیلین نے اچھی طرح جائزہ لینے کی خاطر ذرا سا اچکنا چاھا تو پاؤں کی بیڑیاں کھڑکھڑا اٹھیں۔ بڑے میاں نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔ نظر پڑتے ھی جھٹ پٹکے سے پستول نکالی، ژیلین کی طرف جھپٹے۔ ژیلین بمشکل پتھروں کی اوٹ میں چھپ سکا۔

اور تب بڑے میاں مالک کے پاس شکایت کرنے پہنچے۔ مالک نے ژیلین کو بلوایا اور ھنس کر بولا:

''ارے بڑے میاں کی طرف کیوں گئے تھے تم؟''

''میں''، ژیلین نے کہا ''میں نے ان کے ساتھ کوئی برائی تو نہیں کی۔ بس دیکھنا چاھتا تھا کہ کیسے رھتے ھیں۔''

مالک نے بڑے میاں کو بتایا۔ مگر وہ تو بگڑ گئے۔ نجانے کیا بڑبڑاتے رھے۔ اپنی داڑھیں نکالنے لگے ھاتھ سے بار بار ژیلین کی طرف اشارہ کرنے اور برا بھلا کہنے لگے۔

ژیلین کے زیادہ تو پلے نہیں پڑا۔ مگر وہ اتنا سمجھ گیا کہ بڑے میاں کا اصرار ہے کہ روسیوں کو گاؤں میں نہ رکھو، بلکہ فوراً ختم کرا دو ۔ اور پھر بڑے میاں چلے گئے۔

اور ژیلین نے مالک سے پوچھا کہ آخر یہ حضرت ہیں کون؟ تب مالک بولا :

''بہت بڑے آدمی ہیں یہ۔ اس علاقے کے پہلے ژیگیت تھے۔ بہت سے روسیوں کا کام تمام کر چکے ہیں۔ بہت امیر کبیر تھے کبھی۔ ان کی تین بیویاں تھیں اور آٹھ بیٹے۔ سب ایک ہی گاؤں میں رہتے تھے۔ ایک دفعہ گاؤں میں روسی گھس آئے۔ انھوں نے گاؤں کو لوٹا اور سات بیٹے ان کے ختم کر دئیے۔ صرف ایک بیٹا بچا، مگر اس نے روسیوں کے آگے ہتھیار ڈال دئیے۔ تب بڑے میاں نے بھی خود ہی روسیوں کے پاس جاکر ان کے سامنے سر جھکادیا۔ تین مہینے یہ ان کے ساتھ رہے، وہیں بیٹے کو تلاش کیا، اور خود اپنے ہاتھوں اس ناخلف کا کام تمام کرکے وہاں سے بھاگ آئے۔ بس اس کے بعد انھوں نے ہمیشہ کےلئے تلوار میان میں رکھی۔ اور خدا کی عبادت اور حج کرنے مکے چلے گئے۔ تبھی تو سر پر عمامہ باندھتے ہیں۔ مکے جانےوالوں کو حاجی کہتے ہیں، اور وہ سر پر عمامہ باندھتے ہیں۔ انھیں انتہائی نفرت ہے روسیوں سے ۔ وہ چاہتے ہیں میں تمھیں ختم کر دوں۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔ ارے میں نے رقم خرچ کی ہے تمھارے لئے۔ اور ایوان یوں بھی مجھے تم سے کچھ لگاؤ سا ہوگیا ہے۔ ارے جان سے مارنے کا تو سوال ہی کیا میں تو تمھیں کبھی بھی جدا نہ کرتا، مگر مجبور ہوں زبان دی ہے تمھیں۔،،

یہ کہہ کر وہ ہنسا اور ہنس کر ٹوٹی پھوٹی روسی میں بولا : ''تمھارا ایوان خوب، امار عبدل خوب!،،

٤

ژیلین کو اس صورت سے رہتے ہوئے ایک مہینہ ہوگیا۔ وہ دن بھر یا گاؤں میں ادھر ادھر گھومتا رہتا یا دستکاری کے ہنر دکھایا کرتا۔ اور راتوں کو جب گاؤں میں سناٹا چھاجاتا، تو وہ اپنی کوٹھڑی میں کھدائی کرنے لگتا۔ پتھروں میں کھدائی کرنا آسان نہ تھا لیکن وہ ریتی سے پتھروں کو رگڑ رگڑ کر دیوار کے نیچے نقب کھودا کرتا تھا تاکہ کسی دن رات کے سناٹے میں نکل بھاگے۔

''بس یہ ہے،، وہ سوچتا ''کہ ذرا پہلے اس علاقے کی پوری جانکاری حاصل کرلوں، اندازہ لگالوں کہ جانا کس طرف ہے۔ لیکن تاتار تو نہیں بتائیں گے۔،،

اور مالک کے باہر جاتے ہی اس نے موقع نکال لیا۔ کھانے کے بعد وہ آؤل میں گھومنے نکل گیا۔ پہاڑی کی طرف۔ وہاں سے علاقے کو ذرا اچھی طرح دیکھنا چاہتا تھا۔ مالک جاتے جاتے اپنے ''چھٹکو،، سے کہہ گیا تھا کہ ژیلین کے ساتھ رہنا، پل بھر کو بھی نظر سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ چنانچہ بچہ ژیلین کے پیچھے دوڑا۔ زور زور سے چلا رہا تھا :

''رک جاؤ۔ بابا نے منع کیا ہے۔ رک جاؤ، نہیں تو ابھی شور مچاکر لوگوں کو اکٹھا کرلوں گا۔''

ژیلین اسے باتوں میں پھسلانے لگا۔

''میں تو'' کہنے لگا ''بس دو قدم تک جا رہا ہوں۔ بس اس پہاڑی تک، وہاں کچھ جڑی بوٹیاں ڈھونڈنا ہے۔ تمھارے آؤل والوں کے دوا علاج کےلئے۔ تم بھی چلو میرے ساتھ۔ میں بھلا بیڑیاں پہنے بھاگ تھوڑا ہی جاؤں گا۔ اور ہاں کل میں تمھیں تیر کمان بھی بناکر دوں گا۔''

بچے کو بہلا پھسلاکر ژیلین چل دیا۔ دیکھنے میں تو پہاڑی سامنے ہی تھی۔ مگر بیڑیوں کے بوجھ تلے قدم اٹھانا دوبھر تھا۔ چلتے چلتے طاقت جواب دینے لگی۔ بس وہیں پگڈنڈی پر بیٹھ کر سستانے اور چاروں طرف نظر دوڑانے لگا۔ اناج کے کوٹھے کے پچھواڑے گھاٹی پھیلی ہوئی تھی جس کو طے کرنے میں آدھا دن لگیگا۔ گھوڑوں کا ایک غول چر رہا تھا۔ نچلی گھاٹی میں ایک اور گاؤں تھا۔ گاؤں کے اس پار پھر پہاڑی تھی۔ اور بھی زیادہ اونچی اور ڈھلواں۔ اس کے بعد پھر پہاڑی تھی۔ پہاڑی کے بعد گھنا جنگل تھا، پھر مزید پہاڑوں کا سلسلہ تھا۔ یہ سلسلہ اوپر سے اوپر اٹھتا چلا گیا تھا۔ یہاں تک کہ سب سے اونچے پہاڑوں کی چوٹیاں شکر جیسی سفید برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ ایک سے ایک اونچی چوٹی برف کی ٹوپی اوڑھے کھڑی تھی۔ پہاڑوں کا سلسلہ تھا کہ افق تا افق پھیلا ہوا تھا۔ کہیں کہیں گھاٹیوں میں آباد بستیوں کے چولہوں سے دھواں اٹھتا نظر آرہا تھا۔ ''ھوں''، ژیلین نے سوچا ''یہ تو یہاں سے وہاں تک انھیں لوگوں کا علاقہ ہے۔ اب اس نے روسی علاقے کی سمت میں نظر دوڑانی شروع کی۔ نیچے گھاٹی کی تہہ میں چشمہ بہہ رہا تھا۔ اپنا گاؤں تھا۔ چاروں طرف باغ ھی باغ... چشمے کے کنارے کپڑے دھوتی ہوئی عورتیں دور سے چھوٹی چھوٹی گڑیاں سی نظر آ رہی تھیں۔ بستی کے اس پار پہاڑی تھی، اور اس کے بعد دو اور پہاڑیاں جنگلوں سے ڈھکی کھڑی تھیں۔ ان دو پہاڑوں کے درمیان کھلا ہوا ہموار علاقہ تھا۔ اس ہموار میدان میں دور، بہت دور دھواں سا اٹھ رہا تھا۔ ژیلین یہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جب وہ قلعے میں رہتا تھا تو سورج کدھر سے نکلتا تھا، کدھر ڈوبتا تھا۔ اور تب اس نے اندازہ لگایا کہ ہمارا روسی قلعہ یقیناً اسی گھاٹی میں ہوگا۔ ان دو پہاڑیوں کو پار کرکے اسی طعرف بھاگوں گا۔

دیکھتے دیکھتے سورج غروب ہونے لگا۔ برف‌پوش پہاڑ سفید سے سرخی مائل ہونے لگے۔ کالے پہاڑوں پر اندھیرا چھانے لگا۔ اب گھاٹی سے بھاپ سی اٹھ رہی تھی۔ اور وہ گھاٹی، جہاں اندازاً ہمارا قلعہ ہے، وہ تو ڈوبتے سورج کی روشنی میں انگارے کی طرح چمک رہی تھی۔ ژیلین نے ایک دفعہ پھر اس طرف گہری نظر ڈالی، گھاٹی میں نجانے کیا چیز چکر سا کاٹ رہی تھی، جیسے چمنیوں سے دھواں سا اٹھ رہا ہو۔ ژیلین کو یقین ہوگیا کہ روسی قلعہ ضرور یہی ہوگا۔

رات ہونےوالی تھی، دور مسجد میں ملا کے اذان دینے کی آواز آرہی تھی۔ ریوڑ ہنکائے جا رہے تھے۔ گائیں ڈکار رہی تھیں۔ اور بچہ مسلسل اسے پکار رہا تھا: ''چلو، چلو،،۔ مگر ژیلین کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا وہاں سے جانے کو۔

آخر وہ دونوں گھر لوٹے۔ اور ژیلین سوچنے لگا: ''لو بھئی اب تو علاقے کا اندازہ بھی لگا لیا، اب تو جلد سے جلد بھاگ لینا چاہئے۔،، اس کا بس چلتا تو اسی رات بھاگ لیتا۔ یوں بھی ان دنوں راتیں بالکل تاریک تھیں۔ آخری تاریخوں کا چاند بالکل گھٹ چکا تھا۔ مگر بدقسمتی سے تاتار رات ہی کو لوٹ آئے۔ عام طور پر لوٹتے تو ساتھ میں چوری کے بہت سے مویشی ہوتے تھے اور وہ خوش اور مگن ہوتے تھے۔ مگر اس دفعہ ہاتھ خالی تھے، نہ ڈھور، نہ ڈنگر۔ بلکہ ایک گھوڑے کی زین پر نارنجی داڑھی والے تاتار کے بھائی کی لاش تھی۔ غم و غصے سے سب کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔ اور پھر ساری بستی مقتول ساتھی کی تجہیز و تکفین کےلئے جمع ہونے لگی۔ ژیلین بھی دیکھنے پہنچ گیا۔ تاتاروں نے لاش کو کفن پہنایا اور، تابوت میں رکھے بغیر ہی، بستی کے باہر چناروں کے جھنڈ کی طرف لےجاکر جنازہ گھاس پر رکھ دیا۔ پھر ملا آیا۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے اکٹھا ہوئے۔ سب نے سر پر ٹوپیوں کے اوپر رومال باندھے، جوتے اتارے، اور جنازے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

سب سے آگے ملا تھا، اس کے پیچھے گاؤں کے تین بزرگ، سروں پر عمامے باندھے۔ ان کے عقب میں دوسرے تاتار تھے۔ سب نظریں جھکائے خاموش تھے۔ بڑی دیر سب یونہی خاموش رہے، پھر ملا نے سر اٹھایا، اور بولا:

''اللّٰہ اکبر،، اور بس۔ ایک لفظ کہہ کر پھر سب نے نظریں جھکالیں اور دیر تک خاموشی طاری رہی۔ سب خاموش بیٹھے تھے، نہ کوئی آواز، نہ جنبش۔ ملا نے ایک دفعہ پھر سر اٹھایا۔

''اللّٰہ اکبر!،، اور پھر سب نے دوہرایا: ''اللّٰہ اکبر!!،، اور پھر خاموشی۔

جنازہ گھاس پر رکھا تھا... بےحس و حرکت اور وہ سب کھڑے تھے۔ مردوں کی طرح خاموش۔ ایک نے بھی تو جنبش نہیں کی۔ ہوا میں ڈولتی ہوئی چنار کی پتیوں کی سرسراہٹ کے علاوہ فضا میں کوئی آواز نہ تھی۔ پھر ملا نے نماز ختم کی اور انھوں نے ہاتھوں پر جنازہ اٹھالیا۔ اور گڈھے کی طرف روانہ ہوگئے۔ یہ گڈھا کوئی عام گڈھا نہیں تھا۔ بلکہ زمین کے اندر کھدی ہوئی قبر تھی، جیسے تہہخانہ ہو۔ انھوں نے جنازے کو بغلوں اور گھٹنوں کے نیچے سہارا دےکر اٹھایا اور جھک کر قبر میں اتار دیا۔ مردے کے ہاتھ سینے پر رکھ دئے۔

نوگائی ملازم بید کے ہرے ہرے جھاڑ جھنکاڑ کھینچ کر لایا اور انھوں نے قبر کے منہ پر بید کی جھاڑیاں بچھاکر اس پر مٹی ڈالی اور برابر کر دی۔ قبر کے سرہانے پتھر کا کتبہ لگا دیا گیا۔ تاتاروں نے قبر کی زمین کو خوب اچھی طرح تھپتھپاکر برابر

کیا اور قبر کے ارد گرد خاموش بیٹھ گئے۔ بڑی دیر اس طرح خاموش بیٹھے رہے۔

"اللّٰہ! اللّٰہ!"، انھوں نے گہرے سانس لئے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ لال منہ والے تاتار نے تینوں بزرگوں کو چند سکے دئے، زمین سے اٹھا، اپنا کوڑا اٹھایا اور تین دفعہ پیشانی پر کوڑے مار کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

صبح ہوئی تو ژیلین نے لال منہہ والے تاتار کو گھوڑی کو کھینچتے ہوئے اور اس کے پیچھے پیچھے تین تاتاروں کو گاؤں سے جاتے دیکھا۔ وہ گاؤں کے کنارے پہنچے، لال منہ والے نے قبا اتاری، آستینیں چڑھائیں۔ اس کے ھاتھ بڑے بھاری تھے۔ خنجر نکال کر اس پر سان رکھی۔ تاتاروں نے گھوڑی کا سر اونچا کیا، نارنجی داڑھی والا اس کی طرف بڑھا، اور تیزی سے اس کی گردن پر وار کیا۔ گھوڑی کھڑے قد سے گری اور ٹھنڈی پڑنے لگی۔ تاتار اپنے بڑے بڑے ھاتھوں سے اس کی کھال اتارنے لگا۔ اس کے بعد عورتیں اور بچیاں آئیں، اور انھوں نے گھوڑی کا پیٹ اور انتڑیاں صاف کیں، اور پھر وہ گھوڑی کو کاٹ کر اس کے ٹکڑے اندر لے گئے۔ اس کے بعد سارا گاؤں مرحوم کا سوگ منانے کےلئے لال منہ والے کے گھر میں جمع ہونے لگا۔

انھوں نے تین دن تک گھوڑی کا گوشت کھایا، بوزہ پی اور مرحوم کو یاد کیا۔ مختصر یہ کہ مستقل گاؤں ھی میں ٹکے رہے۔

چوتھے دن دوپہر کو ژیلین نے دیکھا کہ تاتار کہیں جانے کی تیاری کر رہے ھیں۔ گھوڑوں پر زینیں کسی گئیں اور تقریباً دس آدمی گھوڑوں پر سوار ھوکر روانہ ھوگئے۔ لال منہ والا بھی ان کے ساتھ تھا۔ البتہ عبدل گاؤں ھی میں رک گیا۔ پہلی تاریخوں کا چاند تھا۔ راتیں ابھی تاریک تھیں۔

"لو بھئی"، ژیلین نے سوچا "بس اب فوراً بھاگ لینا چاہئے۔"، اس نے کوستیلین سے کہا مگر وہ گھبرا گیا۔

"مگر بھاگیں گے کیسے؟ راستہ تک تو معلوم نہیں ھمیں۔"

"مجھے معلوم ھے راستہ!"

"رات کو پہنچ کیسے پائیں گے؟"

"نہ پہنچ سکے تو رات جنگل میں بتالیں گے۔ لو دیکھو میں نے تو روٹیاں بھی اکٹھا کرلی ھیں۔ تم یونہی بیٹھے رھو گے کیا؟ گھر والوں نے رقم بھجوا دی تو ٹھیک ھی ھے، لیکن اگر نہ بھیجی تب؟ اور تاتار اس وقت تاؤ میں ھیں۔ ان کا ایک ساتھی روسیوں کے ھاتھوں مارا گیا ھے۔ سنا ھے ھمیں جان سے مارنے کی بات ھو رھی ھے۔"

کوستیلین سوچتا رھا، سوچتا رھا۔ پھر بولا:

"تو چلو، بھاگ چلیں!"

۵

ژیلین نے مٹی کھود کھود کر نقب کو اور بڑا کیا تاکہ کوستیلین بھی نکل سکے، اور پھر دونوں بیٹھ کر گاؤں میں رات کا سناٹا ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

بستی میں رات کا سناٹا ہوتے ہی ژیلین دیوار کے نیچے گھس کر نکل آیا اور سرگوشیوں میں کوستیلین کو آواز دی: ''چلے آؤ''۔ کوستیلین بھی رینگنے لگا اور اس کوشش میں اس کا گھٹنا ایک پتھر سے ٹکرایا اور پتھر چیخ اٹھا۔ مالک کے پاس ایک چوکیدار تھا — چتکبرا کتا اولیاشن۔ بڑا بھیانک کتا تھا۔ ژیلین نے پہلے ہی اسے کھلا پلا کر ہلا لیا تھا۔ پتھر لڑھکنے کی آواز سنتے ہی اولیاشن چونک کر بھونکا اور لپک پڑا۔ اس کے پیچھے دوسرے کتے بھی دوڑے۔ ژیلین نے آہستہ سے سیٹی بجائی، اور روٹی کا ٹکڑا پھینکا۔ اولیاشن پہچان گیا۔ بھونکنا بند کر کے جھٹ دم ہلانے لگا۔

مالک نے کتے کو بھونکتے سنا تو اندر ہی سے آواز لگائی: ''چپ ہوجا، اولیاشن چپ!''

ژیلین نے کتے کے سر اور کان سہلائے تو کتا خاموش ہوکر اسے پنجوں سے چھونے اور دم ہلانے لگا۔

وہ کونے میں دبک کر بیٹھ گئے۔ خاموشی اور گہری ہوگئی۔ اب صرف باڑے میں بھیڑوں کے ممیانے کی آواز آرہی تھی اور چشمے کا پانی پتھروں سے ٹکرا کر کل کل کررہا تھا۔ ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ ستارے بھی، دور، بہت دور، آسمان کی انتہائی بلندی پر ٹمٹما رہے تھے۔ اول تاریخوں کا سرخی مائل چاند آہستہ آہستہ اپنا سفر طے کررہا تھا۔ گھاٹی میں دودھ جیسا سفید کہرا پھیل رہا تھا۔

ژیلین نے کھڑے ہوتے ہوئے ساتھی سے کہا: ''لو بھئی، چلو!''

انھوں نے دو چار ہی قدم اٹھائے ہوں گے کہ اچانک مسجد کے گنبد میں ملا کی آواز گونج اٹھی۔ ''بسم اللّٰہ الرحمن...''، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اب لوگ نماز کے لئے گھروں سے نکلنا شروع کریں گے۔ وہ پھر دیوار سے چپک کر دبک بیٹھے۔ بڑی دیر یونہی بیٹھے نمازیوں کے گزرنے کا انتظار کرتے رہے۔ ایک دفعہ پھر خاموشی چھا گئی۔

''لو بھئی خدا کا نام لو اور چلو!''، دونوں نے سینوں پر صلیب کا نشان بنایا اور روانہ ہوگئے۔ وہ احاطے سے نکلے، اور ڈھلان پر بڑھتے ہوئے ندی تک پہنچے اور ندی پار کرکے گھاٹی میں آگے بڑھنے لگے۔ دھند کی چادر بہت موٹی تھی بلکہ اب تو اوپر نیچے تک جھک آئی تھی۔ اوپر ستارے چمک رہے تھے۔ ژیلین ستاروں کی مدد سے حساب لگا رہا تھا کہ کس سمت میں جانا چاہئے۔ دھند کی وجہ سے ہوا میں تازگی تھی۔ چلنا مشکل نہ تھا۔ مگر پاؤں میں جوتے بڑے بےڈھب قسم کے تھے۔ بالکل گھسے ہوئے۔ ژیلین نے پاؤں سے جوتے اتار پھینکے اور ننگے پاؤں ایک پتھر سے دوسرے اور دوسرے سے

تیسرے پر پھلانگ رہا تھا۔ مگر نگاہیں مسلسل ستاروں پر ٹکی ہوئی تھیں۔ جلد ہی کوستیلین کے قدم سست پڑنے لگے۔

''آہستہ چلو،، وہ بولا۔ ''جوتے کمبخت بالکل ہی ناکارہ ہیں۔ سارے پاؤں زخمی کر دئیے۔،،

''تو اتار لو۔ ایسے آسان رہے گا۔،،

کوستیلین نے جوتے اتارے تو چلنا اور دوبھر ہوگیا۔ پتھروں پر پاؤں بالکل ہی زخمی ہوگئے۔ وہ اور آہستہ چلنے لگا۔ ژیلین نے اسے سمجھایا:

''پاؤں زخمی ہوں تو بلا سے ہوں، جان تو بچ جائے گی۔ لیکن اگر پکڑے گئے تو سمجھ لو بہت برا ہوگا۔ جان سے مار ڈالیں گے کمبخت!،،

کوستیلین کچھ بولا نہیں، چلتا رہا۔ چلتا رہا اور کراہتا رہا۔ دونوں بڑی دیر گھاٹی میں چلتے رہے۔ اچانک دائیں طرف سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آئی۔ ژیلین کے قدم رک گئے۔ گھوم کر چاروں طرف دیکھا، ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر پہاڑی پر چڑھا اور بولا:

''اف، غلط سمت میں نکل آئے۔ دائیں طرف مڑ گئے۔ ادھر تو دوسرا آؤل ہے۔ میں پہاڑی سے دیکھ چکا ہوں۔ واپس پلٹ کر بائیں طرف مڑ چلو۔ پہاڑی کی طرف۔ ادھر جنگل ہیں۔،،

اس پر کوستیلین بولا:

''ذرا پل دو پل دم لو۔ سانس تو لے لوں۔ میرے تو پاؤں لہولہان ہو رہے ہیں۔،،

''ارے بھیا یہ تو ٹھیک ہو جائیں گے۔ تم ذرا آہستہ کودو۔ ایسے!،،

اور ژیلین واپس پلٹ کر بائیں طرف مڑا، اور پہاڑی پر چڑھتا ہوا جنگلوں کی طرف دوڑا۔ کوستیلین مسلسل پیچھے رہا جارہا تھا۔ اور مستقل ہائے وائے کررہا تھا۔ ژیلین اس کی حالت پر ناگواری سے ''اف،، کرتا ہوا دوڑتا رہا۔

آخر وہ پہاڑی پر چڑھ گئے۔ ژیلین ٹھیک بول رہا تھا۔ وہاں جنگل ہی جنگل تھے۔ جنگل میں گھسے تو جھاڑیوں سے سارے کپڑے تار تار ہوگئے۔ آخر جنگل میں بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی تک پہنچے اور آگے بڑھنے لگے۔

''رک جاؤ!،، راستے پر سموں کی سی آواز آئی۔ وہ رک کر سننے لگے۔ گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز آئی اور پھر خاموشی ہوگئی۔ وہ پھر ذرا سا ہلے۔ پھر آواز آئی۔ جیسے ہی وہ رکتے آواز بھی رک جاتی۔ ژیلین ذرا نزدیک پہنچ کر پگڈنڈی کو دیکھنے لگا۔ وہاں کوئی کھڑا تھا۔ نجانے گھوڑا تھا، نجانے کیا تھا۔ اور اس کے اوپر عجیب سی کوئی شے تھی۔ آدمی تو تھا نہیں وہ۔ پھر کوئی چیز پھڑپھڑائی۔ ''کیا عجوبہ ہے یہ؟،، ژیلین نے آہستہ سے سیٹی بجائی تو وہ ہستی گھسر گھسر کرتی ہوئی، پگڈنڈی سے ہٹ کر جنگل کی طرف لپکی اور جنگل میں سرسراہٹ سی دوڑ گئی۔ مانو طوفان آگیا ہو۔ شاخیں چرچرا کر ٹوٹنے لگیں۔

کوستیلین تو ایسا خوفزدہ ہوا کہ وہیں گر گیا۔ اور ژیلین ہنسنے لگا۔ بولا:
''ارے بھئی بارہ سنگھا ہے۔ سن نہیں رہے اس کے سینگوں سے شاخیں اور جھاڑیاں ٹوٹ رہی ہیں۔ ہم اس سے ڈر رہے ہیں، وہ ہم سے خوفزدہ ہے!،،

اور وہ آگے بڑھ گئے۔ چاند ڈھلنے لگا تھا۔ صبح قریب تھی۔ نجانے وہ صحیح راستے پر جا بھی رہے تھے یا نہیں۔ ژیلین سوچ رہا تھا کہ شاید تاتار اسے اسی راستے سے لائے تھے۔ اس کے حساب سے اب اپنوں تک پہنچنے کےلئے انہیں دس ورست کا فاصلہ اور طے کرنا تھا۔ مگر اندازہ تو اندازہ ہی تھا۔ کوئی یقین تو تھا نہیں۔ یوں بھی رات کے اندھیرے میں کچھ نظر بھی تو نہیں آ رہا تھا۔ اب وہ جنگل سے گھرے ہوئے چھوٹے سے میدان میں پہنچ گئے۔ یہاں پہنچتے ہی کوستیلین دھم سے بیٹھ گیا اور بولا:
''تم جو بھی کہو۔ میں تو اب آگے جاتا نہیں۔ قدم اٹھائے نہیں اٹھ رہے اب!،،
ژیلین اسے سمجھانے لگا۔
''نہیں،، وہ بولا۔ ''میں نہیں پہنچ سکتا اب۔ نہیں چل سکتا۔،،
ژیلین کو بھی غصہ آگیا۔ زور سے زمین پر تھوکا اور بگڑ کر بولا:
''اچھا تو ٹھیک ہے۔ میں اکیلا ہی جاتا ہوں۔ خدا حافظ!،،

کوستیلین تڑپ کر اٹھا اور ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ انھوں نے قریب چار ایک ورست کا فاصلہ اور طے کرلیا۔ جنگل میں دھند کا یہ عالم تھا کہ توبہ۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ ستارے بھی بالکل ماند پڑچکے تھے۔

اچانک سامنے سے گھوڑے کے سموں کی آواز آئی۔ نعل سے پتھر کھرچ کر آواز پیدا کر رہے تھے۔ ژیلین پیٹ کے بل لیٹا اور کان لگا کر سننے لگا۔
''ہوں تو یہ بات ہے! گھوڑ سوار آ رہا ہے، ادھر، ہماری طرف!،،

وہ لپک کر راستے سے ہٹے اور جھاڑیوں میں چھپ کر آنےوالے لمحے کا انتظار کرنے لگے۔ ژیلین کھسکتا ہوا پگڈنڈی تک گیا اور غور سے دیکھنے لگا۔ ایک گھوڑسوار تاتار گاؤ ہنکاتا ہوا جارہا تھا۔ منہ ہی منہ میں کچھ بدبدا بھی رہا تھا۔ تاتار ان کے قریب سے گزرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ژیلین کوستیلین کے پاس آکر بولا:
''چلو خدا نے بچا لیا۔ اٹھو، آؤ اب چلیں!،،
کوستیلین نے اٹھنا چاہا مگر دھم سے زمین پر آن گرا۔
''میں نہیں چل سکتا۔ بخدا، بالکل نہیں۔ ٹانگوں میں دم ہی نہیں ہے۔،،

آدمی بہت لحیم شحیم اور موٹا تھا۔ پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ اور پھر جنگل پر چھائے ہوئے ٹھنڈے کہرے نے الگ اس کا حال خراب کر رکھا تھا۔ اوپر سے پاؤں زخمی تھے۔ وہ تو بالکل ہی ڈھے گیا۔ ژیلین نے پوری طاقت سے اسے اٹھانا چاہا تو اچانک ہی کوستیلین کی چیخ نکل گئی۔
''درد، ہائے درد!،،

ژیلین کا دم فنا ہو گیا۔

''چلاتے کیوں ہو۔ دیکھتے نہیں تاتار قریب ہے۔ سن لیا تو؟'' اور وہ سوچنے لگا کہ ''یہ تو واقعی بالکل بے دم ہو رہا ہے۔ اب کیا کروں اس کا؟ ساتھی کو بے سہارا چھوڑنا تو غلط ہوگا۔''

''چلو اٹھو'' وہ بولا۔ ''میری پیٹھ پر چڑھ جاؤ۔ اگر واقعی بالکل نہیں چل سکتے، تو چلو میں پیٹھ پر لاد کر لے چلوں گا!''

اس نے کوستیلین کو لادا، اس کی رانوں کے نیچے ہاتھوں سے سہارا دیا اور گھسٹتا ہوا جنگلی راستے پر بڑھنے لگا۔

''خدا کے لئے'' وہ بولا ''گردن تو نہ دباؤ میری۔ شانے پکڑلو!''

ژیلین کے لئے ایک ایک قدم اٹھانا مشکل تھا۔ پاؤں لہولہان تھے، اور بالکل سن ہو رہے تھے۔ کبھی جھک کر کوستیلین کو پیٹھ پر صحیح طرح لادتا، کبھی اچھال کر ٹھیک کرتا کہ کسی طرح وہ ذرا اونچا ہو بیٹھے۔ وہ اس صورت، ساتھی کو لادے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔

تاتار نے غالباً کوستیلین کی چیخ سن لی تھی۔ ژیلین نے صاف سنا کہ کوئی تاتاری زبان میں کچھ بڑبڑاتا ہوا واپس آ رہا ہے۔ وہ پھر جھاڑیوں میں جا چھپے۔ تاتار نے بندوق نکالکر گولی ماری مگر نشانہ خالی گیا۔ وہ اپنی زبان میں کچھ بکتا جھکتا، گھوڑے پر سوار ہو، پھر روانہ ہو گیا۔

''لو بھئی'' ژیلین نے کہا۔ ''پھنس گئے میرے بھائی۔ اب ہمارا سراغ لگانے کے لئے دوسرے تاتاروں کو لے کر آئے گا یہ کمبخت۔ جلد از جلد ڈھائی تین ورست نہ نکل گئے تو مارے جائیں گے۔'' وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ لعنت ہے مجھ پر کہ اس بھینسے کو ساتھ لے آیا۔ اکیلا تو کب کا نکل گیا ہوتا!

کوستیلین بولا:

''تم جاؤ۔ جاؤ نا، میری خاطر تم بھی کیوں پھنسو بھلا!''

''نہیں ایسے نہیں جاؤں گا۔ ساتھی کو یوں چھوڑ دوں کیا؟''

وہ پھر کوستیلین کو پیٹھ پر لاد کر چلنے لگا۔ اس حالت میں کوئی ایک ورست کا فاصلہ اور طے کیا۔ چاروں طرف جنگل ہی جنگل تھا۔ جنگل سے نکلنے کی کہیں کوئی راہ نظر نہیں آرہی تھی۔ دھند چھٹنے لگی تھی اور شاید بادل گھر رہے تھے۔ ستارے اب بالکل چھپ چکے تھے۔ ژیلین کی حالت خستہ تھی۔

وہ اور آگے بڑھا۔ راستے میں چشمہ تھا۔ پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ رکا اور پیٹھ پر لدے ہوئے کوستیلین کو زمین پر بٹھادیا۔

بولا: ''ذرا دم لے لوں۔ روٹی کھا کر پانی پی لیں۔ پھر چلیں گے۔ اب تو شاید زیادہ دور نہیں ہے۔''

وہ پانی پینے جھکا ہی تھا کہ عقب سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آئی۔ وہ جھٹ داتیں سرف ڈھلان پر اگی ہوئی جھاڑیوں میں دبک کر لیٹ گئے۔

تاتاروں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ لوگ پگڈنڈی پر ٹھیک اس جگہ رک گئے، جہاں سے یہ لوگ لوٹے تھے۔ پہلے تو آپس میں کچھ بولتے رہے، پھر کتوں کو ھشکارنے لگے۔ جھاڑیاں چرچرائیں، اور نجانے کس کا، ایک اجنبی سا کتا سیدھا ان دونوں کی طرف لپکا۔ ان کے قریب پہنچ کر رکا اور زور زور سے بھونکنے لگا۔

پھر تاتار لپکے۔ وہ بھی اجنبی تھے۔ انھوں نے جھپٹ کر روسیوں کو پکڑا، ان کے ھاتھ پاؤں کس کر باندھے، اور گھوڑوں پر لاد کر روانہ ھوگئے۔

یہ قافلہ تقریباً تین ایک ورست گیا ھوگا کہ راستے میں عبدل سے مڈ بھیڑ ھوگئی۔ مالک کے ساتھ دو تاتار اور تھے۔ تاتاروں نے آپس میں کچھ بات‌چیت کی، اور مالک قیدیوں کو اپنے گھوڑوں پر بٹھا کر واپس آؤل روانہ ھوگیا۔

راستے بھر عبدل نے نہ ان سے کوئی بات کی نہ ھنسا بولا۔

صبح ھوتے ھوتے وہ آؤل پہنچ گئے۔ انھوں نے قیدیوں کو گلی میں بٹھا دیا۔ چاروں طرف سے بہت سے بچے آ کر جمع ھوگئے۔ اور انھیں پتھروں اور چھڑیوں سے مارنے لگے۔

تاتار بیٹھک کےلئے جمع ھونے لگے۔ پہاڑی کے دامن‌والا بڈھا تاتار بھی آیا۔ اور گرما گرم بحث شروع ھوگئی۔ ژیلین کے کان میں آوازیں پڑ رھی تھیں۔ ان دونوں کی قسمت کا فیصلہ کیا جارھا تھا کہ اب انھیں کیا سزا دی‌جائے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ انھیں اور دور، پہاڑی علاقے میں بھیج دینا مناسب ھوگا۔ مگر بڈھے نے کہا: ''مار ڈالو!،، عبدل جھگڑ رھا تھا۔ کہہ رھا تھا کہ ''میں نے رقم خرچ کی ھے ان پر۔ میں تو معاوضہ وصول کرکے رھوں‌گا۔،، بڈھے کا اصرار تھا کہ ''یہ کمبخت کوئی رقم نہیں دیں گے۔ الٹا مصیبت کھڑی کریں‌گے۔ یوں بھی روسیوں کو کھلانا پلانا گناہ ھے۔ انھیں قطعی ختم کر دینا چاھئے!،،

اور پھر سب اپنی اپنی راہ چلے گئے۔ عبدل ژیلین کے پاس آیا اور اسے سمجھانے لگا:

''اگر تمھارے عزیزوں نے مجھے فدیہ نہ بھیجا تو دو ھفتے بعد میں تمھیں ختم کر دوں‌گا۔ اور اگر دوبارہ بھاگنے کی کوشش کی تو سمجھ لے، کتے کی موت مارا جائےگا۔ چل خط لکھ۔ اچھی طرح لکھ خط!،،

ملازم نے انھیں کاغذ وغیرہ دیا۔ انھوں نے پھر خط لکھے۔ تاتار انھیں بیڑیاں پہنا کر مسجد کی طرف لے گئے۔ وھاں ایک بڑا سا اندھا کنواں جیسا تھا۔ یہی کوئی چار ایک گز کا ھوگا۔ انھوں نے قیدیوں کو گڈھے میں ڈال دیا۔

٦

اب تو زندگی بہت ہی بری کٹ رہی تھی۔ دن رات میں کسی وقت بھی بیڑیوں سے نجات نہیں تھی۔ نہ بیڑیاں اتارتے، نہ گڈھے سے باھر نکالتے۔ وھیں ان کے سامنے گندھا ھوا آٹا ڈال دیا جاتا اور جگ میں پانی۔ جیسے انسان نہ ھوں کتے ھوں۔ تہہ‌خانے‌نما گڈھے میں بلا کی گھٹن اور سیلن تھی! کوستیلین تو بالکل ھی ڈھیر ھوگیا۔ سارے بدن پر ورم آگیا اور گٹھیا کا درد بےانتہا بڑھ گیا۔ دن بھر پڑا اونگھتا رھتا یا کراھتا رھتا۔ ژیلین کی بھی ھمت ٹوٹ گئی تھی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ صورت‌حال بہت بگڑ گئی ھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کرے تو کیا کرے۔

اس نے زمین کھودنا شروع کی۔ مگر مٹی چھپانے کی بھی تو جگہ نہیں تھی۔ مالک نے دیکھ لیا۔ خوب چیخا چلایا۔ مار ڈالنے کی دھمکیاں دینے لگا۔

ایک دن وہ گڈھے میں اکڑوں بیٹھا، اپنی آزاد زندگی کے بارے میں سوچ سوچ کر اداس ھو رہا تھا کہ اچانک اس کے گھٹنے پر ایک روٹی آکر گری، پھر دوسری گری، اور پھر چیریوں کی بارش سی ھونے لگی۔ نظر اٹھاکر دیکھا۔ دینا کھڑی تھی۔ دینا نے اسے دیکھا اور ھنس کر بھاگ گئی۔ اور ژیلین سوچ میں پڑگیا: ”دینا سے مدد مل سکتی ھے کیا؟“

مگر دوسرے دن وہ آئی ھی نہیں۔ اچانک ژیلین نے گھوڑوں کی ٹاپیں سنیں۔ نجانے کون لوگ آئے تھے۔ پھر سب مسجد میں جمع ھوگئے۔ خوب لڑے جھگڑے، چیخے چلائے۔ بار بار روسیوں کا ذکر آرہا تھا۔ پھر اسے بیساکھی والے بڑے میاں کی آواز سنائی دی۔ پوری بات تو نہیں سن سکا لیکن اندازاً سمجھ گیا کہ شاید روسی فوجیں بہت قریب پہنچ گئی ھیں اور تاتار خوفزدہ ھیں کہ آؤل تک نہ پہنچ جائیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایسے میں قیدیوں کا کیا بندوبست کریں۔

تاتار بات‌چیت کرکے اپنی اپنی راہ چلے گئے۔ اچانک کچھ کھٹکا سا ھوا۔ گڈھے کے اوپر نجانے کیا چیز سرسرائی۔ اس نے نگاھیں اٹھائیں — دینا تھی، گھٹنوں کے بیچ سر دبکائے اکڑوں بیٹھی تھی۔ پھر وہ اور جھکی۔ گلے میں پڑا ھوا سکوں کا ھار گڈھے کے اوپر لٹک کر جھول رہا تھا۔ کالی آنکھیں چمک رہی تھیں، ستاروں کی طرح۔ اس نے آستین سے پنیر کے دو پیڑے نکالے اور جلدی سے ژیلین کی طرف پھینک دئے، اس نے بڑھ کر تھام لئے اور کہنے لگا:

”اتنے دن سے آئی کیوں نہیں تھیں بھلا؟ میں نے تو تمہارے لئے کھلونے بناکر رکھے ھیں۔ لو، یہ لو۔“ اور اس نے ایک ایک کھلونا بچی کی طرف اچھال دیا۔

مگر وہ نظریں جھکائے سر ھلاتی رہی۔

”نہیں چاھئے!“ اس نے کہا۔ چند لمحے بالکل خاموش بیٹھی رہی پھر بولی:

''وہ تمھیں مارنا چاہتے ہیں، ایوان!،، یہ کہتے کہتے اس نے ہاتھ سے گردن کی طرف اشارہ کیا، جیسے بتا رہی ہو کہ گردن کاٹ دیں گے۔

''کون مارنا چاہتا ہے؟،،

''بابا۔ بزرگوں کا حکم ہے۔ مگر مجھے تم پر رحم آتا ہے، ایوان!،،

یہ سن کر ژیلین بولا:

''اگر مجھ پر رحم آتا ہے تو میرا ایک کام کر دو دینا۔ مجھے کوئی لمبا سا بانس یا بلی لا دو۔،،

بچی نے سر کے اشارے سے سمجھانا چاہا کہ ''ممکن نہیں ہے،،۔ ژیلین ہاتھ جوڑ کر منت کرنے لگا۔

''دینا، خدا کے لئے، دینا پیاری، مجھے بانس لادو نا!،،

''نہیں لاسکتی،، وہ بولی۔ ''دیکھ لیں گے، وہ سب گھر پر ہیں۔،، یہ کہہ کر بچی چلی گئی۔

شام ہوئی تو ژیلین بیٹھ کر سوچنے لگا کہ اب کیا ہوگا؟ بار بار اوپر دیکھ رہا تھا۔ آسمان پر ستارے بڑے نکھرے نکھرے لگ رہے تھے، مگر چاند اس وقت تک نہیں نکلا تھا۔ ملا کی آواز گونج اٹھی، پھر خاموشی چھا گئی۔ ژیلین نے سوچا: ''بچی ڈرتی ہے،،۔

اچانک اس کے سر پر مٹی گری۔ اس نے پھر اوپر دیکھا۔ گڈھے کے دوسرے سرے پر ایک لمبی سی بلی کھسکتی نظر آئی۔ اور کھسکی، اور گڈھے کے اندر جھکنے لگی۔ ژیلین خوشی سے اچھل پڑا۔ جلدی سے بلی کا سرا پکڑ کر اسے اندر کھینچ لیا۔ بلی خوب مضبوط تھی۔ وہ اس بلی کو مالک کی چھت پر کئی بار دیکھ چکا تھا۔

اس نے پھر اوپر نظر اٹھائی۔ آسمان کی بلندی پر ستارے چمک رہے تھے، اور گڈھے کے عین اوپر دینا کی آنکھیں۔ بلی کی آنکھوں کی سی چمک تھی ان میں۔ اس نے پیٹ کے بل گڈھے پر جھک کر آہستہ سے سرگوشی کی:

''ایوان، ایوان،، اس نے کہا اور منہ پر ہاتھ رکھ کر اشارہ کیا کہ ''آہستہ بولو، آہستہ!،،

''کیا ہے؟،،

''سب گئے ہوئے ہیں۔ گھر پر صرف دو آدمی ہیں۔،،

ژیلین ساتھی سے بولا:

''لو بھئی کوستیلین، چلو۔ ایک آخری کوشش اور کر دیکھیں۔ میں کندھے پر اٹھا لوں گا تمھیں۔،،

مگر کوستیلین تو یہ بات سننے کا بھی روادار نہیں تھا۔

''نہیں بھائی اب یہاں سے نکلنا ممکن نہیں ہے۔ میں بھلا ایسے میں کہاں جاؤں گ۔ ہلنا جلنا تک دوبھر ہے۔،،

''تو پھر خدا حافظ۔ دیکھو برا بھلا نہ کہنا مجھے،، اُس نے کوستیلین کو رخصتی پیار کرتے ہوئے کہا۔

قیدی نے بلی کو زور سے پکڑا۔ دینا سے کہا کہ دوسرا سرا کس کر پکڑے رہو، اور بلی کے سہارے اوپر چڑھنا شروع کیا۔ وہ دو دفعہ گرا، بیڑیاں راہ کا روڑا بنی ہوئی تھیں۔ پھر کوستیلین نے اسے سہارا دیا۔ اور وہ کسی نہ کسی طرح اوپر چڑھ گیا۔ دینا دبلے چھوٹے نازک ہاتھوں سے اس کی قمیص کا دامن پکڑے مسلسل ہنسی رہی تھی۔

ژیلین نے بلی اوپر کھینچی اور بولا:

''اسے واپس جگہ پر رکھ دو، دینا بیٹی۔ نہیں تو بھانڈا پھوٹ جائے گا اور تمھاری شامت آجائے گی۔،،

دینا بلی کھینچنے لگی۔ اور ژیلین پہاڑی کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہ ڈھلان کے نیچے بیٹھا اور ایک نوکیلا پتھر اٹھا کر بیڑیوں کا تالہ توڑنے لگا۔ تالہ بہت مضبوط تھا۔ کسی صورت کھل نہیں رہا تھا۔ بڑا جوکھوں کا کام تھا۔ اچانک پہاڑی کی طرف سے کسی کے دوڑنے کی آواز آئی۔ قدم بہت ہلکے پھلکے تھے۔ ژیلین نے سوچا ''شاید دینا ہوگی!،، دینا بھاگتی ہوئی آئی اور اس سے پتھر لیتے ہوئے بولی:

''لاؤ مجھے دو پتھر!،،

وہ اکڑوں بیٹھ گئی اور تالہ گھما پھرا کر پیچ کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ چھڑیوں جیسے دبلے نازک ہاتھوں میں اتنا دم کہاں تھا بھلا۔ اچانک بچی نے پتھر پھینکا اور پھوٹ کر رو دی۔ ژیلین پھر قفل سے الجھنے لگا۔ دینا اس کے برابر اکڑوں بیٹھی رہی اور اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔ ژیلین نے چاروں طرف نظر ڈالی، بائیں ہاتھ کو، پہاڑی کے پیچھے افق پر سرخی چھا رہی تھی۔ چاند چڑھنے میں اب دیر نہیں تھی۔ اور تب اس نے سوچا: ''چاند چڑھنے سے پہلے پہلے گھاٹی پار کرکے جنگل تک پہنچنا ضروری ہے۔،، وہ اٹھا اور ہاتھ سے پتھر پھینک دیا۔ ٹھیک ہے بیڑیوں سمیت ہی جاؤں گا۔

''خدا حافظ دینوشکا! تجھے صدیوں یاد کروں گا دینا!،، دینا نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اندھیرے میں اسے ٹٹول رہی تھی تاکہ اس کے کپڑوں میں کہیں روٹیاں ٹھونس دے۔ ژیلین نے ہاتھ بڑھا کر روٹیاں لےلیں۔

''شکریہ!،، وہ بولا۔ ''کتنی سمجھدار بیٹی ہے ہماری! میرے بعد تمھارے لئے گڑیاں اور کھلونے کون بنائے گا دینا!،، اس نے محبت سے بچی کا سر سہلایا۔

دینا رو پڑی۔ جلدی سے ہاتھ سے آنکھیں چھپائیں اور میمنے کی طرح چھلانگیں لگاتی پہاڑی کی طرف بھاگ گئی۔ اندھیرے میں سینے پر پڑے ہوئے سکوں کا ہار بجنے کی جھنکار سنائی دے رہی تھی اور بس۔

ژیلین نے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ بیڑیوں کے تالے کو ہاتھ میں پکڑا، تاکہ جھنکار نہ ہو، اور پاؤں گھسیٹتا ہوا پگڈنڈی پر روانہ ہوگیا۔ نگاہیں مستقل سرخی مائل

افق پر ٹکی ہوئی تھیں جہاں سے چاند نکلنے والا تھا۔ راستہ اسے خوب یاد تھا۔ تقریباً آٹھ ورست تک ناک کی سیدھ میں جانا تھا۔ بس چاند چڑھنے سے پہلے پہلے کسی طرح جنگل تک پہنچ جاؤں۔ اس نے چشمہ پار کر لیا۔ پہاڑی کے اس طرف چاندنی چھٹکنے لگی تھی۔ افق کی سرخی ہلکی پڑ گئی تھی۔ اور گھاٹی کا ایک حصہ تو روشن سے روشن‌تر ہوتا جارہا تھا۔ پہاڑی کے دامن میں پل پل پھیلتا ہوا سایہ اور تاریکی مسلسل اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔

ژیلین سائے سائے، آگے بڑھ رہا تھا۔ ادھر اس کے قدم تیز سے تیزتر ہورہے تھے، ادھر چاند زیادہ سے زیادہ تیزی سے اوپر چڑھ رہا تھا۔ اب تو گھاٹی کے دائیں حصے میں بھی چاندنی پھیلنے لگی تھی۔ ژیلین جنگل کے کافی قریب پہنچ چکا تھا۔ اور چاند پہاڑی کی اوٹ سے نکل کر کھلے آسمان پر دمک رہا تھا۔ ہر طرف چاندنی چھٹکی ہوئی تھی، مانو دن نکل آیا ہو۔ پیڑوں کی ایک ایک پتی الگ سے الگ نظر آرہی تھی۔ پہاڑی پر ہر طرف روشنی تھی — روشنی اور خاموشی — موت کا سا سناٹا۔ بس دور نیچے بہتے ہوئے چشمے کی ہلکی ہلکی کل کل فضا میں لرزاں تھی۔

وہ جنگل میں پہنچ گیا۔ راستے میں کسی سے ٹکر نہیں ہوئی۔ ژیلین نے جنگل میں ایک تاریک سا کونہ ڈھونڈا اور ذرا کی ذرا دم لینے کے لئے دبک کر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر آرام کیا، روٹی کھائی اور پتھر لے کر قفل توڑنے لگا۔ دونوں ہاتھ زخمی ہو گئے مگر قفل ٹس سے مس نہ ہوا۔ آخر وہ اٹھ کر پگڈنڈی پر آیا اور پھر قدم بڑھانے لگا۔ اس صورت سے کوئی ایک ورست کا فاصلہ اور طے کیا۔ مگر اب وہ تھکن سے نڈھال تھا۔ پاؤں ٹوٹے جا رہے تھے۔ دس قدم چلتا پھر رک جاتا۔ ''کوئی بات نہیں،، اس نے سوچا ''جب تک دم میں دم ہے چلتا رہوں گا۔ اگر بیٹھ گیا تو اٹھنا مشکل ہے۔ قلعے تک تو پہنچنے کا سوال ہی نہیں، روشنی ہونے پر یہیں جنگل میں کہیں چھپ کر لیٹ رہوں گا۔ شام ہوتے ہی پھر چل پڑوں گا، رات بھر چلتا رہوں گا!،،

وہ رات بھر چلتا رہا۔ راستے میں صرف دو گھوڑ سوار تاتار نظر آئے۔ مگر ژیلین نے دور ہی سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سن لی اور جھٹ جھاڑیوں میں جا چھپا۔

اور پھر چاندنی دھندلانے لگی۔ اوس گر رہی تھی، صبح قریب تھی۔ مگر ژیلین ابھی جنگل کے سرے تک بھی نہیں پہنچا تھا۔ ''کوئی بات نہیں،، اس نے سوچا ''تیس ایک قدم اور چل لوں، بس پھر تو جنگل میں دبک کر دم لے لوں گا۔،، تیس قدم کا فاصلہ طے کرنے کی دیر تھی۔ وہ جنگل کے کنارے پہنچ گیا۔ اب صبح کی روشنی اچھی طرح پھیل چکی تھی۔ اس کے ٹھیک سامنے ہتھیلی کی طرح چکنا اور ہموار استیپ تھا اور قلعہ۔ کچھ فاصلے پر بائیں طرف پہاڑی کے دامن پر الاؤ کی لو مدھم پڑ رہی تھی اور الاؤ سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ الاؤ کے گرد متعدد لوگ بیٹھے تھے۔

اس نے غور سے دیکھا۔ تلواریں چمک رہی تھیں۔ کزاک تھے — سپاہی!

ژیلین خوشی سے جھوم اٹھا۔ ہمت کرکے پہاڑی کی طرف چلنے لگا۔ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا: ”خدا نہ کرے اگر وہاں کھلے میدان میں تاتار گھوڑ سواروں سے ٹکر ہوگئی تو کیا ہوگا۔ مانا کہ اب صرف چند قدم کی بات ہے مگر ان سے بچ نکلنا ناممکن ہوگا۔“

ذہن میں یہ خیال ابھرا ہی تھا کہ اچانک بائیں طرف نیچی پہاڑی پر تین تاتار کھڑے نظر آئے۔ یہی کوئی دو سو گز کے فاصلے پر۔ تاتاروں نے بھی اسے دیکھ لیا اور وہ لپکے قیدی کی طرف۔ ژیلین کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں مسل دیا۔ اس نے گھبرا کر ہاتھ پھیلائے اور اپنی تمام‌تر قوت سے چلایا:

”بچاؤ، بھائیو، بچاؤ!“

ہمارے سپاہیوں نے اس کی آواز سن لی، سنتے ہی گھوڑسوار کزاک تاتاروں سے ٹکر لینے کےلئے ژیلین کی طرف لپکے۔

کزاک بہت دور تھے اور تاتار صرف چند قدم پر۔ لیکن ژیلین نے ہاتھ سے بیڑیاں سنبھالیں اور پوری طاقت سے کزاک سپاہیوں کی طرف دوڑنا شروع کردیا۔ اس وقت اسے اپنا قطعی کوئی ہوش نہیں تھا۔ بار بار سینے پر صلیب کا نشان بنا رہا تھا اور چلا رہا تھا:

”بھائیو! بھائیو! بھائیو!“

کزاک سب ملا کر کوئی پندرہ تھے۔

تاتار گھبرا گئے۔ ژیلین تک پہنچنے سے پہلے ہی ان کے قدم سست پڑگئے اور ژیلین بھاگتا ہوا کزاکوں سے جاملا۔

کزاک سپاہیوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ہر شخص اس سے پوچھ رہا تھا کہ وہ کون ہے؟ کس قسم کا آدمی ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ مگر ژیلین اپنے حواسوں ہی میں کہاں تھا کہ کچھ بتاسکتا، بس رو روکر ایک ہی لفظ دوہرا رہا تھا:

”بھائیو! بھائیو!“

سپاہی دوڑتے ہوئے آئے، ژیلین کو گھیر لیا۔ کوئی اسے روٹی کھلا رہا ہے، کوئی دلیا دے رہا ہے، کوئی وادکا کا جام بڑھا رہا ہے، کوئی اسے گرم کوٹ پہنا رہا ہے تو کوئی اس کی بیڑیاں کاٹ رہا ہے۔

افسروں نے اسے پہچان لیا۔ اور قلعے میں لے گئے۔ سارے سپاہی کھل اٹھے، ساتھیوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔

ژیلین نے انہیں اپنی بپتا سنائی اور بولا:

”لو بھئی ہم گھر بھی ہو آئے، شادی بھی رچا لی! نہیں میاں ہماری قسمت میں یہ سب ہے ہی نہیں!“

اور وہ قفقاز ہی میں ٹک گیا۔ وہیں فوجی خدمات انجام دیتا رہا۔

کوستیلین کو تقریباً ایک ماہ بعد پانچ ہزار فدیہ دے کر چھڑایا جا سکا — نیم‌مردہ حالت میں...

پڑھنے والوں سے

دارالاشاعت ترقی آپ کا بہت شکرگذار ہوگا اگر آپ ہمیں اس کتاب، اس کے ترجمے، ڈیزائن اور طباعت کے بارے میں اپنی رائے لکھیں۔ اس کے علاوہ بھی اگر آپ کوئی مشورہ دے سکیں تو ہم ممنون ہوں گے۔

ہمارا پتہ: زوبوفسکی بلوار۔ نمبر ۱۷،
ماسکو، سوویت یونین
17, Zubovsky Boulevard, Moscow, USSR